انتخاب از تفسیر نمونہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

انبیائے قرآن

(حضرت الیاسؑ تا خاتم الانبیاءؐ)

ترجمہ مولانا صفدر حسین نجفی



حصہ سوم

ترتیب و تنظیم
مجاہد حسین حُر

انبیائے قرآن

(از الیاس تا خاتم علیہم السلام)

استفادہ از تفسیر نمونہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ الوارف

ترجمہ شدہ محسن ملت حجۃ الاسلام والمسلمین سید صفدر حسین نجفی نور اللہ مرقدہ

ترتیب و تنظیم

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

معراج کمپنی لاہور

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

042-37361214-03214971214

www.facebook.com/merajcompanypakistan

نام کتاب .... انبیائے قرآن (از الیاس تا خاتم علیہم السلام)

ترتیب و تنظیم .... مجاہد حسین حر

پروف ریڈنگ .... خانم آر چوہدری

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... معراج کمپنی لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتا

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

انتساب

خدا کے نمائندوں کی پیروی کرنے والوں کے نام

عرض ناشر

حمد ہے اس ذات کے لئے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا اور درود و سلام ہو اس نبی ﷺ پر جسے اس نے عالمین کے لئے سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور سلام و رحمت ہو ان کی آل پاک پر جنہیں اس نے پورے جہاں کے لئے چراغ ہدایت بنایا۔

ہر زمانے کے لوگوں کے لئے نمونہ عمل ان کے زمانے اور اس سے پہلے کے انبیاء کرام رہے ہیں ہر زمانے میں لوگوں کی مشکلات تقریباً ایک جیسی ہی رہی ہیں صرف کرداروں کے نام بدلے ہیں اس زمانے کے انسانوں کے لئے بھی چودہ سو سال پہلے خالق کائنات نے اپنی آخری کتاب میں اپنے انبیا کے قصے بیان کئے ہیں تاکہ لوگوں کو اپنی راہ کے متعین کرنے میں خداوند قدوس کے نیک لوگوں کا طریقہ کار معلوم ہو سکے اور وہ بھی ان کے نقش قدم پر چل کر کامیابی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ادارے نے "انبیائے قرآن (الیاس تا خاتم ﷺ)" کے نام سے یہ کتاب نذر قارئین کی ہے۔ انشاء اللہ العزیز یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی۔

ادارہ

فہرست کتاب

حضرت الیاس علیہ السلام

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت الیاس علیہ السلام خدا کے عظیم انبیاء میں سے ایک ہیں اور قرآنی آیات نے یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ الیاسؑ خدا کے رسولوں میں سے تھے۔ [1]

اس پیغمبر کا نام قرآن مجید کی دو آیات میں آیا ہے ایک تو سورہ صافات میں اور دوسرا سورہ انعام میں چند انبیاء کے ساتھ۔

لیکن اس بارے میں کہ قرآن میں جن انبیاء کا نام آیا ہے انہی میں سے ایک پیغمبر کا نام الیاس ہے یا یہ کسی پیغمبر کا مستقل نام ہے نیز اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ضمن میں مفسرین میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں، ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

الف:۔ بعض کہتے ہیں کہ "الیاس"، "ادریس" کا دوسرا نام ہے (کیونکہ ادریس کا دوسرا نام "ادراس" بھی تلفظ ہوا ہے اور وہ مختصر سی تبدیلی کے ساتھ الیاس ہو گیا)۔

ب:۔ بعض کا کہنا ہے کہ الیاس بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ہیں "یاسین" کے فرزند ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون کے نواسوں میں سے ہیں۔

ج:۔ کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ الیاس خضر کا دوسرا نام ہے جب کہ بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ الیاس خضر کے دوستوں میں سے ہیں اور دونوں زندہ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ الیاس تو خشکی پر مامور ہیں لیکن خضر جزیروں اور دریاؤں پر مامور ہیں، بعض دوسرے الیاس کی ماموریت بیابانوں

---

[1] سورہ صافات آیت 123

میں ، اور خضر کی ماموریت پہاڑوں پر خیال کرتے ہیں اور دونوں کے لئے عمر جاودانی کے قائل ہیں، بعض الیاس کو "الیسع" کا فرزند سمجھتے ہیں۔

د:۔ بعض کہتے ہیں کہ الیاس بنی اسرائیل کے وہی "ایلیا" پیغمبر ہیں جو "اجاب" بادشاہ بنی اسرائیل کے ہم عصر تھے جنھیں لوگوں نے "تج" بھی جاناہے جو مسیح سے تعمید دہندہ تھے۔

لیکن قرآن کی آیات کے ظاہر کے ساتھ جو بات ہم آہنگ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ مستقلاً ایک پیغمبر کا نام ہے اور قرآن میں جن دیگر پیغمبروں کے نام آئے ہیں یہ ان کے علاوہ ہیں جو ایک بت پرست قوم کی ہدایت کے لئے مامور ہوئے تھے اور اس قوم کی اکثریت ان کی تکذیب کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن مخلص مومنین کے ایک گروہ نے ان کی پیروی کی۔

بعض اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ اس قوم کے بڑے بت کا نام "بعل" تھا یہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ پیغمبر سرزمین "شامات" میں مبعوث ہوئے تھے اور ان کی فعالیت کا مرکز شہر "بعلبک" تھا جو اس وقت لبنان کا حصہ ہے اور شام کی سرحد پر واقع ہے۔

بہر حال اس پیغمبر کے بارے میں مختلف داستانیں کتابوں میں بیان کی گئی ہیں اور چونکہ وہ قابل اعتماد و اطمینان نہیں لہٰذا ہم نے انہیں نقل نہیں کیا۔

پیغمبر خدا مشرکین کے مقابلے میں

قرآن میں جناب الیاس علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب اس نے قوم کو خبردار کیا اور کہا: "کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے"؟ [1]

آگے چل کر قرآن میں س مسئلہ کے بارے میں، اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے: "کیا تم "بعل" بت کو پکارتے ہو اور بہترین خالق کو چھوڑ رہے ہو"۔ [2]

---

[1] سورہ صافات آیت 124

[2] صافات آیت 125

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ایک معروف بت تھا، جس کا نام ''بعل'' تھا۔

اور وہ اس کے سامنے سجدہ کیا کرتے تھے حضرت الیاس علیہ السلام نے انہیں اس قبیح عمل سے روکا اور عظیم آفریدگار عالم اور توحید خالص کی طرف دعوت دی۔

اسی وجہ سے ایک جماعت کا نظریہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی فعالیت کا مرکز ''شامات'' کے شہروں میں سے شہر ''بعلبک'' تھا۔

کیونکہ ''بعل'' اس مخصوص بت کا نام تھا اور ''بک'' کا معنی ہے شہر۔

ان دونوں کی آپس میں ترکیب سے ''بعلبک'' ہو گیا، کہتے ہیں کہ سونے کا اتنا بڑا بت تھا کہ اس کا طول بیس ہاتھ تھا، اس کے چار چہرے تھے اور اس بت کے چار سو سے زیادہ خادم تھے

البتہ بعض کسی معین بت کو ''بعل'' نہیں سمجھتے بلکہ بت کے مطلق معنی میں لیتے ہیں مگر بعض دوسرے اسے ''رب اور معبود'' کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

بہر حال الیاس علیہ السلام نے اس بت پرست قوم کی سخت مذمت کی اور مزید کہا: ''اس خدا کو چھوڑ رہے ہو جو تمہارا اور تمہارے گزشتہ آباؤ اجداد کا پروردگار ہے۔'' [1]

تم سب کا مالک و مربی وہی تھا اور ہے، اور جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے اور ہر مشکل کا حل اسی کے دست قدرت سے ہوتا ہے،

اس کے علاوہ نہ تو خیر و برکت کا کوئی اور سرچشمہ موجود ہے اور نہ ہی شر و آفت کا کوئی اور دفع کرنے والا ہے۔

قوم الیاس علیہ السلام کا ردعمل

لیکن اس سرپھری اور خود پسند قوم نے خدا کے اس عظیم پیغمبر کے استدلالی پند و نصائح

[1] سورہ صافات 126

اور واضح ہدایات پر کان نہ دھرے اور "اس کی تکذیب کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے"۔ [1]

خدانے بھی ان کی سزا کو ایک مختصر سے جملے میں بیان کرتے ہوئے کہہ دیا: "وہ بارگاہ عدل الٰہی اور اس کی دوزخ کے عذاب میں حاضر کئے جائیں گے۔" [2] اور اپنے قبیح اور بد اعمال کی سزا کا مزا چکھیں گے۔ لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹا سا نیک، پاک اور مخلص گروہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا لہٰذا ان کا حق فراموش نہ کرتے ہوئے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: "مگر خدا کے مخلص بندے۔" [3]

قرآن اس واقعہ کے آخر میں فرماتا ہے: "ہم نے الیاس کا نیک نام بعد والی امتوں میں جاوداں کر دیا۔" [4] دوسرے مرحلے میں قرآن مزید کہتا ہے: "الیاسین پر سلام و درود ہو۔" [5]

تیسرے مرحلے میں فرمایا گیا ہے: ہم نیکوں کاروں کو اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں۔ [6]

چوتھے مرحلے میں ان تمام باتوں کی اصل بنیادی یعنی ایمان کا ذکر ہے: "یقیناً وہ (الیاس) ہمارے مومن بندوں میں سے ہے" [7]

"ایمان" و "عبودیت" احسان کا سرچشمہ ہے اور احسان مخلصین کی صف میں شامل ہونے اور خدا کے سلام کا حقدار ہونے کا سبب ہے۔

---

[1] سورہ صافات 127

[2] سورہ صافات 127

[3] سورہ صافات 128

[4] سورہ صافات 129

[5] سورہ صافات 130

"الیاس" کی جگہ "الیاسین" آنا اس وجہ سے ہے کہ الیاسین بھی الیاس کے ہم معنی ہیں یا الیاس اور ان کے پیرو کاروں کے لئے آیا ہے۔

[6] سورہ صافات 131

[7] سورہ صافات 132

حضرت الیسع علیہ السلام

''الیسع'' جن کا نام صرف دو مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔ [1]

قرآن کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بھی خدا کے بزرگ پیغمبروں میں سے تھے اور ان بزرگوں میں سے تھے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ''ہم نے ان میں سے ہر ایک کو عالمین پر برتری وفضیلت بخشی۔'' [2]

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر ''یوشع بن نون'' ہیں جن پر ''الف ولام'' داخل ہوا ہے اور اس کا ''شین'' ''سین'' سے بدل گیا ہے اور کسی غیر عربی کے نام پر یہ عبری نام ہے، الف و لام کا داخل ہونا کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس طرح سے کہ عرب ''اسکندر'' کو ''الاسکندر'' کے نام سے پہچانتے ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے اسے ایک عربی لفظ سمجھتے ہیں جو ''یسع'' (مادہ ''وسعت'' فعل مضارع) سے لیا گیا ہے اور اسی پہلو اختیار کرنے کے بعد الف والام جو مشخصات اسم میں سے ہے اس پر آگیا ہے۔

سورہ انعام کی آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے تھے لیکن یہ واضح نہیں کرتی کہ آیا وہ بنی اسرائیل میں سے تھے یا نہیں؟ توریت کی کتاب

---

[1] سورہ ص آیت 48

[2] سورہ انعام آیت 86

''بادشاہان'' میں ان کا نام ''الیشع'' ''بن'' ''شافات'' لکھا ہوا ہے اور عبرانی زبان میں الیشع کا معنی ''ناجی'' اور ''شافات'' کا معنی ''قاضی'' ہے۔

بعض اسے اور ''خضر علیہ السلام'' کو ایک ہی سمجھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور یہ جو بعض اسے ''ذالکفل'' ہی سمجھتے ہیں تو یہ قرآن کے صریح برخلاف ہے کیونکہ قرآن نے ذالکفل کا ''الیسع'' پر عطف کیا ہے۔ بہر حال وہ ایک بلند مقام اور پر استقامت پیغمبر ہیں اور ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کے لئے ہمارے لئے یہی کافی ہے۔

حضرت ذا الکفل علیہ السلام

مشہور یہی ہے کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور ان کے نام کا سورہ انبیاء کی آیت 85 میں پیغمبروں کے ناموں کے ساتھ اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے بعد ذکر اس معنی پر گواہ ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے تھے، وہ انہیں ایوب علیہ السلام کا فرزند سمجھتے ہیں جس کا اصلی نام ''بشر'' یا ''شرف'' تھا، بعض انہیں ''حزقیل'' سمجھتے ہیں کہ ذا الکفل ان کے لقب کے طور پر مشہور ہو گیا ہے۔

انہیں ذا الکفل کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ اس بارے میں اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ''کفل'' نصیب اور حصہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور کفالت وعہدہ داری کے معنی میں بھی علماء نے مختلف احتمال ذکر کئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ چونکہ انھوں نے یہ عہد کیا ہے کہ راتوں کو عبادت کے لئے اٹھیں گے اور دن میں روزہ رکھا کریں گے اور قضاوت اور فیصلہ کرتے وقت ہرگز غصے میں نہ آئیں گے اور وہ اپنے اس عہد و پیمان پر قائم رہے لہٰذا انہیں یہ لقب دیا گیا۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے انبیاء کے ایک گروہ کی کفالت کی تھی اور وقت کے ظالم بادشاہ سے ان کی جان بچائی تھی اس لئے انہیں یہ نام دیا گیا ہے۔

بہر حال ان کی زندگی کے حالات کی اتنی ہی مقدار جو آج ہماری دسترس میں ہے، خدا کی اطاعت و بندگی اور ظالموں کے مقابلے میں ان کی استقامت پامردی کی دلیل ہے اور ہمارے آج اور کل کے لئے ایک سبق ہے۔ اگر چہ ان کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں زمانے کی دوری کے سبب دقیق طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عزیر علیہ السلام

یہ گفتگو ایک نبی کی ہے جو اثنا سفر ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گزر رہا تھا جو وحشت ناک حالت میں گری پڑی تھی اور ویران ہو چکی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ ہڈیاں نظر آرہی تھیں، جب اس نے یہ وحشت ناک منظر دیکھا تو کہنے لگا: ''خدا ان مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا''۔ البتہ اس کی یہ بات شک اور انکار کے طور پر نہ تھی بلکہ از روئے تعجب تھی کیونکہ قرآن میں موجود قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ ایک نبی تھے، جیسا کہ خدا نے اس سے گفتگو کی، روایات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

خداوند عالم نے اسی وقت اس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال بعد اسے زندہ کیا، اب اس سے سوال کیا کہ اس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو؟ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے، فوراً جواب عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا: تم ایک سو سال یہاں رہے ہو۔

لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، کیسے طویل مدت میں حکم خدا کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔ یعنی وہ خدا جو تمہاری جلد خراب ہونے والی غذا کو صحیح وسالم رکھ سکتا ہے ا س کے لئے مردوں کو زندہ کرنا آسان ہے کیونکہ یہ ایک سرح سے زندگی کا ادامہ ہے، اور غذا کو صحیح وسالم رکھنا جس کی عمر کم ہوتی ہے مردوں کو زندہ کرنے سے آسان ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ اس پیغمبر کے ساتھ جو غذا تھی۔ قرآن نے نہیں بیان کیا، بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ان کی غذا ''انجیر'' اور پھلوں کا رس تھا، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں، لہٰذا ان دونوں کا باقی رہنا ایک اہم موضوع ہے۔

اس کے بعد دوبارہ حکم ہوا کہ اب اس دلیل کے لئے کہ تم جان لو کہ تمہیں سو سال موت کے عالم میں گزر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہے اور طبیعت کے عام قوانین اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں، اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔

اب دیکھو کہ ہم اس کے پراگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے ہیں، اس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آگیا ہے۔ اس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے مختلف احتمالات دیئے گئے ہیں، بعض نے ''ارمیا'' کہا ہے اور بعض ''خضر'' سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ ''عزیر'' تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیر علیہ السلام کے نام کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ یہ آبادی کہاں تھی، بعض اسے بیت المقدس سمجھتے ہیں جو ''بخت النصر'' کے حملوں کی وجہ سے ویران اور برباد ہو چکا تھا، لیکن یہ احتمال بعید نظر آیا ہے''۔ [1]

حضرت عزیر علیہ السلام نے دین یہود کی بہت خدمت کی

عربی زبان میں ''عزیر'' انہی کو کہا جاتا ہے جو یہودیوں کی لغت میں ''عزرا'' کہلاتے ہیں، عرب چونکہ جب غیر زبان کا کوئی نام اپناتے ہیں تو عام طور پر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں

[1] یہ واقعہ سورہ بقرہ کی آیت 259 کی ذیل میں بیان ہوا ہے۔

خصوصاً اظہار محبت کے لئے اسے صیغہ تصغیر میں بدل لیتے ہیں۔ ''عزرا'' کو بھی ''عزیر'' میں تبدیل کیا گیا ہے جیسا کہ ''عیسیٰ'' کے اصل نام کو جو دراصل ''یسوع'' تھا اور ''یحییٰ'' کو جو کہ ''یوحنا'' تھا بدل دیا۔

بہرحال عزیر یا عزرا یہودیوں کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض ملت وقوم کی بنیاد اور اس جمعیت کی تاریخ کی درخشندگی کی نسبت ان کی طرف دیتے ہیں۔ درحقیقت حضرت عزیر علیہ السلام نے اس دین کی بڑی خدمت کی ہے کیونکہ ''بخت النصر'' بادشاہ ''بابل'' نے یہود کو نیست ونابود کردیا تھا اور ان کے شہر اس کی فوج کے ہاتھ آگئے، ان کا عبادت خانہ ویران ہوگیا اور ان کی کتاب توریت جلا دی گئی، ان کے مرد قتل کر دیئے گئے اور ان کی عورتیں اور بچے قید کر کے بابل کی طرف منتقل کر دیئے گئے اور وہ تقریباً ایک سو سال وہیں رہے۔

پھر جب ایران کے بادشاہ ''کورش'' نے بابل فتح کیا تو عزرا جو اس وقت کے یہودیوں کے ایک سردار اور بزرگ تھے اس کے پاس آئے اور اسے ان کے بارے میں سفارش کی، ''کورش'' نے ان سے موافقت کی کہ یہودی اپنے شہروں کی طرف پلٹ جائیں اور نئے سرے سے توریت لکھی جائے، اسی لئے یہودی انہیں ایک نجات دہندہ اور اپنے دین کا زندہ کرنے والا سمجھتے ہیں، اسی بناء پر ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔

اسی امر کے سبب یہودیوں کے ایک گروہ نے انہیں ''ابن اللہ'' (اللہ کا بیٹا) کا لقب دیا، اگرچہ بعض روایات سے مثلاً احتجاج طبرسی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ لقب حضرت عزیر علیہ السلام کے احترام کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اسی روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اسلام ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اگر تم حضرت عزیر علیہ السلام کا ان عظیم خدمات کی وجہ سے احترام کرتے ہو اور اس بناء پر انہیں اس نام سے پکارتے ہو تو پھر یہ لقب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیوں نہیں دیتے جب کہ انھوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کی نسبت تمہاری بہت زیادہ خدمت کی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی جواب تھا۔

بہر حال اس نام سے بعض لوگوں کے اذہان میں احترام سے بالاتر صورت ہو گئی اور جیسا کہ عوام کی روش ہے کہ اس سے اپنی فطرت کے مطابق حقیقی مفہوم لیتے تھے اور انھیں واقعا خدا کا بیٹا خیال کرتے تھے کیونکہ ایک تو حضرت عزیر علیہ السلام نے انہیں در بدر کی زندگی سے نجات دی تھی اور دوسرا توریت لکھ کر ان کے دین کو ایک نئی زندگی بخشی تھی، البتہ ان کا یہ عقیدہ نہ تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ خصوصیت سے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا کہ یہی نظر فکر تھی یہی وجہ ہے کہ کسی تاریخ میں یہ نہیں ہے کہ انھوں نے آیت کو سن کر کہ "یہود کہتے ہیں: عزیر اللہ کا بیٹا ہے" [1] ان کا کیا ہوا یا انھوں نے کوئی آواز بلند کی ہو، اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ کوئی ردّعمل ظاہر کرتے۔

[1] سورہ توبہ آیت 30

حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام

حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ آپس میں بہنیں تھیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتداء میں بانجھ تھیں، جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے خلوص اور حیران کن خصوصیات کو دیکھا تو آرزو کی ان کی بھی مریم سلام اللہ علیہا جیسی پاکیزہ اور پرہیزگار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمت الٰہی اور توحید کی علامت ہو۔

حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطۂ نظر سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب ان کی کوئی اولاد ہو۔

لیکن عشق الٰہی اور مریم سلام اللہ علیہا کے محراب عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں بھی امید پیدا ہوئی اور انھوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ کیا ان کے وجود کی شاخ پر بھی فرزند کی صورت میں میوہ پیدا ہو جائے لہٰذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے انھوں نے خداوند عالم سے فرزند کا تقاضا کیا: ''خداوندا مجھے پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو بندوں کی دعائیں سننے والا ہے''۔ [1]

[1] سورہ آل عمران آیت 38

ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت

زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی۔

''وہ محراب عبادت میں مناجات کر رہے تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خداوند عالم انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحییٰ ہوگا''۔ [1]

''جوان صفات کا حامل ہوگا:

1. وہ حضرت مسیح پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا''۔ [2]

یاد رہے کہ قرآن مجید میں مختلف آیات میں ''کلمہ'' سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کی۔

اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے لہٰذا جب حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ان کی رغبت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کے لئے بہت موثر ثابت ہوئی

2. علم و عمل سے لحاظ کے معاشرے کی رہبری ان کے ذمہ ہوگی۔

3. علاوہ ازایں وہ اپنے تئیں سرکش ہوا و ہوس اور دنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے۔ [3]

4. ''وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے''۔ [4]

---

[1] سورہ آل عمران آیت 39

[2] سورہ آل عمران آیت 39

[3] سورہ آل عمران آیت 39

[4] سورہ آل عمران آیت 39

ملائکہ نے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریا علیہ السلام تعجب میں پڑ گئے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوندا: کیسے ممکن ہے کہ مجھ سے بچہ ہو جب کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

جواب میں وحی آئی:

"خدا اسی طرح جو کچھ چاہے انجام دے لیتا ہے۔" [1]

یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی نشانی

یہاں حضرت زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام کی ولادت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس عجیب و غریب واقعے پر حضرت زکریا علیہ السلام کا اظہار تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتمادی کی دلیل نہیں ہے، خصوصاً جب کہ قرآن کی دیگر آیات پر نظر کرنے سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک بانجھ عورت جو کئی سال سے ماہانہ عادت بھی چھوڑ چکی تھی ان کے یہاں بچہ پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے، اس میں کیا تغیر و تبدل ہوگا کیا پھر سے جوان یا ادھیڑ عمر کی عورتوں کی طرح سے ماہواری آنے لگے گی یا وہ کسی اور طرح سے بچے کی پیدائش کے قابل ہو جائیں گی۔

علاوہ ازیں قدرت خداوندی پر ایمان شہود اور مشاہدے سے الگ چیز ہے، حضرت زکریا علیہ السلام دراصل چاہتے تھے کہ ایمان درجہ شہود تک پہنچ جائے، یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۴۰

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا تعجب اور حیرانی کس بناء پر تھی جب کہ خداوند عالم کی بے پایاں قدرت پر بھی ان کی نظر تھی۔

پرندوں کے واقعے سے ملتی جلتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاد اور قیامت پر ایمان تو تھا لیکن وہ اس طرح اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ فطری امر ہے کہ انسان جب طبیعی قوانین کے خلاف کسی امر کا سامنا کرتا ہے تو وہ غور وفکر میں پڑ جاتا ہے اور اسے خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لئے کوئی حسی دلیل حاصل کرے۔ ''اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے'' کہہ کر بشارت الٰہی کی تاکید بھی کی جا چکی ہے، حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس امر سے ان کا ایمان، ایمان شہودی کا درجہ حاصل کرلے، وہ چاہتے تھے کہ ان کا دل اطمینان سے مالا مال ہو جائے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مشاہدہ حسی کے ذریعے اطمینان کے حصول کی خواہش کی تھی، وہ بھی اس مرحلے تک جا پہنچیں۔

خداوند عالم نے حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ درخواست بھی قبول فرمائی اور اس کے لئے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبیعی عامل کے بغیر تین دن کے لئے بے کار ہو گئی، وہ عام گفتگو نہ کرسکتے تھے لیکن خداوند عالم کے ذکر اور اس کی تسبیح کے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی، یہ عجیب وغریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لئے ایک نشانی تھی، وہ خدا جو بند زبان کو اپنے ذکر کے وقت کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی بانجھ رحم سے ایسا با ایمان بچہ پیدا کردے جو ذکر پروردگار کا مظہر ہو اسی سے اس نشانی کا اس چیز سے ربط ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام چاہتے تھے۔

ممکن ہے اس نشانی میں ایک نکتہ بھی پنہاں ہو اور وہ یہ کہ اس مسئلے میں جناب زکریا علیہ السلام اصرار اور نشانی کا تقاضا اگرچہ فعل حرام اور مکروہ نہ تھا لیکن بہرحال ترک اولیٰ سے کچھ مشابہ ضرور تھا اسی لئے خداوند عالم کی طرف سے ایسی نشانی دی گئی جو قدرت نمائی تھی اور ترک اولیٰ پر تنبیہ اور اشارہ بھی تھا۔

یہ بات جالب نظر ہے کہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالی نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ایک ایسا بیٹا عطا فرمایا جو کئی لحاظ سے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔

مثلاً: بچپن میں بعثت نبوت کے لحاظ سے۔

نام کے مفہوم کے اعتبار سے۔

کیونکہ عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام دونوں کا معنی ہے ''زندہ رہتا ہے'' اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پر، موت اور حشر ونشر تین مواقع پر درود وسلام بھیجا ہے۔

یحییٰ علیہ السلام، عشق الٰہی میں سرشار پیغمبر

حضرت یحییٰ علیہ السلام خداوند متعال کے ایک عظیم پیغمبر تھے اور ان کی خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ بچپن میں مقام نبوت پر فائز ہوئے، خداوند متعال نے انہیں اس سن وسال میں ایسی روشن عقل اور اتنی تابناک فہم وفراست عطا فرمائی کہ وہ اس عظیم منصب کو قبول کرنے کے لائق قرار پائے۔

بہر حال منابع اسلامی اور منابع مسیحی سے معلوم ہوتا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے۔

منابع مسیحی میں تصریح ہوئی ہے، کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غسل تعمید دیا اور اسی لئے انہیں ''یحییٰ تعمید دہندہ'' کے نام سے پکارتے ہیں، (غسل تعمید ایک مخصوص غسل ہے کہ جو عیسائی اپنے بیٹوں کو دیتے ہیں۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ اسے گناہ سے پاک کرتا ہے) اور جب حضرت مسیح علیہ السلام نے اعلان نبوت کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام ان پر ایمان لائے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بعض چیزیں قدر مشترک تھیں، انتہائی زیادہ زہد وتقویٰ، کچھ اسباب کی بناء پر ترک از دواج، معجزانہ طور پر پیدا ہونا اور اسی طرح بہت ہی زیادہ

قریبی نسب۔ [1]

"یحییٰ" "حیوۃ" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "زندہ رہتا ہے" اور یہ اس عظیم پیغمبر کا نام رکھا گیا تھا، زندگی سے یہاں مراد مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی ہے جو ایمان، منصب نبوت اور خدا سے ربط کے زیر سایہ ہو، سورہ مریم کی آیت 7 سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ہی یہ نام ان کے لئے انتخاب فرمایا تھا۔

"اے زکریا ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور قبل ازایں کسی کا یہ نام نہیں تھا۔"

یحییٰ علیہ السلام کی عمدہ صفات

قرآن مجید میں ان دس نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو خدا نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں یا انھوں نے توفیق الٰہی سے کسب کی تھیں۔

1۔ "ہم نے اسے بچپن میں فرمان نبوت اور عقل و ہوش و درایت عطا کی"۔

2۔ "ہم نے اپنی طرف سے اپنے بندوں کے لئے رحمت و محبت بخشی"۔

3۔ "ہم نے اسے روح و جان اور عمل کی پاکیزگی عطا کی"۔

4۔ "وہ پرہیزگار تھے" اور جو بات فرمان پروردگار کے مخالف ہوتی تھی اس سے دوری

---

[1] اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام میں بھی بعض باتیں مشترک تھیں لہٰذا امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام نے اس طرح نقل ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم امام حسین علیہ السلام کے ساتھ (کربلا کی طرف جاتے ہوئے) باہر نکلے تو امام جس منزل میں نزول اجلال فرماتے یا اس سے کوچ کرتے تو یحییٰ علیہ السلام اور ان کے شہید ہونے کو یاد کرتے اور فرماتے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی بے قدری کے لئے یہی کافی ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا سر بنی اسرائیل کے بدکاروں میں سے ایک بدکار کے پاس ہدیہ کے طور پر لایا گیا۔

اختیار کرتے تھے۔

5۔ ''اسے ہم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش گفتار، نیکو کار اور محبت کرنے والا پایا''۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت بھی کئی ایک جہات سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کی مانند تھی (حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کی کیفیت ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے)۔

امام حسین علیہ السلام کا نام بھی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے نام کی طرح بے سابقہ تھا (پہلے کسی کا یہ نام نہیں تھا) اور ان کی مدت حمل (جس وقت شکم مادر میں تھے) معمول کی نسبت بہت کم تھی۔

6۔ ''وہ خلق خدا سے خود کو برتر سمجھنے والا اور ظالم و مستکبر نہیں تھا''۔

7۔ ''وہ معصیت کار اور گناہ سے آلودہ نہیں تھا''۔

8، 9، 10۔ ''اور چونکہ وہ ان عظیم افتخارات اور عمدہ صفات کا مالک تھا، لہٰذا جس دن وہ پیدا ہوا اس دن بھی اور جس دن اس کو موت آئے اس دن بھی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے قبر سے اٹھایا جائے گا اس دن بھی، اس پر ہمارا درود و سلام ہو''۔ [1]

بچپن میں نبوت

یہ درست ہے کہ انسان کی عقل کے ارتقاء کا دور عام طور پر ایک خاص حد پر ہوتا ہے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسانوں میں ہمیشہ ہی بعض مستثنیٰ افراد موجود رہے ہیں، تو اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ خداوند متعال (عقل کے ارتقاء کے) اس دور کو بعض بندوں کے لئے کچھ مصالح کی بناء پر زیادہ مختصر کر دے اور کم اسے کم عرصہ میں اسے مکمل کر دے جیسا کہ بچوں

---

[1] مذکورہ صفات سورہ مریم کی آیت 12 تا 15 میں بیان ہوئی ہیں۔

کے لئے بولنا سیکھنے کے لئے عام طور پر دو سال کا گزرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بالکل ابتدائی دنوں میں بات کی، اور وہ ایسی بات تھی جو بہت ہی پر معنی تھی اور معمول کے مطابق بڑی عمر کے افرد کے شایان شان تھی۔ [1]

ایک روایت میں امام جواد حضرت محمد بن علی النقی علیہ السلام کے ایک صحابی سے کہ جس کا نام علی بن اسباط تھا منقول ہے کہ: ''میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا (جب کہ آپ کا سن بہت چھوٹا تھا) میں ان کے قد و قامت میں گم ہو گیا تا کہ اسے اپنے ذہن میں بٹھالوں اور جب میں واپس مصر لوٹ کر جاوں تو اپنے دوستوں سے اس بات کے کم وکیف کو بیان کروں، عین اسی وقت جب کہ میں سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت بیٹھ گئے (گویا آپ نے میری تمام سوچ کا مطالعہ کر لیا تھا) میری طرف رخ کیا اور فرمایا: اے علی بن اسباط خداوند متعال نے مسئلہ امامت میں جو کام کیا ہے وہ اسی کام کی طرح ہے کہ جو نبوت میں کیا ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت

نہ صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش تعجب خیز تھی بلکہ ان کی موت بھی کئی لحاظ سے عجیب تھی، اکثر مسلمان مورخین اور اسی طرح مشہور مسیحی منابع ان کی شہادت کے واقعہ کو اس طرح نقل کرتے ہیں (اگر چہ اس کی خصوصیات میں کچھ تھوڑا بہت تفاوت دکھائی دیتا ہے): حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے زمانے کے ایک طاغوت کے اپنی ایک محرم سے غیر شرعی روابط کے خلاف آواز کی بناء پر شہید ہوئے، ہوا یہ کہ ''ہیرودیس'' فلسطین کا ہوس پرست بادشاہ تھا، وہ اپنے بھائی کی بیٹی ''ہیرودیا'' پر عاشق ہو گیا، وہ بہت خوبصورت تھی، اس کے حسن نے اس کے دل میں عشق کی

---

[1] یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ وہ اشکال جو کچھ افراد نے شیعوں کے بعض ائمہ کے بارے میں کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کم عمری میں مقام امامت پر کیسے پہنچ گئے، درست نہیں ہے۔

آگ بھڑکا دی۔ بادشاہ نے اس سے شادی کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

یہ خبر جب خداوند متعال کے بزرگ پیغمبر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پہنچی تو انھوں نے صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ یہ شادی ناجائز ہے اور توریت کے احکام کے خلاف ہے اور میں ایسے کام کی اپنی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کروں گا۔ اس مسئلہ کی تمام شہر میں شہرت ہو گئی، اور یہ خبر اس لڑکی "ہیرودیا" کے کانوں تک بھی جا پہنچی، وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھنے لگی، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کسی مناسب موقع پر ان سے انتقام لے گی اور اپنی ہوا و ہوس کی راہ سے اس رکاوٹ کو ہٹا دے گی، اس نے اپنے چچا کے ساتھ اپنے راہ و رسم میں اضافہ کر دیا اور اپنے حسن و جمال کو اس کے لئے ایک جال بنا دیا اور اس پر اس طرح سے اثر انداز ہوئی کہ ایک دن ہیرودیس نے اس سے کہا کہ تیری جو بھی آرزو ہے مجھ سے مانگ تو جو کچھ چاہے گی وہ تجھے ملے گا۔ "ہم نے یحییٰ کو بچپن میں فرمان نبوت و عقل و دانش عطا کی۔ اور کبھی انسانوں کے بارے میں فرماتا ہے: "جبکہ انسان، کامل عقل کی حد بلوغ، چالیس سال کو پہنچ گیا۔ لہٰذا جس طرح خدا کے لئے یہ ممکن ہے بچپن میں حکمت عطا کرے اس کی قدرت اس کو چالیس سال میں حکمت عطا کرتی ہے"۔ ہیرودیا نے کہا میں یحییٰ کے سر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی، کیونکہ اس نے مجھے اور تجھے بدنام کر کے رکھ دیا ہے، تمام لوگ ہماری عیب جوئی کر رہے ہیں، اگر تو یہ چاہتا ہے کہ میرے دل کو سکون حاصل ہو اور میرا دل خوش ہو تو تجھے یہ کام انجام دینا چاہئے۔ ہیرودیس جو اس عورت کا دیوانہ تھا انجام پر غور کئے بغیر یہ کام کرنے پر تیار ہو گیا، اور ابھی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر اس بدکار عورت کو پیش کر دیا، لیکن آخر کار اس کے لئے اس کام کے ہولناک نتائج نکلے۔

حضرت عیسیٰ و حضرت مریم علیہما السلام

''حنہ'' اور ''اشیاع'' دو بہنیں تھیں۔ پہلی حضرت عمران کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عمران بنی اسرائیل کی بہت اہم شخصیت تھے۔ دوسری کو اللہ کے ایک نبی زکریا علیہ السلام نے اپنی زوجیت کے لئے منتخب فرمایا۔

کئی سال گزر گئے۔ حنہ کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ایک روز وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو غذا دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھا تو اولاد کی خواہش ان کے دل میں آگ کی طرح بھڑک اٹھی۔ انہوں نے خلوص دل سے بارگاہ خداوندی میں بیٹے کی درخواست کی۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا یہ مخلصانہ دعا ہدف اجابت کو پہنچی اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنہ کے شوہر حضرت عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا، جو لاعلاج مریضوں کو شفا دے گا۔ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے لئے پیغمبری کے فرائض بھی انجام دے گا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے رحم میں ہے۔ وہ بے خبر تھیں کہ ان کے رحم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریم سلام اللہ علیہا ہیں۔ اسی لئے انہوں نے نذر کی تھی کہ بیٹے کو خانہ خدا بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔

قرآن میں زوجہ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔ وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے ان کے شوہر عمران کو جو اطلاع

دی تھی اس سے وہ یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ ان کے یہاں لڑکا ہوگا۔ "محررا" استعمال کیا ہے اور "محررۃ" نہیں کہا، انھوں نے خدا سے درخواست کی وہ ان کی نذر قبول کرے۔ "محرر" "تحریر" کے مادے سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "آزاد کرنا" اس زمانے میں یہ لفظ ایسی اولاد کے لئے بولا جاتا تھا جو عبادت خانے کی خدمت کے لئے معین کئے جائے تا کہ وہ عبادت خانے کی صفائی اور دوسری خدمات انجام دیں اور فراغت کے وقت پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں۔ "محرر" ان خدمت گزاروں کو اس لئے کہتے تھے کہ وہ ماں باپ کی ہر قسم کی خدمت سے آزاد ہوتے تھے اور عبادت خانے کی خدمت کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

بعض کہتے ہیں جب بچے خدمت کے کچھ قابل ہو جاتے، یا بالغ ہونے تک ماں باپ کی نگرانی میں خدمت انجام دیتے تھے اور بعد ازاں خود سے کام کرنے لگتے تھے چاہتے تو عبادت خانے میں اپنا کام ختم کر کے باہر چلے جاتے اور چاہتے تو کام جاری رکھتے۔

پالنے والے یہ تو لڑکی ہے

جب پیدائش ہوئی تو مادر مریم سلام اللہ علیہا نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی۔ اب وہ پریشان ہوئیں۔ سوچنے لگیں کہ کیا کروں کیونکہ بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزاری کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔ قرآن میں بچی کی ولادت کے بعد مادر مریم سلام اللہ علیہا کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے پریشان ہو کر کہا: خداوند میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نے کی ہے اس کے لئے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہو سکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔ [1]

لیکن قرآن کہتا ہے کہ "خدا تعالیٰ نے مریم سلام اللہ علیہا کو حسن قبول سے نوازا اور ان کی

---

[1] سورہ آل عمران 36

پرورش اچھے پودے کی طرح کی"۔ [1]

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو خانہ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کرلیا جائے گا لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کبھی کسی لڑکی کو اس مقصد کے لئے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

لیکن کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لئے قبول کرلیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں: قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا بیت المقدس کی خدمت کے دوران میں ماہواری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئیں کہ انہیں اس روحانی مرکز سے دور ہونا پڑتا۔ ممکن ہے اس نذر کی قبولیت اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کا قبول بارگاہ ہونا، اس کے بارے میں ان کی والدہ کو الہام کے ذریعے مطلع کیا گیا ہو۔

قرآن کہتا ہے: "خدا نے زکریا کو مریم سلام اللہ علیہا کی کفالت کے لئے منتخب کیا تھا کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے، مریم سلام اللہ علیہا کے والد ان کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے"۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا کا یہ نام ان کی والدہ کے ذریعے سے وضع حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ "مریم سلام اللہ علیہا" ان کی لغت میں "عبادت گزار خاتون" کو کہتے تھے۔

یہ نام حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور لگاؤ کا مظہر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کرنے کے لئے تھا لہٰذا انہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نومولود بچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی وسوسوں سے بچائے رکھے اور انہیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت 37

مریم سلام اللہ علیہا کی پرورش کے لئے قرعہ کشی

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی والدہ پیدائش کے بعد اپنی نوزائیدہ بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر عبادت خانے میں لے آئیں۔ وہاں بنی اسرائیل کے علماء اور بزرگوں سے کہنے لگیں: یہ تو مولود بچی خانہ خدا کی خدمت کے لئے نذر کی گئی ہے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں۔

جناب مریم سلام اللہ علیہا چونکہ حضرت عمران علیہ السلام کے خاندان سے تھیں اور یہ ایک بزرگ خاندان تھا اس لئے بنی اسرائیل کے علماء اور عباد ان کی سرپرستی کا منصب حاصل کرنے کے لے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

قرعہ ڈال کر فیصلہ کرنے پر ان کا اتفاق ہوگیا۔ وہ ایک نہر کے کنارے گئے وہاں انہوں نے اپنی قرعہ ڈالنے کی لکڑیاں پیش کیں۔ ان میں سے ہر ایک لکڑی یا قلم پر ان میں سے ایک ایک کا نام لکھا گیا۔ جو قلم پانی میں ڈوب جاتی اس کا قرعہ نکلا صرف جس کی قلم سطح آب پر رہتی اس کے نام قرعہ شمار ہوتا۔ جس قلم پر حضرت زکریا علیہ السلام کا نام تھا پہلے پانی کی گہرائی میں چلی گئی اور پھر پانی پر ابھر آئی۔

یوں حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی سرپرستی کا منصب حضرت زکریا علیہ السلام کے حصے آیا اور حقیقت میں بھی وہی اس کام کے لئے اہل تر تھے کیونکہ ایک تو وہ پیغمبر خدا تھے اور دوسرے ان کی بیوی حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی خالہ تھیں۔

پھر اس واقعے کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: مریم سلام اللہ علیہا کی سرپرستی کے تعین کے لئے جب وہ اپنی قلمیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے۔

"یونہی جب وہ کفالت مریم سلام اللہ علیہا پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم

پر صرف وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے"۔ [1]

مریم سلام اللہ علیہا کے سرپرست حضرت زکریا علیہ السلام

جناب مریم سلام اللہ علیہا حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں پروان چڑھیں اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابن عباس کے بقول جب وہ نو سال کی ہوئیں تو دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیزگاری اور معرفت الٰہی میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ اس دور کے احبار اور پارسا علماء سے بھی سبقت لے گئیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام ان کے محراب کے پاس آکر دیکھتے تو خاص غذائیں رکھی رہتی تھیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی۔ ایک دن پوچھنے لگے: "یہ کھانے کہاں سے لائی ہو؟"۔

مریم سلام اللہ علیہا بولیں: "یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ تو جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے"۔ [2]

یہ غذا کیسی تھی؟ اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کے لئے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں قرآن میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ و سنی کتب کی روایات سے جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم حکم پروردگار سے جناب مریم سلام اللہ علیہا کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی باعث تعجب نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے کسی پرہیزگار بندے کی یوں پذیرائی کرے۔

ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے: ایک روز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر تشریف لائے۔ حالت یہ تھی کہ کئی روز سے ان کے یہاں ٹھیک سے کھانا بھی

---

[1] سورہ آل عمران آیت 44

[2] سورہ آل عمران آیت 37

میسر نہ تھا اچانک آپؐ نے ان کے پاس مخصوص غذا دیکھی۔ آپؐ نے پوچھا: "یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟"

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے عرض کیا:

"خدا کے یہاں سے، کیونکہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے"۔

اس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہ واقعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعے کی طرح ہے، وہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کے محراب کے پاس آئے تھے، وہاں کھانے کی کوئی خاص چیز دیکھی تو پوچھنے لگے: یہ کھانا کہاں سے آیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ خدا کے یہاں سے آیا ہے"۔

فرشتے جناب مریم سلام اللہ علیہا سے باتیں کرتے ہیں

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ایک بلند فضیلت یہ تھی کہ فرشتے ان سے باتیں کیا کرتے تھے س سے آپ کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔

"فرشتے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو بشارت دیتے ہیں کہ خدا نے انہیں برگزیدہ کیا اور چن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا"۔ [1]

یعنی تقوی، پرہیزگاری، ایمان اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہوگئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لئے چن لیا گیا ہے۔

پہلا حصہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کی اعلیٰ انسانی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور برگزیدہ انسان کے طور پر آپ کا نام لیتا ہے اور دوسرے حصے میں "اصطفك" ان کے اپنے

[1] سورہ آل عمران آیت 42

زمانے کی تمام عورتوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔

یہ قرآنی گفتگو اس بات پر گواہ ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا اپنے زمانے میں عظیم ترین منزلت کی مالک خاتون تھیں۔ [1]

قرآن میں حضرت مریم سلام اللہ علیہا سے فرشتوں کی گفتگو کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ انہوں نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو خدا کی طرف سے برگزیدہ ہونے کی بشارت دینے کے بعد کہا: ''اب پروردگار کے حضور خضوع کرو اور سجدہ و قیام بجالاؤ''۔ [2]

یہ درحقیقت اس عظیم نعمت پر شکرانہ تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا سرآغاز

قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''آسمانی کتاب قرآن میں مریم سلام اللہ علیہا کی بات کرو کہ جس وقت اس نے اپنے

---

[1] یہ امر بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بارے میں منقول ان روایات کی نفی نہیں کرتا جن میں ان کے لئے فرمایا گیا ہے کہ آپ تمام جہانوں کی عورتوں سے برتر اور افضل ہیں کیونکہ متعدد روایات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

جناب مریم سلام اللہ علیہا تو اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار تھی، لیکن جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اولین و آخرین تمام زمانوں کی عورتوں کی سردار ہیں ''العالمین'' کا لفظ بھی اس بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن حکیم میں اور دیگر عبارات میں ایسے لوگوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے: ''اور میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی''۔

واضح ہے یہاں مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مومنین کو اپنے زمانے کے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔

[2] سورہ آل عمران آیت 43

گھر والوں سے جدا ہو کر مشرقی حصہ میں قیام کیا''۔ [1]

در حقیقت وہ ایک ایسی خالی اور فارغ جگہ چاہتی تھی جہاں پر کسی قسم کا کوئی شور وغل نہ ہوتا کہ وہ اپنے خدا سے راز و نیاز میں مشغول رہ سکے، اور کوئی چیز اسے یاد محبوب سے غافل نہ کرے، اسی مقصد کے لئے اس نے عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کی مشرقی سمت کو جو شاید زیادہ آرام و سکون کی جگہ تھی یا سورج کی روشنی کے لحاظ سے زیادہ پاک و صاف اور زیادہ مناسب تھی، انتخاب کیا۔

اس وقت مریم سلام اللہ علیہا نے ''اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک پردہ ڈال لیا''۔ [2] تا کہ اس کی خلوت گاہ ہر لحاظ سے کامل ہو جائے۔

بہر حال اس وقت ہم نے اپنی ''روح'' (جو بزرگ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے) اس کی طرف بھیجی اور وہ بے عیب خوبصورت اور کامل انسان کی شکل میں مریم سلام اللہ علیہا کے سامنے ظاہر ہوئی۔ [3]

ظاہر ہے ایسے موقع پر مریم سلام اللہ علیہا کی کیا حالت ہوگی۔ وہ مریم سلام اللہ علیہا کہ جس نے ہمیشہ پاکدامنی کی زندگی گزاری، پاکیزہ افراد کے دامن میں پرورش پائی اور تمام لوگوں کے درمیان عفت و تقویٰ کی ضرب المثل تھی، اس پر اس قسم کے منظر کو دیکھ کر کیا گزری ہوگی۔ ایک

---

[1] سورہ مریم آیت 16

[2] سورہ مریم آیت 17

[3] سورہ مریم آیت 17

اس میں شک نہیں ہے، کہ اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ جبرائیل صورت اور سیرت کے اعتبار سے بھی ایک انسان میں بدل گیا تھا کیونکہ اس قسم کا انقلاب اور تبدیلی ممکن نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ (بظاہر) انسان کی شکل میں نمودار ہوا، اگرچہ اس کی سیرت وہی فرشتے جیسی تھی لیکن حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو ابتدائی امر میں چونکہ یہ خبر نہیں تھی لہذا انہوں نے یہی خیال کیا تھا کہ ان کے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو باعتبار صورت بھی انسان ہے اور باعتبار سیرت بھی انسان ہے۔

خوبصورت اجنبی آدمی اس کی خلوت گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس پر بری وحشت طاری ہوئی۔ فوراً پکاریں کہ ”میں خدائے رحمٰن کی پناہ چاہتی ہوں کہ مجھے تجھ سے بچائے۔ اگر تو پرہیزگار ہے“۔ [1]

اور یہ خوف ایسا تھا کہ جس نے مریم سلام اللہ علیہا کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ خدائے رحمٰن کا نام لینا اور اس کی رحمت عامہ کے ساتھ توصیف کرنا ایک طرف اور اسے تقویٰ اور پرہیزگاری کی تشویق کرنا دوسری طرف، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اگر وہ اجنبی آدمی کوئی برا ارادہ رکھتا ہو تو اس پر کنٹرول کرے اور سب سے بڑھ کر خدا کی طرف پناہ لینا، وہ خدا کہ جو انسان کے لئے سخت ترین حالات میں سہارا اور جائے پناہ ہے اور کوئی قدرت اس کی قدرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا یہ بات کہنے کے ساتھ اس اجنبی آدمی کے ردعمل کی منتظر تھیں۔ ایسا انتظار جس میں بہت پریشانی اور وحشت کا رنگ تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی، اس اجنبی نے گفتگو کے لئے زبان کھولی اور اپنی عظیم ذمہ داری اور ماموریت کو اس طرح سے بیان کیا ”اس نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں“۔ [2]

اس جملہ نے اس پانی کی طرح جو آگ پر چھڑکا جائے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاکیزہ دل کو سکون بخشا لیکن یہ سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔

کیونکہ اس نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا: ”میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں ایک ایسا لڑکا بخشوں جو جسم و روح اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو“۔ [3]

---

[1] سورہ مریم آیت 18

[2] سورہ مریم آیت 19

[3] سورہ مریم آیت 19

یہ بات سنتے ہی مریم سلام اللہ علیہا کانپ اٹھیں وہ پھر ایک گہری پریشانی میں ڈوب گئیں اور" کہا کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میرے کوئی لڑکا ہو حالانکہ کسی انسان نے اب تک مجھے چھوا تک نہیں اور میں ہرگز کوئی بدکار عورت بھی نہیں ہوں"۔ [1]

وہ اس حالت میں صرف معمول کے اسباب کے مطابق سوچ رہی تھیں کیونکہ کوئی عورت صاحب اولاد ہو، اس کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں یا تو وہ شادی کرے یا بدکاری اور انحراف کا راستہ اختیار کرے، میں تو خود کو کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پر جانتی ہوں، نہ تو ابھی تک میرا کوئی شوہر ہے اور نہ ہی میں کبھی منحرف عورت رہی ہوں۔ اب تک تو یہ بات ہرگز سننے میں نہیں آئی کہ کوئی عورت ان دونوں صورتوں کے سوا صاحب اولاد ہوئی ہو۔

لیکن جلدی ہی اس نئی پریشانی کا طوفان بھی پروردگار عالم کے قاصد کی ایک دوسری بات سننے سے تھم گیا اس نے مریم علیہا السلام سے صراحت کے ساتھ کہا: "مطلب تو یہی ہے کیونکہ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے کہ یہ کام میرے لئے سہل اور آسان ہے"۔ [2]

تو اچھی طرح میری قدرت سے آگاہ ہے، تو نے تو درخت کے وہ پھل جو دنیا میں اس فصل میں ہوتے ہی نہیں اپنے محراب عبادت کے پاس دیکھے ہیں، تو نے تو فرشتوں کی وہ آوازیں سنی ہیں جو تیری پاکیزگی کی شہادت کے لئے تھیں۔ تجھے تو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے جد امجد آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے۔ پھر یہ کیسا تعجب ہے کہ جو تجھے اس خبر سے ہو رہا ہے۔

اس کے بعد اس نے مزید کہا: "ہم چاہتے ہیں کہ اسے لوگوں کے لئے آیت اور ایک معجزہ قرار دیں"۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے اپنے بندوں کے لئے اپنی طرف سے رحمت قرار

---

[1] سورہ مریم آیت 20

[2] سورہ مریم آیت 21

دیں۔ "بہر حال" "یہ فیصلہ شدہ امر ہے" [1] اور اس میں گفتگوں کی گنجائش نہیں ہے۔

"روح خدا" سے کیا مراد ہے؟

تقریباً تمام مشہور مفسرین نے یہاں پر روح کی خداوند متعال کے بزرگ فرشتے جبرائیل علیہ السلام سے تفسیر کی ہے اور اسے روح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روحانی ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو حیات بخش ہے۔ چونکہ وہ انبیاء و مرسلین کے پاس خداوند متعال کی رسالت کا پہنچانے والا ہے لہٰذا تمام لائق انسانوں کے لئے حیات بخش ہے اور یہاں پر روح کی خدا کی طرف اضافت اس روح کی عظمت و شرافت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اضافت کی ایک قسم اضافت تشریفیہ ہے۔

مریم سلام اللہ علیہا سخت طوفانوں کے تھپیڑوں میں

"سرانجام مریم سلام اللہ علیہا حاملہ ہوگئی [2] اور اس موعود بچے نے اس کے رحم میں جگہ پائی"۔

اس بارے میں کہ یہ بچہ کس طرح وجود میں آیا، کیا جبرائیل علیہ السلام نے مریم سلام اللہ علیہا کے پیراہن میں پھونکا یا ان کے منہ میں، قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ مفسرین کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

بہر حال "اس امر کے سبب وہ بیت المقدس سے کسی دور دراز مقام پر چلی گئی"۔ [3]

---

[1] سورہ مریم آیت 21

[2] سورہ مریم آیت 22

[3] سورہ مریم آیت 22

وہ اس حالت میں ایک امید وبیم کے درمیان پریشانی وخوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وقت گزار رہی تھی، کبھی وہ یہ خیال کرتی کہ آخرکار یہ حمل ظاہر ہو جائے گا، مانا کہ چند یا چند مہینے ان لوگوں سے دور رہ لوں گی اور اس مقام پر ایک اجنبی کی طرح زندگی بسر کرلوں گی مگر آخر کار کیا ہوگا، کون میری بات قبول کرے گا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے حاملہ ہوگئی۔ سوائے اس کے کہ اس کا دامن آلودہ ہو، میں اس اتہام کے مقابلہ میں کیا کروں گی۔ واقعاً وہ لڑکی جو سالہا سال سے پاکیزگی وعفت اور تقویٰ و پرہیزگاری کی علامت تھی۔ اور خدا کی عبادت و بندگی میں نمونہ تھی، جس کے بچپنے میں کفالت کرنے پر بنی اسرائیل کے زاہد و عابد فخر کرتے تھے۔ اور جس نے ایک عظیم پیغمبر کے زیر نظر پرورش پائی تھی، خلاصہ یہ ہے کہ جس کے اخلاق کی دھوم اور پاکیزگی کی شہرت ہر جگہ پہنچی ہوئی تھی اس کے لئے یہ بات بہت ہی دردناک تھی کہ ایک دن وہ یہ محسوس کرے کہ اس کا یہ سب معنوی سرمایہ خطرے میں پڑ گیا ہے، اور وہ ایک ایسی تہمت کے گرداب میں پھنس گئی ہے کہ جو بدترین تہمت شمار ہوتی ہے۔ اور یہ تیسرا لرزہ تھا کہ جو اس کے جسم پر طاری ہوا۔

لیکن دوسری طرف وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ فرزند خداوند تعالیٰ کا موعود پیغمبر ہے۔ یہ ایک عظیم آسمانی تحفہ ہوگا، وہ خدا کہ جس نے مجھے ایسے فرزند کی بشارت دی ہے اور ایسے معجزانہ طریقے سے اسے پیدا کیا ہے مجھے اکیلا کیسے چھوڑے گا؟ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس قسم کے اتہام کے مقابلہ میں میرا دفاع نہ کرے؟ میں نے تو اس کے لطف وکرم کو ہمیشہ آزمایا ہے اور اس کا دست رحمت ہمیشہ اپنے سر پر دیکھا ہے۔

اس بات پر کہ مریم سلام اللہ علیہا کی مدت حمل کس قدر تھی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ قرآن میں سربستہ طور پر بیان ہوا ہے (پھر بھی) بعض نے اسے ایک گھنٹہ، بعض نے نو گھنٹے بعض نے چھ ماہ بعض نے سات ماہ بعض نے آٹھ ماہ اور بعض نے دوسری عورتوں کی طرح نو مہینے کہا ہے، لیکن یہ موضوع اس واقعے کے مقصد پر اثر نہیں رکھتا۔ روایات بھی اس سلسلہ میں

مختلف ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ جگہ "قصیٰ" (دور دراز) کہاں تھی، بہت سے لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ شہر "ناصرہ" تھا اور شاید اس شہر میں بھی وہ مسلسل گھر ہی میں رہتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔

جو کچھ بھی تھا مدت حمل ختم ہوگئی اور مریم سلام اللہ علیہا کی زندگی کے طوفانی لمحات شروع ہو گئے انہیں سخت درد زہ کا آغاز ہوگیا۔ ایسا درد جو انہیں آبادی سے بیابان کی طرف لے گیا۔ ایسا بیابان جو انسانوں سے خالی، خشک اور بے آب تھا۔ جہاں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

اگرچہ اس حالت میں عورتیں اپنے قریبی اعزاء کی پناہ لیتی ہیں تاکہ وہ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ان کی مدد کریں، لیکن مریم سلام اللہ علیہا کی حالت چونکہ ایک استثنائی کیفیت تھی، وہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی ان کے وضع حمل کو دیکھے، لہٰذا درد زہ کے شروع ہوتے ہی انہوں نے بیابان کی راہ لی۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے: "وضع حمل کا وہ درد اسے کھجور کے درخت کے پاس کھینچ لے گیا"۔ [1] قرآن میں "جذع النخلة" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ "جذع" درخت کے تنا کے معنی میں ہے، یہ نشاندہی کرتا ہے کہ: اس درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا یعنی وہ خشک شدہ درخت تھا۔

اے کاش اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی!

اس حالت میں غم واندوہ کا ایک طوفان تھا جو مریم سلام اللہ علیہا کے پورے وجود پر طاری تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ جس لمحے کا خوف تھا وہ آن پہنچا ہے ایسا لمحہ کہ جس میں وہ سب کچھ

---

[1] سورہ مریم آیت 23

آشکار ہو جائے گا جواب تک چھپا ہوا ہے اور بے ایمان لوگوں کی طرف سے ان پر تہمت کے تیروں کے بارش شروع ہو جائے گی۔

یہ طوفان اس قدر سخت تھا اور یہ باران کے دوش پر اتنا سنگین تھا کہ بے اختیار ہو کر بولیں: ''اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل بھلادی جاتی'' [1]

یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کو صرف آئندہ کی تہمتوں کا خوف ہی نہیں تھا کہ جوان کے دل کو بے چین کیے ہوئے تھا، بلکہ انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ دوسری مشکلات بھی تھیں۔ کسی دایہ اور ہمدم و مددگار کے بغیر وضع حمل، سنسان بیابان میں بالکل تنہائی، آرام کے لئے کوئی جگہ نہ ہونا، پینے کے لئے پانی اور کھانے کے لئے غذا کا فقدان اور نومولود کے لئے نگہداشت۔ کے کسی وسیلے کا نہ ہونا یہ ایسے امور تھے کہ جنہوں نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا۔ اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نے ایمان اور توحید کی ایسی معرفت کے ہوتے ہوئے اور خداوند متعال کے اتنے لطف و کرم اور احسانات دیکھنے کے باوجود ایسا جملہ زبان پر کیسے جاری کیا کہ ''اے کاش میں مرگئی ہوتی اور فراموش ہو چکی ہوتی'' انہوں نے اس وقت میں جناب مریم سلام اللہ علیہا کی حالت کا تصور ہی نہیں کیا۔ اور وہ خود ان مشکلات میں سے کسی چھوٹی سی مشکل میں بھی گرفتار ہو جائیں تو ان کے ایسے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے کہ انہیں خود اپنی ہی خبر نہ رہے گی اور وہ خود کو بھی بھول جائیں گے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہ رہی اور امید کا وہی روشن نقطہ جو ہمیشہ ان کے دل کی گہرائیوں میں رہتا تھا چمکنے لگا ''یکا یک ایک آواز ان کے کانوں میں آئی جوان کے پاؤں کے نیچے سے بلند ہو رہی تھی کہ غمگین نہ ہو، ذرا غور سے دیکھ تیرے پروردگار نے تیرے پاؤں کے نیچے ایک خوشگوار پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے''۔ [2]

---

[1] سورہ مریم آیت 23

[2] سورہ مریم آیت 24

ایک نظر اپنے سر کے اوپر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ کس طرح خشک تنہ بار اور کھجور کے درخت میں تبدیل ہو گیا ہے، کہ پھلوں نے اس کی شاخوں کو زینت بخشی ہے" اور اس کھجور کو ہلاؤ تا کہ تازہ کھجوریں تم پر گرنے لگیں۔ اس لذیذ اور قوت بخش غذا میں سے کھاؤ اور اس کے خوشگوار پانی میں سے پیو۔ اور اپنی آنکھوں کو اس نومولود سے روشن رکھو۔ اور اگر آئندہ کے حالات سے پریشانی ہے تو مطمئن رہو، جب تم کسی بشر کو دیکھو اور وہ تم سے اس بارے میں وضاحت چاہے تو اشارہ کے ساتھ اس سے کہہ دینا کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لئے روزہ رکھا ہوا ہے، خاموشی کا روزہ اور اس سبب سے میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی"۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ تم آپ اپنا دفاع کرو، وہ ذات کہ جس نے یہ مولود تمہیں عطا کیا ہے، اس نے تیرے دفاع کی ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لی ہے اس لئے تم ہر طرح سے مطمئن رہو اور غم واندوہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔ ان پے در پے واقعات نے جو ایک انتہائی تاریک فضا میں روشن شعلوں کی طرح چمکنے لگے تھے، ان کے دل کو پوری طرح روشن کر دیا تھا اور انہیں ایک سکون بخش دیا تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی گہوارے میں باتیں

"آخر کار حضرت مریم سلام اللہ علیہا اپنے بچے کو گود میں لئے ہوئے بیابان سے آبادی کی طرف لوٹیں اور اپنی قوم اور رشتہ داروں کے پاس آئیں"۔ [2]

جونہی انھوں نے ایک نومولود بچہ ان کی گود میں دیکھا تعجب کے مارے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ لوگ کہ جو مریم سلام اللہ علیہا کی پاکدامنی سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے تقویٰ و

---

[1] سورہ مریم آیت 25 تا 26

[2] سورہ مریم آیت 27۔

کرامت کی شہرت کو سن چکے تھے، سخت پریشان ہوئے، یہاں تک کہ ان میں سے کچھ تو شک وشبہ میں پڑ گئے اور بعض ایسے لوگ کہ جو فیصلہ کرنے میں جلد باز تھے انھوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگے اس بدکاری کے ساتھ تمہارے روشن ماضی پر بہت افسوس اور صد افسوس اس پاک خاندان پر کہ جو اس طرح بدنام ہوا" کہنے لگے: اے مریم تو نے یقینا بہت ہی عجیب اور برا کام انجام دیا ہے"۔ [1]

بعض نے ان کی طرف رخ کیا اور کہا: "اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو کوئی برا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی"۔ [2]

ایسے پاک و پاکیزہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے ہم یہ تیری کیا حالت دیکھ رہے ہیں، تو نے اپنے باپ کے طریقہ اور ماں کے چلن میں کون سی برائی دیکھی تھی کہ تو نے اس سے رو گردانی کر لی۔ [3]

اس وقت جناب مریم سلام اللہ علیہا نے خداوند متعال کے حکم سے خاموشی اختیار کی، صرف ایک کام جو انھوں نے انجام دیا یہ تھا کہ اپنے نومولود بچے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن اس کام نے ان کے تعجب کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور شاید ان میں سے بعض نے اس بات کو ان کے ساتھ تمسخر کرنے پر محمول کیا اور وہ غصے میں آ کر بولے: اے مریم ایسا کام

---

[1] سورہ مریم آیت 27

[2] سورہ مریم آیت 28

[3] یہ بات کہ جو انھوں نے مریم سلام اللہ علیہا سے کہی کہ "اے ہارون کی بہن" مفسرین کے درمیان مختلف تفاسیر کا موجب بنی ہے، لیکن جو بات سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہارون ایک ایسا پاک و صالح آدمی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے درمیان ضرب المثل ہو گیا تھا۔
وہ جس شخص کا پاکیزگی کے ساتھ تعارف کروانا چاہتے تھے تو اس کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ ہارون کا بھائی ہے یا ہارون کی بہن ہے، مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس معنی کو ایک مختصر حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے

کر کے تو اپنی قوم کا مذاق اڑا رہی ہے۔

بہر حال انھوں نے اس سے کہا: ''ہم ایسے بچے کے ساتھ جو کہ ابھی گہوارے میں ہے کیسے باتیں کریں''۔ [1]

بہر حال وہ لوگ اس کی بات سن کر پریشان ہو گئے، بلکہ شاید غضب ناک ہو گئے، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے سے یہ کہا کہ اس تمسخر اور استہزاء کرنا، جادہ عفت و پاکدامنی سے اس کے انحراف کی نسبت ہمارے لئے زیادہ سخت اور سنگین تر ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی، کیونکہ اس نومولود بچے نے بات کرنے کے لئے زبان کھولی اور کہا:

''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے آسمانی کتاب مرحمت فرمائی ہے، اور مجھے پیغمبر قرار دیا ہے''۔

''اور خدا نے ایک بابرکت وجود قرار دیا ہے، خواہ میں کہیں بھی ہوں، میرا وجود بندوں کے لئے ہر لحاظ سے مفید ہے''۔

''اور اس نے مجھے تا حیات نماز پڑھتے رہنے اور زکوۃ دینے کی وصیت کی ہے''۔

''اور اس کے علاوہ مجھے اپنی والدہ کے بارے میں نیکوکار، قدردانی کرنے والا اور خیر خواہ قرار دیا ہے''۔

''اور اس نے مجھے جبار و شقی قرار نہیں دیا ہے''۔ [2]

آخر میں یہ نومولود کہتا ہے: ''خدا کا مجھ پر سلام و درود ہو اس دن کہ جب میں پیدا ہوا

---

[1] سورہ مریم آیت 29

[2] سورہ مریم آیت 30 تا 32 ''جبار اس شخص کو بھی کہتے ہیں کہ جو غیظ و غضب کے عالم میں لوگوں کو مارتا اور نابود کرتا ہو، اور فرمان عقل کی پیروی کرتا ہو۔

اور اس دن جب میں مروں گا اور اس دن کہ جب میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا"۔ [1]

یہ تین دن انسان کی زندگی میں۔۔۔۔۔زندگی ساز اور خطرناک دن ہیں کہ جن میں سوائے لطف خدا کے سلامتی میسر نہیں ہوتی، اسی لئے حضرت یحیٰی علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ جملہ آیا ہے اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بارے میں بھی، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے موقع پر خداوند متعال نے یہ بات کہی ہے اور دوسرے موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ تقاضا کیا ہے۔ [2]

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمی لحاظ سے یہ بات ممکن ہے کہ باپ کے بغیر بچہ پیدا ہو، کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صرف اکیلی ماں سے پیدا ہونے کا مسئلہ، اس بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے مخالف نہیں ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ کام معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوا تھا، لیکن موجودہ زمانے کا علم اور تحقیق اس قسم کے امر کے امکان کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کے ممکن ہونے کی تصریح کرتا ہے۔

خاص طور پر نر کے بغیر بچہ پیدا ہونا بہت سے جانوروں میں دیکھا گیا ہے، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ نطفے کے انعقاد کا مسئلہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، اس امر کے امکان کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہے۔

"ڈاکٹر الکسیس کارل" مشہور فرانسیسی "فزیالوجسٹ" اور حیات شناس اپنی کتاب "انسان موجود ناشناختہ" میں لکھتا ہے:

جس وقت ہم اس بارے میں غور کرتے ہیں کہ تولید نسل میں ماں اور باپ کا کتنا کتنا حصہ ہے تو ہمیں "لوب" اور "باتایون" کے تجربوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے کہ قورباغہ کے بارور نہ ہوتے ہوئے چھوٹے سے تخم کو "سپرماتوز" کے دخل کے بغیر ہی خاص تکنیک کے ذریعہ ایک جدید قورباغہ کو وجود میں لایا جاسکتا ہے۔

---

[1] سورہ مریم آیت 33

[2] باکرہ سے بچہ پیدا ہونا

اس ترتیب سے کہ ممکن ہے کہ کیمسٹری یا فزکس کے ایک عامل کو "نر سل" کا جانشین بنا دیا جائے لیکن ہر حالت میں ہمیشہ ایک عامل مادہ کا وجود ضروری ہے۔

اس بناء پر وہ چیز کہ جو سائنسی لحاظ سے بچے کے تولد میں قطعیت رکھتی ہے وہ ماں کے نطفہ "اوول" کا وجود ہے، ورنہ نر کے نطفہ (سپرماٹوزا) کی جگہ پر دوسرا عامل کو جانشین بنایا جا سکتا ہے، اسی بناء پر نر کے بغیر بچے کی پیدائش کا مسئلہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو آج کی دنیا میں ڈاکٹروں کے نزدیک قابل قبول قرار پا چکی ہے، اگرچہ ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر یہ مسئلہ خداوند متعال کے قوانین آفرینش کے سامنے ایسا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو حکم دیا کہ ہو جا تو وہ بھی ایک کامل موجود ہو گیا۔[1]

یعنی یہ خارق العادۃ اس خارق العادۃ سے زیادہ اہم نہیں ہے نوزائیدہ بچہ کس طرح بات کر سکتا ہے؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: کوئی نوزائیدہ بچہ تولد کے ابتدائی گھنٹوں یا دنوں میں بات نہیں کرتا، کیونکہ بات کرنا دماغ کی کافی نشوونما اور اس کے بعد زبان و حنجرہ کے عضلات کا بڑھنا اور انسانی بدن کے مختلف اعضاء کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا محتاج ہے، اور ان امور کے لئے حسب معمول کئی مہینے گزرنے چاہئیں تا کہ یہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بچوں میں فراہم ہوں۔

لیکن پھر بھی کوئی علمی دلیل اس امر کے محال ہونے پر ہمارے پاس نہیں ہے، صرف یہ ایک غیر معمولی کام ہے اور تمام معجزات اسی قسم کے ہوتے ہیں یعنی سب ہی غیر معمولی کام ہوتے ہیں نہ کہ محال عقلی۔

---

[1] سورہ آل عمران 59

جناب عیسیٰ علیہ السلام کی ماموریت کا آغاز

جو افراد خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے میں علم و دانش کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیں، اور زندہ و انسان ساز آئین و قوانین پیش کریں، پھر دوسرے مرحلے میں خدا سے اپنے ارتباط کے لئے واضح اسناد دکھائیں اور یوں خدا کی طرف سے منسوب ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

اس مقصد کے لئے ہر پیغمبر اپنے زمانے کے ترقی یافتہ علوم کی قسم کے معجزے سے لیس ہوتا ہے تاکہ جہان ماوراء طبیعت سے ان کا ارتباط زیادہ واضح ہو جائے اور ہر زمانے کے علماء ان کے مقابلے میں اپنے عجز کی وجہ سے ان کی دعوت کی حقانیت کا اعتراف کریں۔

یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منقول ہے، ان سے سوال کیا گیا تھا: ہر پیغمبر کے پاس کچھ نہ کچھ معجزات کیوں ہوتے تھے، اس سوال کے جواب میں آپ نے وضاحت فرمائی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگر بہت زیادہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا عمل انجام دیا جس کے مقابلے میں تمام جادوگر عاجز آ گئے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں اور دعوت کے موقع پر اطباء بیماروں کے علاج میں مہارت رکھتے تھے، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بیماروں کو مادی مسائل کے بغیر شفاء دیکر اپنی حقانیت کو ثابت کر دیتے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں خطباء، شعراء اور سخنور بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے مالک تھے اور ان سب نے قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے پہلے فرمایا ہے: ''خدا نے اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دی'' اور اس کے بعد کتاب و حکمت کے مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا: ''توریت و انجیل سکھائی''، اور اس کے بعد بنی اسرائیل

کے منحرف لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے، فرمایا: ''ہم نے ان کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا''۔ [1]

معجزات عیسیٰ علیہ السلام

درحقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لئے قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کی تفصیل کے موقع پر سب سے پہلے حکم خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرمایا گیا ہے: ''میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نشانی لایا ہوں، میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بناتا ہوں اور اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے''۔ [2]

حکم خدا سے ایجاد حیات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام زندہ موجودات مٹی اور پانی سے وجود میں آئے ہیں،

زیادہ سے زیادہ اسے تدریجی تحول و تغیر کہہ سکتے ہیں اور یہ تبدیلی عرصہ دراز میں وقوع پذیر ہوجائیں اور مٹی زندہ موجود میں بدل جائے۔ جب کہ یہ معجزہ پیش کرنے والے کا ربط ماوراء الطبیعات اور پروردگار کی لامتناہی قدرت کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد ان بیماریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابل علاج نہیں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: ''میں مادر زاد اندھے اور ابرص (برص اور سفید داغ والی بیماری) میں

---

[1] سورہ آل عمران آیت 49

[2] سورہ آل عمران آیت 49

جتلا لوگوں کا علاج کر سکتا ہوں اور مردوں کو بھی لباس حیات پہنا سکتا ہوں"۔ [1]

واضح ہے کہ یہ امور خصوصاً اس زمانے کے اطباء اور علماء کے لئے نا قابل انکار معجزات تھے۔

بعد کے مرحلے میں لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی نے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ رابطہ کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ انہوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتادے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس نے غیبی منبع عالم سے الہام حاصل کیا ہے، جناب مسیح علیہ السلام کہتے ہیں: "میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں"۔ [2]

تفسیر المنار کے مصنف اور بعض دیگر مفسرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن میں مذکورہ معجزاتی امور جو حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے بیان کیے ہیں ان کی کچھ نہ کچھ توجیہ کی جانا چاہئے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو فقط دعویٰ کیا تھا کہ میں حکم خدا سے ایسا کر سکتا ہوں لیکن عملی طور پر یہ کام ہرگز انجام نہیں دیئے حالانکہ اگر فرض کریں کہ اس آیت میں یہ احتمال ہو پھر بھی سورہ مائدہ آیت (110) میں ہے:

"وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ"۔

"(اے عیسیٰ) خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تم پر یہ بھی تھی کہ تم گیلی مٹی سے پرندہ بناتے تھے، اس میں پھونکتے تھے اور وہ حکم خدا سے زندہ ہو جاتا تھا"

لہٰذا مندرجہ بالا دلیل قابل قبول نہیں کیونکہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں تو پوری صراحت سے ان کے عملاً کر گزرنے کا ذکر ہے۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت 49

[2] کیا یہ معجزات باعث تعجب ہیں؟

علاوہ ازیں ایسی توجیہات پر اصرار کے لئے کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ اگر مراد انبیاء کے خارق العادۃ افعال کا انکار ہے تو قرآن نے بہت سے مواقع پر اس کی تصریح کی ہے اور بالفرض ایک آدھ جگہ پر توجیہ کر بھی لیں تو بقیہ مواقع پر کیا کیا کریں گے۔

ان سب پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم خدا کو تمام قوانین فطرت و طبیعت پر حاکم جانتے ہیں نہ کہ ان کا محکوم، تو پھر کیا مانع ہے کہ اس کے حکم سے استثنائی مواقع پر طبیعت کے معمول کے قوانین میں غیر معمولی طریقے سے تبدیلی وقوع پذیر ہو جائے۔ اگر وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ امر خدا کی توحید افعالی، کی خالقیت اور لاشریک ہونے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں تو قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کیونکہ تمام جگہوں پر ان واقعات کے وقوع کو حکم خدا سے مشروط قرار دیا ہے یعنی کوئی شخص بھی اپنی ذاتی قوت وطاقت کے ذریعے ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا مگر یہ کہ حکم خدا اور اس کی بے پایاں قدرت کو منظور ہو اور یہ عین توحید ہے شرک نہیں۔

میں خدا کا بندہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے خاتمے کے لئے اور اس لئے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپؑ کی الوہیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے: "اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے" نیز کہتے: "میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں"۔ [1]

اس کے برخلاف موجودہ تحریف شدہ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کے بارے میں باپ کا لفظ نقل کیا گیا ہے، قرآن میں ایسے مقامات پر لفظ "رب" یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

"ان اللہ ربی وربکم"۔

[1] سورہ آل عمران آیت 51

اور یہ چیز دعوائے الوہیت کے خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیح علیہ السلام کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عیسائیوں کی گفتگو

نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر وحی نازل ہوئی، وہ ایک ساٹھ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مدینہ میں آئے۔ اس میں ان کے چند نمائندہ، روسا اور بزرگ شامل تھے۔

انہوں نے جو مسائل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کئے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدائے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اس کی طرف سے ہدایت مخلوق کی خاطر رسالت کے منصب پر فائز ہوں۔ نیز یہ کہ مسیح علیہ السلام اس کے بندوں میں سے ایک تھے، حالات بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے۔

انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔

درحقیقت قرآن کا یہ ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعوئ الوہیت کا جواب ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خدا کے بیٹے یا خود خدا تھے، کیونکہ یہ بات تو حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق اور ثابت ہو چکی ہے۔ وہ تو ماں باپ دونوں کے بغیر دنیا میں آئے تھے، اس لئے جیسے حضرت آدم کی مٹی سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور وہ خدا جو کام انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے،

بلکہ حضرت آدم کی پیدائش کئی لحاظ سے زیادہ تعجب خیز ہے، پس اگر بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو حضرت آدم اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

خیالی تثلیث

قرآن میں کفار اور اہل کتاب کے بارے میں جاری مباحث کے حوالے سے مسیحی معاشرے کے اہم ترین انحراف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے تثلیث یا تین خداؤں کا مسئلہ۔

مختصر سے استدلالی جملوں کے ساتھ انھیں اس عظیم انحراف کے انجام بد سے ڈرایا گیا ہے۔

قرآن پہلے انہیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اپنے دین میں غلو کی راہ نہ چلو اور حق کے علاوہ خدا کے بارے میں کچھ نہ کہو۔" [1]

تثلیث اور الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال اس سلسلے میں چند نکات پیش خدمت ہیں:

1۔ عیسیٰ علیہ السلام مریم کے بیٹے ہیں

قرآن حکیم میں عیسیٰ علیہ السلام کا نام ان کی والدہ کے نام کے ساتھ سولہ مرتبہ آیا ہے یعنی "عیسیٰ علیہ السلام صرف مریم کے بیٹے ہیں" یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ مسیح علیہ السلام بھی دیگر انسانوں کی طرح رحم مادر میں رہے اور ان پر بھی جنین کا دور گذرا وہ دیگر انسانوں کی طرح پیدا ہوئے، دودھ پیا اور آغوش مادری میں پرورش پائی۔

یعنی تمام بشری صفات ان میں موجود تھیں۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو قوانین طبیعت اور عالم مادہ کا محتول و محکوم ہو، وہ خدائے ازلی و ابدی بن جائے۔

خصوصاً لفظ "انما" جو قرآن میں آیا ہے وہ اس وہم کا جواب ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کا

---

[1] سورہ نساء آیت 171

باپ نہیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے بلکہ وہ صرف اور صرف مریم سلام اللہ علیہا کا بیٹا ہے۔

2۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام خدا کے فرستادہ اور رسول ہیں "رسول اللہ"، عیسیٰ علیہ السلام کا یہ مقام اور حیثیت بھی ان کی الوہیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مختلف باتیں جن میں سے کچھ اناجیل موجودہ میں بھی ہیں، سب کی سب انسانی ہدایت کے لئے ان کی نبوت و رسالت کی حکایت کرتی ہیں نہ کہ ان کی الوہیت اور خدائی کی۔

3۔ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں:

عیسیٰ علیہ السلام خدا کا کلمہ ہیں جو مریم سلام اللہ علیہا کی طرف القاء ہوا۔ قرآن کی چند آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ کہا گیا ہے، یہ تعبیر مسیح کے مخلوق ہونے کی طرف اشارے کے لئے ہے جیسے ہمارے کلمات، ہماری مخلوق اور ایجاد ہیں، اسی طرح عالم آفرینش کے موجودات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ نیز جیسے ہمارے کلمات ہمارے اندرونی اسرار کا مظہر ہوتے ہیں اور ہمارے جذبات و صفات کے ترجمان ہوتے ہیں اسی طرح مخلوقات عالم بھی خدا کی صفات جمال و جلال کو واضح کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی میں متعدد مقامات پر تمام مخلوقات کے لئے لفظ "کلمہ" استعمال کیا گیا ہے۔ (1)

البتہ یہ کلمات آپس میں مختلف ہیں، بعض بہت اہم اور بلند ہیں اور بعض نسبتاً معمولی اور کم تر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آفرینش کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ مقام رسالت کے علاوہ

---

(1) مثلاً سورۂ کہف آیت 109، سورۂ لقمان آیت 27

یہ امتیاز بھی رکھتے تھے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا کیے گئے۔

4۔ عیسیٰ علیہ السلام روح ہیں:

جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے، یہ تعبیر قرآن حکیم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بھی آئی ہے۔ ایک معنی کے لحاظ سے تمام نوع انسانی کے بارے میں ہے یہ اس روح کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جسے خدا نے دیگر انسانوں میں عموماً اور حضرت مسیح علیہ السلام اور باقی انبیاء میں خصوصیت سے پیدا کیا۔

علاوہ ازیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ عیسائی حضرات، والد کے بغیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے اس مخصوص خلقت کو کوئی بھی ان کی الوہیت کی دلیل نہیں سمجھتا۔

اس بیان کے بعد قرآن کہتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو خدائے یگانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ اور یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں اور اگر اس بات سے اجتناب کرو، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے"۔ [1]

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتظار میں

اہل یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشن گوئی اور بشارت کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے منتظر تھے۔ لیکن جب انہوں نے ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کے ایک ستمگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خطرے میں نظر آئے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کرنے

---

[1] سورہ نساء آیت 171

اور احکام کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر و منزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی انہوں نے قوانین الٰہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا۔ دلیل و برہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور کج روی سے دستبردار نہیں ہوگا، لہٰذا انہوں نے پکار کر کہا: ''کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور میرا دفاع کرے؟''۔ ①

صرف تھوڑے سے افراد نے اس کا مثبت جواب دیا۔ یہ چند پاک باز افراد تھے جنہیں قرآن نے ''حواریین'' کا نام دیا ہے۔

انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پکار کا جواب دیا اور ہر لحاظ کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفاع کرنے سے دریغ نہ کیا۔

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے ان سے نقل کیا ہے، کہنے لگے: ''ہم خدا کے یاور و مددگار ہیں، خدا پر ایمان لائے ہیں اور آپؑ کو اپنے اسلام پر گواہ بناتے ہیں''۔ ②

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپؑ کے مددگار ہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور خلوص کے ثبوت کے لئے اور اس مقصد کے لئے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی بو نہ آئے، وہ کہنے لگے: ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اس کے دین کی مدد کریں گے اور آپؑ کو اس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں۔ گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ منحرف اور کج رو افراد آئندہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا دعویٰ کریں گے لہٰذا وہ ان کے ہاتھوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے۔

---

① سورہ آل عمران آیت 52

② سورہ آل عمران آیت 52

حواری کون تھے؟

"حواریین" "حواری" کی جمع ہے اس کا مادہ "حور" ہے جس کا معنی ہے "دھونا اور سفید کرنا" ہے، کبھی کبھی یہ لفظ ہر سفید چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے اسی لئے سفید غذا کو عرب لوگ "حواری" کہتے ہیں۔ بہشت کی حوروں کو بھی ان کے سفید رنگ کی وجہ سے "حور" کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں کو "حواری" کیوں کہا گیا، اس کے لئے بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں مگر جو چیزیں زیادہ قریب عقل ہے اور دین کے عظیم رہبروں سے منقول احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ پاک دل لوگ تھے اور روح باصفا کے مالک تھے اس کے علاوہ وہ دوسروں کے افکار کو پاکیزہ اور روشن کرنے، لوگوں کے دامن کو آلودگی اور گناہ سے دھونے اور انہیں پاک کرنے میں بہت کوشاں رہتے تھے۔

عیون الرضا میں امام علی بن موسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے: آپؑ سے سوال کیا گیا: حواریوں کا یہ نام کیوں رکھا گیا؟

آپؑ نے فرمایا: "بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا مشغلہ کپڑے دھونا تھا، لیکن ہمارے نزدیک اس کی علت یہ ہے کہ انھوں نے خود کو بھی گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا تھا اور دوسروں کو بھی پاک کرنے میں کوشاں رہتے تھے"۔

حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں

قرآن نے حواریوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے۔

[1]

لیکن انجیل میں حواریوں کے بارے میں جو جملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لغزش کرتے تھے۔ انجیل متی اور لوقا کے باب 6 میں حواریوں کے نام اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

1۔ پطرس،	2۔ اندریاس،	3۔ یعقوب،
4۔ یوحنا،	5۔ فیلوپس،	6۔ برتولولما،
7۔ ثوما،	8۔ متی،	9۔ یعقوب بن حلفا،
10۔ شمعون (جن کا لقب غیور تھا)	11۔ یہودا (جو یعقوب کے بھائی تھے)	

12۔ یہودائے اسخریوطی (جس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے خیانت کی)

مشہور مفسر طبری مجمع البیان میں لکھتے ہیں: حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں بھوک یا پیاس لگتی، حکم خدا سے آب و غذا ان کے لئے مہیا ہوجاتی۔ وہ اسے اپنے لئے عظیم افتخار اور بڑا اعزاز سمجھتے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھتے: کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی افضل و بالاتر ہے، تو وہ کہتے: ہاں "وہ شخص تم سے افضل ہے جو اپنے ہاتھ سے کماتا ہے اور اپنی کمائی کھاتا ہے"۔ اس کے بعد وہ لوگوں کے کپڑے دھوتے تھے اور اس کام سے اجرت لیتے تھے (یوں عملاً انہوں نے سب لوگوں کو درس دیا کہ کام اور کوشش کرنا کوئی ننگ و عار نہیں ہے)۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے: "پروردگار جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں"۔ [2]

---

[1] سورہ صف آیت 14

[2] سورہ آل عمران 53

لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لئے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبر خدا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی پیروی کا ذکر کرنے لگے اور کہنے لگے: "ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیح کی پیروی کی"۔ [1]

اور یہ ہمارے ایمان راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔

اس کے بعد انہوں نے تقاضا کیا کہ خدا ان کے نام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے زمرے میں شمار کرے۔ یہ گواہ وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں امتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بد اعمال کے گواہ ہوں گے۔

حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

قرآن ان نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیکی اصحاب و انصار کو بخشی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کرلیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے، خدایا گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد مائدہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مسیح کے اصحاب خاص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لئے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے؟"۔ [2]

---

[1] سورہ آل عمران 53

[2] سورہ مائدہ آیت 112

حضرت مسیح علیہ السلام نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے ایسے معجزات وآیات دکھانے کے باوجود شک اور تردید کی بو آرہی تھی، غور کیا اور انہیں تنبیہ کی اور کہا کہ: "اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو"۔[1]

لیکن انہوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بتادیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے" بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں (اور آسمانی غذا کے کھانے سے نورانیت ہمارے دل میں پیدا ہوگی، کیونکہ غذا مسلمہ طور پر روح انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کے علاوہ) ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہوگی اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم "علم الیقین" کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تاکہ ہم اس پر گواہی دے سکیں"۔[2]

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے اس مطالبہ میں ان کی حسن نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا: "کہ خداوندا ہمارے لئے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اول وآخر کے لئے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین روزی رساں ہے"۔[3]

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی درخواست کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا، جس میں حق طلبی کی روح کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اور اجتماعی وعمومی مصالح کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

خداوند متعال نے اس دعا کو کہ جو حسن نیت اور خلوص کے ساتھ دل سے نکلی تھی قبول

---

[1] سورہ مائدہ آیت 112

[2] سورہ مائدہ آیت 113

[3] سورہ مائدہ آیت 114

کرلیا اور ان سے فرمایا کہ: ''میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہئے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہ کفر اختیار کی تو اسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہوگی''۔ [1]

یہ آسمانی مائدہ کیا تھا

یہ آسمانی مائدہ جن چیزوں پر مشتمل تھا ان کے بارے میں قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن احادیث میں ہے کہ جن میں سے ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا چند روٹیاں اور چند مچھلیاں تھیں۔

شاید اس قسم کے معجزے کے مطالبے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بنی اسرائیل پر مائدہ آسمانی اترا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اسی قسم کا تقاضا کیا۔

عہد جدید اور مائدہ

موجودہ چاروں انجیلوں میں مائدہ کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں ہے جس طرح کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ انجیل یوحنا باب 21 میں ایک بیان ایسا موجود ہے کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانے اور ان کی طرف سے روٹی مچھلی کے ساتھ معجزانہ طور پر دعوت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن تھوڑی سی توجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مائدہ آسمانی اور حواریوں کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے۔

---

[1] سورہ مائدہ آیت 115

کتاب ''اعمال رسولان'' میں بھی جو ''عہد جدید'' کی ایک کتاب ہے، پطرس نامی ایک حواری پر نزول مائدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اس بحث سے الگ چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے مگر وہ موجودہ انجیلوں میں نہیں ہیں، ایسے ہی جیسا کہ بہت سے ایسے مطالب ہیں جو انجیلوں میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نزول مائدہ کے واقعہ کے سلسلے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی۔

انجیل یا اناجیل؟

''انجیل'' اصل میں یونانی لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے ''بشارت'' یا ''جدید تعلیم'' یہ اس کتاب کا نام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن نے محل گفتگو میں اور دیگر آیات کہ جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا نام لیا ہے، یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوا ہے اور اسے خدا کی طرف سے نازل شدہ قرار دیا ہے، اب وہ بہت سی اناجیل جو عیسائیوں میں مروج ہیں، وحی الٰہی نہیں ہیں۔ ان اناجیل میں یہ چار زیادہ مشہور ہیں:

1۔ لوقا　　2۔ مرقس　　3۔ متی　　4۔ یوحنا

ان کے وحی الٰہی نہ ہونے کا خود عیسائی بھی انکار نہیں کرتے۔ موجودہ انجیلیں سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں یا ان کے شاگردوں کی ہیں اور آپ سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہیں۔ عیسائیوں کا دعویٰ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے یہ اناجیل الہام الٰہی سے لکھی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد جدید اور اناجیل کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ان کے مصنفین سے واقفیت حاصل کریں۔

عیسائیوں کی اہم ترین مذہبی کتاب عہد جدید کا مجموعہ ہے جس پر تمام عیسائی فرقے ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں۔

عہد جدید کا مجموعہ عہد قدیم کے تیسرے حصے سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ 27 متفرق کتب و رسائل پر مشتمل ہے۔ یہ بالکل مختلف موضوعات کی حامل ہیں۔ ان کی ترتیب یہ ہے:

1۔ انجیل متی: متی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ شاگردوں میں سے ایک تھا۔ یہ انجیل اس نے 38 عیسوی میں یا بعض کے نظریہ کے مطابق سنہ میلادی 50 سے لیکر سنہ میلادی 60 کے درمیان لکھی۔

2۔ انجیل مرقس: کتاب قاموس مقدس کے صفحہ 792 پر ہے کہ مرقس حواریوں میں سے نہ تھا۔ اس نے اپنی انجیل پطرس کی زیر نگرانی تصنیف کی۔ مرقس سنہ میلادی 68 میں قتل ہو گیا۔

3۔ انجیل لوقا: ''لوقا پولس رسول کا رفیق اور ہمسفر تھا۔ پولس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ایک عرصہ بعد عیسائیت قبول کی، یہ آپ کے زمانے میں متعصب یہودی تھا۔ لوقا کی وفات سنہ میلادی 70 کے قریب ہوئی ہے قاموس مقدس کے مولف نے اپنی تالیف کے صفحہ 772 پر لکھا ہے کہ انجیل لوقا کی تالیف عام خیال کے مطابق تقریباً سنہ میلادی 63 میں ہوئی۔

4۔ انجیل یوحنا: یوحنا مسیح علیہ السلام کے شاگردوں میں سے تھا اور پولس کا دوست اور ہمسفر تھا۔ مولف مذکور کے بقول اس کی تالیف زیادہ تر ناقدین کے نزدیک پہلی صدی کے آخری حصے میں لکھی گئی۔

یہ اناجیل عموماً حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دیئے جانے اور اسکے بعد کے حوادث کے ذکر سے معمور ہیں۔ اس سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب اناجیل حضرت مسیح علیہ السلام کے سالہا سال بعد لکھی گئی ہیں، اور ان میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی ہو۔

5۔ اعمال رسولانہ: (صدر اول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور مبلغین کے

اعمال۔)

6۔14 رسالے: مختلف افراد اور اقوام کے نام پولس کے خطوط۔

7۔رسالہ یعقوب: (عہد جدید کے ستائیس کتب و رسائل میں سے یہ بیسواں رسالہ ہے۔)

8۔پطرس کے خطوط: یہ عہد جدید کے اکیسویں اور بائیسویں رسالے پر مشتمل ہیں۔

9۔یوحنا کے خطوط: (یہ تین رسالوں پر مشتمل ہیں 23، 24 اور 25 رسالوں میں یہی خطوط ہیں۔)

10۔نامہ یہودا: (یہ عہد جدید کا چھبیسواں رسالہ۔)

11۔مکاشفہ یوحنا: (یہ عہد جدید کا آخری حصہ ہے۔)

لہٰذا عیسائی مورخین کی تصریح، نیز اناجیل اور عہد جدید کی دیگر کتب و رسائل کے مطابق ان میں سے کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔مزید یہ کہ یہ تمام کتب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں۔اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب درمیان میں سے اٹھ گئی ہے اور آج دستیاب نہیں ہے۔اس کے کچھ حصے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں نے اپنی اناجیل میں بیان کئے ہیں باعث تاسف ہیں کہ ان میں بھی خرافات شامل ہو چکی ہیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ

ہم نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی۔قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیح علیہ السلام

پر کیے ہیں ان کا ذکر ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اے عیسیٰ میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا)۔ [1]

سورہ نساء کی آیت 157 سے استناد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا۔ لیکن خود عیسائی موجودہ اناجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل ہوئے اور بعد ازاں انہیں دفن کر دیا گیا، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اٹھے، تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ [2]

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے، یہ ہے کہ محل بحث آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگرچہ بعض یہ تصور کرتے ہیں کہ "متوفیک" کا مادہ "وفات" ہے اور یہ موت کے معنی میں ہے۔ اس لئے ان کا خیال ہے کہ جو عقیدہ مسلمانوں میں مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وفات نہیں پائی اور وہ زندہ ہیں اس مفہوم کے منافی ہے حالانکہ احادیث بھی اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں نیز فوت ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے اور توفی (بروزن ترقی) "وفی" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے "کسی چیز کی تکمیل کرنا" عہد و پیمان کرنے کو "وفا" بھی تکمیل کرنے اور اسے انجام پہنچانے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ اسی بناء پر اگر کوئی شخص کامل طور پر اپنا حق دوسرے سے اپنی تحویل میں لے لے تو عرب کہتے ہیں "توفی دینہ" یعنی اپنا حق پورا پورا وصول کر لیا۔ آیات قرآنی میں بھی "توفی" بارہا "لینے" کے معنی میں استعمال ہو ہے۔ مثلاً:

وھو الذی یتوفکم بالیل و یعلم ما جرحتم بالنھار۔

وہ ذات وہ ہے جو تمہاری روح کو رات کے وقت لے لیتی ہے اور جو کچھ تم دن کو انجام

---

[1] آل عمران آیت 55

[2] المنار کے مؤلف کی طرح بعض مفسرین اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام قتل ہوئے اور خدا صرف ان کی روح کو آسمان کی طرف لے گیا۔

دیتے ہو اس سے آگاہ ہے۔(انعام۔60) اس آیت میں نیند کو "توفی روح" کہا گیا ہے۔یہی معنی سورہ زمر کی آیہ 42 میں بھی آیا ہے۔ قرآن کی متعدد دیگر آیات میں بھی لفظ "توفی" "لینے" کے معنی میں نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ "توفی" بعض اوقات "موت" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن وہاں بھی درحقیقت موت کے مفہوم میں نہیں بلکہ روح کو اپنی تحویل میں لے لینے کے معنی میں ہے۔ اصولی طور پر "توفی" کے معنی میں "موت" پوشیدہ نہیں ہے۔اور "فوت" کا مادہ "وفی" کے مادہ سے بالکل جدا ہے۔

مسیح علیہ السلام قتل نہیں ہوئے، افسانہ صلیب

قرآن کہتا ہے: "مسیح قتل نہیں ہوئے اور نہ سولی پر چڑھے بلکہ معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا اور انھوں نے خیال کیا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا ہے حالانکہ یقیناً انھوں نے انہیں قتل نہیں کیا"۔ [1]

موجودہ چاروں اناجیل (متی، لوقا، مرقس اور یوحنا) میں حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر لٹکائے جانے اور ان کے قتل کا ذکر ہے۔یہ بات چاروں انجیلوں کے آخری حصوں میں تشریح و تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔آج کے عام مسیحیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو قتل مسیح علیہ السلام اور انہیں مصلوب کیا جانا موجودہ مسیحیت کے اہم ترین بنیادی مسائل میں سے ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسا پیغمبر نہیں مانتے جو مخلوق کی ہدایت، تربیت اور ارشاد کے لئے آیا ہو بلکہ وہ انہیں خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں جس کا اس دنیا میں آنے کا اصلی ہدف ہی خدا ہونا ہے اور اپنی قربانی کے عوض نوع بشر کے گناہوں کا سودا کرتا ہے۔

---

[1] سورہ نساء آیت 157

عیسائی کہتے ہیں کہ وہ اس لئے آئے تا کہ ہمارے گناہوں کا فدیہ بن جائیں وہ سولی چڑھے اور قتل ہوئے تا کہ نوع بشر کے گناہوں کو دھو ڈالیں اور عالمین کو سزا سے نجات دلائیں۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ راہ نجات مسیح علیہ السلام سے رشتہ جوڑنے اور ان کے مصلوب ہونے کا عقیدہ رکھنے میں منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ مسیحیت کو "مذہب نجات" یا "مذہب خدا" کہتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کو "ناجی" یا "فادی" کہتے ہیں یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی صلیب کا نشان بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں، اور صلیب ان کا شعار ہے اسی کی وجہ ان کا یہی عقیدہ ہے۔

یہ تھا حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدے کا خلاصہ، لیکن کوئی مسلمان بھی اس میں شک نہیں رکھتا کہ یہ عقیدہ باطل ہے اس کی وجوہات یہ ہیں۔

1۔ حضرت مسیح علیہ السلام دیگر انبیاء کی طرح ایک پیغمبر تھے نہ وہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے۔ خدا یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شبیہ و نظیر مثل و مانند اور بیوی بیٹا نہیں ہے۔

2۔ گناہوں کا فدیہ بننا بالکل غیر منطقی بات ہے، ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے اور راہ نجات خود انسان کا اپنا ایمان اور عمل صالح ہے۔

3۔ گناہ گاروں کے فدیہ کا عقیدہ فساد، تباہی اور آلودگی کی ترغیب و تشویق کرتا ہے یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن خصوصیت سے مسیح علیہ السلام کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے حالانکہ ظاہراً ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ فدیے اور امت کے گناہ خریدنے کے بے ہودہ اور فضول عقیدے کی سختی سے سرکوبی کی جائے اور عیسائیوں کو اس خرافاتی عقیدے سے نکالا جائے تا کہ وہ نجات کے لئے اپنے اعمال کو درست کریں نہ کہ عقیدہ صلیب کا سہارا لیں۔

4۔ بہت سے قرائن ایسے موجود ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیئے جانے کے عقیدے کی کمزوری پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً:

الف: ہم جانتے ہیں کہ موجودہ چاروں انجیلیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا ذکر کرتی ہیں سب کی سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعے لکھی گئی ہیں اور اس بات کا مسیحی مورخ بھی اعتراف کرتے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے شاگرد دشمنوں کے حملے کے وقت بھاگ گئے تھے اور اناجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ لہٰذا انھوں نے مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے بارے میں عوام میں گردش کرتی ہوئی افواہ یا شہرت سنی اور وہیں سے یہ بات حاصل کی اور جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائے گا کہ حالات ایسے پیش آئے کہ مسیح علیہ السلام کی جگہ دوسرا شخص اشتباہ میں پکڑ لیا گیا۔

ب: دوسرا احتمال جو یہ امکان ظاہر کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بجائے اشتباہ میں دوسرا شخص پکڑا گیا ہو یہ ہے کہ شہر کے باہر "جستیمانی" باغ میں جو لوگ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے گئے وہ رومی لشکر کا ایک دستہ تھا یہ لوگ چھاؤنی میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مشغول تھے یہ لوگ نہ یہودیوں کو پہچانتے تھے نہ وہاں کی زبان اور نہ آداب و رسوم جانتے تھے اور نہ ہی یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے شاگردوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

ج: اناجیل کے مطابق حملہ رات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رہائش گاہ پر ہوا اس صورت میں تو اور بھی آسان ہے کہ تاریکی میں اصل انسان نکل جائے اور کوئی دوسرا اس کی بجائے گرفتار ہو جائے۔

د: تمام انجیلوں کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گرفتار شدہ شخص نے رومی حاکم "پیلاطس" کے سامنے خاموشی اختیار کی اور اس کی گفتگو کے جواب میں اپنے دفاع کے لئے بہت کم ہی کچھ کہا۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو خطرے میں دیکھیں اور اپنے بیان رسا قوت گویائی اور شجاعت اور شہامت کے باوجود اپنا دفاع نہ کریں۔

تو کیا اس سے یہ احتمال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ان کی جگہ پکڑا گیا ہو اور وحشت و اضطراب کا ایسا شکار ہوا ہو کہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کہہ سکا ہو تو قوی احتمال یہ ہے کہ وہ "اسخر یوطی

نامی یہودی" تھا جس نے حضرت مسیح علیہ السلام سے خیانت کی اور ان کے خلاف جاسوسی کا کردار ادا کیا، کہتے ہیں کہ وہ جناب عیسیٰ علیہ السلام سے بہت مشابہت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ موجودہ اناجیل میں ہے کہ اسخریوطی یہودی اس واقعے کے بعد دیکھا نہیں گیا اور اناجیل ہی کے مطابق اس نے خودکشی کر لی تھی۔

ر: جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد اناجیل کی شہادت کے مطابق خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے دوست احباب بھی اس دن چھپ گئے ہوں گے اور دور سے حالات پر نظر رکھے ہوں گے۔ لہٰذا گرفتار شدہ شخص رومی فوجیوں کے محاصرے میں تھا اور اس کے دوستوں میں سے کوئی اس کے گرد موجود نہیں تھا۔ اس میں کون سے تعجب کی بات ہے کہ اشتباہ ہو گیا ہو۔

س: اناجیل میں ہے کہ جس شخص کو تختہ دار پر لٹکانے کا حکم دیا گیا اس نے تختۂ دار پر خدا سے شکایت کی۔

تو نے مجھے کیوں تنہا چھوڑ دیا اور کیوں مجھے قتل ہونے کے لئے دشمن کے ہاتھ میں دے دیا۔

لہٰذا اگر حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ وہ سولی پر لٹکائے جائیں اور نوع انسان کے گناہوں کا فدیہ ہو جائیں تو پھر ایسی ناروا باتیں نہیں کرنا چاہئے تھیں۔ یہ جملہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص نہایت کمزور، ڈرپوک اور عاجز و ناتواں تھا اسی لئے ایسی باتیں کر رہا تھا اور نہ مسیح علیہ السلام ہوتے تو ایسی باتیں ہرگز نہ کرتے۔

ش: مسیحوں کے نزدیک قابل قبول چار انجیلوں کے علاوہ موجودہ بعض اناجیل مثلاً انجیل "برنابا" میں واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض محققین کا یہ نظریہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نام کے دو شخص تھے ایک عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی اور دوسرے کو نہیں دی گئی تھی اور دونوں میں پانچ سو سال کا فاصلہ تھا۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ قرائن مجموعی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل اور صلیب دیے جانے کے بارے میں قرآن کے "دعویٰ اشتباہ" کو واضح کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت، جناب عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی

قرآن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی کارشکنی اور تکذیب کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جبکہ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والا ہوں"۔

"اور میں اس رسول کی بشارت دینے والا بھی ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمدؐ ہے"۔ [1]

عہدین کی بشارتیں اور "فارقلیطا" کی تعبیر

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے پاس جو کچھ توریت و انجیل کے نام سے موجود ہے، وہ خدا کے عظیم پیغمبروں یعنی موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر نازل شدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کتابوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ان کے اصحاب یا ان کے بعد آنے والوں کے ذریعے تالیف ہوا ہے۔ ان کتابوں کا ایک اجمالی مطالعہ اس بات کا زندہ گواہ ہے اور خود عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی اس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں بھی شک نہیں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور کتب آسمانی کے مضامین و مطالب کا کچھ حصہ ان کے پیروکاروں کے کلام کے ضمن میں منتقل ہو گیا

---

[1] سورہ صف آیت 6

ہے۔ اسی بناء پر جو کچھ عہد قدیم (توریت اور اس سے وابستہ کتابوں) اور عہد جدید (انجیل اور اس سے وابستہ کتابوں) میں آیا ہے، نہ تو اس سارے کے سارے کو قبول ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ سب کا سب قابل انکار ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں ان دو عظیم پیغمبروں کی تعلیمات اور دوسرے لوگوں کے افکار و تصورات سے وجود میں آئی ہیں۔

بہر حال موجودہ کتب میں بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں کہ جس کی نشانیاں سوائے اسلام اور اسکے لانے والے کے اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ وہ پیشگوئیاں جو ان کتابوں میں نظر آتی ہیں اور پیغمبر اسلام کی ذات پر صادق آتی ہیں، ان کے علاوہ انجیل "یوحنا" کے تین موارد میں لفظ "فارقلیطا" آیا ہے۔ اس کا فارسی نسخوں میں "تسلی دینے والا" کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ اب آپ انجیل یوحنا کی طرف رجوع کریں: "میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا "تسلی دینے والا" دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔"

بعد والے باب میں آیا ہے: "اور جب وہ تسلی دینے والا آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی، وہ میرے بارے میں شہادت دے گی"۔

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے: "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے مفید ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ "تسلی دینے والا" تمہارے پاس نہیں آئے گا، لیکن اگر میں چلا جاؤں تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا"۔

اہم بات یہ ہے کہ سریانی اناجیل کے متن میں جو اصل یونانی سے لی گئی ہیں "تسلی دینے والے" کے بجائے "پارقلیطا" آیا ہے۔ اور یونانی متن میں "پیرکلتوس" آیا ہے کہ جو یونانی لغت کے لحاظ سے "لائق تعریف شخص" کے معنی میں ہے جو "محمد ﷺ" و "احمد ﷺ" کا معادل ہے۔

لیکن جب ارباب کلیسا (عیسائی پادریوں) نے یہ دیکھا کہ اس قسم کے ترجمہ کی

نشر و اشاعت ان کے گھڑے ہوئے نظریات پر ضرب شدید لگائے گی تو "پیرکلتوس" کی بجائے "پاراکلتوس" لکھ دیا کہ جو "تسلی دینے والے" کے معنی میں ہے اس واضح تحریف کے ذریعے انھوں نے اس زندہ سند کو بدل کر رکھ دیا اگرچہ اس تحریف کے باوجود بھی مستقبل کے عظیم ظہور کی ایک واضح بشارت موجود ہے۔

یہاں ہم آپ کو اس لفظ کے اس ترجمہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں دائرۃ المعارف کے بزرگ نے فرانسہ میں کیا ہے:

"محمد موسس دین اسلام، خدا کا بھیجا ہوا اور خاتم انبیاء ہے لفظ "محمد ﷺ" بہت زیادہ تعریف کئے گئے کے معنی میں ہے اور مادہ حمد سے مشتق ہوا ہے جو تجلیل وتمجید کے معنی میں ہے عجب اتفاق کے زیر اثر ایک اور نام ذکر ہوا کہ اس کا مادہ بھی حمد ہی ہے اور لفظ محمد کا مترادف اور ہم معنی میں ہے عجیب اتفاق فوق یہ ہے کہ عرب کے عیسائی اس لفظ کو "فارقلیط" کے بجائے استعمال کرتے تھے احمد یعنی زیادہ تعریف کیا ہوا اور لفظ "پیرکلتوس" کا بہت عمدہ ترجمہ ہے کہ جس کی بجائے غلطی سے لفظ "پاراکلتوس" رکھ دیا گیا ہے، مسلمان مذہبی مولفین نے یہ بارہا گوش زد کیا ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارت ہے اور قرآن مجید بھی سورہ صف کی حیرت انگیز آیت میں اس موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے"۔ [1]

خلاصہ یہ ہے کہ "فارقلیطا" کا معنی روح القدس یا تسلی دینے والا نہیں ہے، بلکہ یہ "احمد" کے معادل مفہوم رکھتا ہے۔

ایک اور زندہ گواہ

"فخر الاسلام" جو کتاب "انیس الاعلام" کے مؤلف ہیں علماء نصاریٰ میں سے

---

[1] دائرۃ المعارف بزرگ فرانسہ جلد 23 ص 4176

تھے، انھوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علماء ہی میں مکمل کی تھی اور ان کے یہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب وغریب واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں: بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں گردش کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد وتقویٰ میں ممتاز تھا،" کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اسی سے رجوع کرتے تھے، ایک مدت تک میں اس کے پاس نصاریٰ کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا، اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص ہی لگاؤ تھا، اس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں، صرف ایک صندوق خانے کی چابی اس کے اپنے پاس ہوا کرتی تھی، اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جاکر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا، جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث ومباحثے میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ "فارقلیطا" اور یونانی زبان کے لفظ "پریکلوس" کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے، ہر کسی کی الگ رائے تھی، واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں کس قول کا انتخاب کیا ہے، میں نے کہا فلاں مفسر کے قول کا میں نے پسند کیا ہے۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ اس تمام اقوال کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو" راسخون فی العلم" کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں، میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتایئے، وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا، لیکن اس نام کے معنی معلوم ہو جانے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا، اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔

میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ

یہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' ہیں، اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ فلاں صندوق کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے لو، میں کتابیں اس کے پاس لے آیا، یہ دونوں کتابیں رسول اسلام ﷺ کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں دونوں کتب میں لفظ ''فارقلیطا'' کا ترجمہ ''احمد'' اور ''محمد'' کیا گیا تھا اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرت کے ظہور سے پہلے علماء نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد ومحمد ہیں، لیکن ظہور محمد ﷺ کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔

میں نے سوال کیا کہ دین نصاریٰ کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہو گیا ہے اس جملے کی اس نے تین مرتبہ تکرار کی۔

پس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم، کون سا ہے۔

اس نے کہا: منحصر ہے محمد ﷺ کی پیروی واتباع میں۔

میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں، اس نے کہا ہاں خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی)

پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا اگر آخرت اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کر لو، میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمد ﷺ کا پیروکار ہوں اور علماء نصاریٰ کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست کش نہیں ہو سکتے ورنہ کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔''

آپ دیکھیں کہ علماء اہل کتاب نے پیامبر اسلام ﷺ کے ظہور کے بعد اپنے شخصی منافع کی خاطر آنحضرت ﷺ کے نام اور نشانیوں کی اور توجیہات کر دی ہیں۔

حضرت لقمان

حضرت لقمان کا نام سورہ لقمان کی دو آیات میں آیا ہے، آیا وہ پیغمبر تھے یا صرف ایک دانا اور صاحب حکمت انسان تھے؟ قرآن میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی ،لیکن ان کے بارے میں قرآن کا لب ولہجہ نشان دہی کرتا ہے کہ وہ پیغمبر نہیں تھے کیونکہ عام طور پر پیغمبروں کے بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے اس میں رسالت :توحید کی طرف دعوت ،شرک اور ماحول میں موجود بے راہ روی سے نبرد آزمائی ،رسالت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کسی قسم کی اجرت کا طلب نہ کرنا نیز امتوں کو بشارت وانذار کے مسائل وغیرہ دیکھنے میں آتے ہیں ،جب کہ لقمان کے بارے میں ان مسائل میں سے کوئی بھی بیان نہیں ہوا ،صرف انکے پند نصائح بیان ہوئے ہیں جو اگر چہ خصوصی طور پر تو ان کے اپنے بیٹے کے لئے ہیں لیکن ان کا مفہوم عمومی حیثیت کا حامل ہے اور یہی چیز اس بات پر گواہ ہے کہ وہ صرف ایک مرد حکیم ودانا تھے۔

جو حدیث پیغمبر گرامی اسلام ﷺ سے نقل ہوئی ہے اس طرح درج ہے:

''سچی بات یہ ہے کہ لقمان پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جو زیادہ غور وفکر کیا کرتے ،ان کا ایمان ویقین اعلیٰ درجے پر تھا، خدا کو دوست رکھتے تھے اور خدا بھی انہیں دوست رکھتا تھا اور اللہ نے انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا تھا''۔

بعض تواریخ میں ہے لقمان مصر اور سوڈان کے لوگوں میں سے سیاہ رنگ کے غلام تھے باوجود یکہ ان کا چہرہ خوبصورت نہیں تھا لیکن روشن دل اور مصفا روح کے مالک تھے وہ ابتدائے

زندگی سے سچ بولتے اور امانت کو خیانت سے آلودہ نہ کرتے اور جو امور ان سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔

بعض مفسرین نے ان کی نبوت کا احتمال دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ واضح شواہد اس کے خلاف موجود ہیں۔

یہ تمام حکمت کہاں سے

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص نے لقمان سے کہا کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ مل کر جانور چرایا کرتے تھے؟

آپ نے جواب میں کہا ایسا ہی ہے اس نے کہا تو پھر آپ کو یہ سب علم و حکمت کہاں سے نصیب ہوئے؟

لقمان نے فرمایا: اللہ کی قدرت، امانت کی ادائگی، بات کی سچائی اور جو چیز مجھ سے تعلق نہیں رکھتی اس کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے سے

حدیث بالا کے ذیل میں آنحضرتؐ سے ایک روایت یوں بھی نقل ہوئی ہے کہ:

"ایک دن حضرت لقمان دوپہر کے وقت ارام فرما رہے تھے کہ اچانک انھوں نے ایک آواز سنی کہ اے لقمان کیا آپ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم آپ کو زمین میں خلیفہ قرار دے تا کہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں؟

لقمان نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اختیار دے دے تو میں عافیت کی راہ قبول کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر اس قسم کی ذمہ داری میرے کندھے پر ڈال دے گا تو یقیناً میری مدد بھی کرے گا اور مجھے لغزشوں سے بھی محفوظ رکھے گا۔

فرشتوں نے اس حالت میں کہ لقمان انہیں دیکھ رہے تھے کہا اے لقمان کیوں (ایسا

نہیں کرتے؟)

تو انھوں نے کہا اس لئے کیونکہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا سخت ترین منزل اور اہم ترین مرحلہ ہے اور ہر طرف سے ظلم وستم کی موجیں اس کی طرف متوجہ ہیں اگر خدا انسان کی حفاظت کرے تو وہ نجات پاجائے گا لیکن اگر خطا کی راہ پر چلے تو یقیناً جنت کی راہ سے منحرف ہوجائے گا اور جس شخص کا سر دنیا میں جھکا ہوا اور اخرت میں بلند ہو اس سے بہتر ہے کہ جس کا سر دنیا میں بلند اور اخرت میں جھکا ہوا ہو اور جو شخص دنیا کو اخرت پر ترجیح دے تو نہ تو وہ دنیا کو پا سکے گا اور نہ ہی اخرت کو حاصل کرسکے گا۔

فرشتے لقمان کی اس دلچسپ گفتگو اور منطقی باتوں سے متعجب ہوئے لقمان نے یہ بات کہی اور سو گئے اور خدا نے نور حکمت ان کے دل میں ڈال دیا جس وقت بیدار ہوئے تو ان کی زبان پر حکمت کی باتیں تھیں"۔

اصحاب کہف

چند بیدار فکر اور باایمان نوجوان تھے، وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کر رہے تھے، انھوں نے اپنے عقیدے کی حفاظت اور اپنے زمانے کے طاغوت سے مقابلے کے لئے ان سب نعمتوں کو ٹھوکر ماردی پہاڑ کے ایک غار میں جا پناہ لی، وہ جس میں کچھ بھی نہ تھا، یہ اقدام کر کے انھوں نے راہ ایمان میں اپنی استقامت اور پامردی ثابت کردی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس مقام پر قرآن فن فصاحت و بلاغت کے ایک اصول سے کام لیتے ہوئے پہلے ان افراد کی سرگزشت کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تاکہ سننے والوں کا ذہن مائل ہو جائے، اس سلسلے میں چار آیات میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اصحاب کہف کی زندگی کا اجمالی جائزہ

پہلے فرمایا گیا ہے: ''کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف و رقیم ہماری عجیب آیات میں سے تھے''۔ [1]

زمین و آسمان میں ہماری بہت سی عجیب آیات ہیں کہ جن میں سے ہر ایک عظمت تخلیق

[1] سورۂ کہف آیت 9

کا ایک نمونہ ہے، خود تمہاری زندگی میں عجیب اسرار موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک تمہاری دعوت کی حقانیت کی نشانی ہے اور اصحاب کہف کی داستان مسلما ان سے عجیب تر نہیں ہے۔

''اصحاب کہف'' (اصحاب) کو یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے جان بچانے کے لئے میں پناہ لی تھی جس کی تفصیل ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے آئے گی۔

لیکن ''رقیم'' دراصل ''رقم'' کے مادہ سے ''لکھنے'' کے معنی میں ہے، زیادہ تر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ اصحاب کہف کا دوسرا نام ہے کیونکہ آخرکار اس کا نام ایک تختی پر لکھا گیا اور اسے کے دروزاے پر نصب کیا گیا۔

بعض اسے اس پہاڑ کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں یہ تھی اور بعض اس زمین کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں وہ پہاڑ تھا بعض کا خیال ہے کہ یہ اس شہر کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ [1]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

''اس وقت کا سوچو جب چند جوانوں نے ایک غار میں جا پناہ لی''۔ [2]

جب وہ ہر طرف سے مایوس تھے، انہوں نے بارگاہ خدا کا رخ کیا اور عرض کی: ''پروردگارا ہمیں اپنی رحمت سے بہرہ ور کر''۔ [3]

---

[1] سورہ کہف آیت 9

[2] رہا بعض کا یہ احتمال کہ اصحاب کہف اور تھے اور اصحاب رقیم اور تھے بعض روایت میں ان کے بارے میں ایک داستان بھی نقل کی گئی ہے، یہ ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ زیر قرآن کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اصحاب کہف و رقیم ایک ہی گروہ کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ان دو الفاظ کے استعمال کے بعد صرف ''اصحاب کہف'' کہہ کر داستان شروع کی گئی ہے اور انکے علاوہ ہرگز کسی دوسرے گروہ کا ذکر نہیں کیا گیا، یہ صورت حال خود ایک ہی گروہ ہونے کی دلیل ہے۔

[3] سورہ کہف آیت 10

جیسا کہ قرآن میں موجود ہے:

"اذاوی الفتیة الی الکهف"

(فتیة) فتی کی جمع ہے۔ دراصل یہ نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے البتہ کبھی کبھار بڑی عمر والے ان افراد کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ جن کے جذبے جوان اور سرشار ہوں۔ اس لفظ میں عام طور پر جواں مردی حق کے لئے ڈٹ جانے اور حق کے حضور سر تسلیم خم کرنے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔

امام علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: "فتی" کس شخص کو کہتے ہیں؟۔ اس نے جوابا عرض کیا: "فتی" نوجوان کو کہتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تجھے نہیں پتہ کہ اصحاب کہف پکی عمر کے آدمی تھے لیکن اللہ نے انہیں "فتیة" کہا ہے اس لئے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور تقوی اختیار کیے ہو وہ "فتی" (جواں مرد) ہے۔

اور ہمارے لئے راہ نجات پیدا کر دے۔

ایسی راہ کہ جس سے ہمیں اس تاریک مقام سے چھٹکارا مل جائے اور تیری رضا کے قریب کر دے۔ ایسی راہ کہ جس میں خیر و سعادت ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔

ہم نے ان کی دعا قبول کی "ان کے کانوں پر خواب کے پردے ڈال دیئے اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے"۔

"پھر ہم نے انہیں اٹھایا اور بیدار کیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون لوگ اپنی نیند

کی مدت کا بہتر حساب لگاتے ہیں''۔ [1]

داستان اصحاب کہف کی تفصیل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجمالی طور پر واقعہ بیان کرنے کے بعد میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ''ان کی داستان، جیسا کہ ہے، ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں''۔ [2]

ہم اس طرح سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی فضول بات بے بنیاد چیزوں اور غلط باتوں سے پاک ہوگا۔

''وہ چند جواں مرد تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت اور بڑھادی تھی''۔ [3]

قرآن سے اجمالی طور پر اور تاریخ سے تفصیلی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف جس دور اور ماحول میں رہتے تھے اس میں کفرو بت پرستی کا دوردورہ تھا۔ ایک ظالم حکومت کہ جو عام طور پر شرک، کفر، جہالت، غارت گری اور ظلم کی محافظ تھی لوگوں کے سروں پر مسلط تھی۔

لیکن یہ جواں مرد کہ جو ہوش وصداقت کے حامل تھے آخرکار اس دین کی خرابی کو جان گئے۔ انہوں نے اس کی خلاف قیام کا مصمم ارادہ کرلیا اور فیصلہ کیا کہ اگر اس دین کے خاتمے کی طاقت نہ ہوئی تو ہجرت کر جائیں گے۔ اسی لئے گزشتہ بحث کے بعد قرآن کہتا ہے: ''جب انہوں

---

[1] سورہ کہف آیت 10

[2] سورہ کہف آیت 11 تا 12

[3] سورہ کہف آیت 13

نے قیام کیا اور کہا کہ ہمارا رب آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے علاوہ کسی معبود کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے"۔ [1]

"اگر ہم ایسی بات کریں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود سمجھیں تو ہم نے بے ہودہ اور حق سے دور بات کہی"۔ [2]

ان باایمان جواں مردوں نے واقعاً توحید کے اثبات اور "الهه" کی نفی کے لئے واضح دلیل کا سہارا لیا اور وہ یہ کہ ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمان و زمین کا کوئی مالک اور پروردگار بھی وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس کے بعد وہ ایک اور دلیل سے متوسل ہوئے اور وہ یہ کہ "ہماری قوم نے خدا کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں" [3]

تو کیا دلیل و برہان کے بغیر بھی اعتقاد رکھا جا سکتا ہے "وہ ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی واضح دلیل پیش کیوں نہیں کرتے"۔ [4]

کیا تصور، خیال یا اندھی تقلید کی بناء پر ایسا عقیدہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسا کھلم کھلا ظلم اور عظیم انحراف ہے؟

ان توحید پرست جواں مردوں نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کا زنگ اتر جائے اور ان کے دلوں میں توحید کی کونپل پھوٹ پڑے لیکن وہاں تو بتوں اور بت پرستی کا ایسا شور تھا اور ظالم بادشاہ کے ظلم بے داد کا ایسا خوف تھا کہ گویا سانس مخلوق خدا کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی تھی اور نغمہ توحید ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

---

[1] سورہ کہف آیت 13

[2] سورہ کہف آیت 14

[3] سورہ کہف آیت 15

[4] سورہ کہف آیت 15

لہٰذا انھوں نے مجبوراً اپنی نجات کے لئے اور بہتر ماحول کی تلاش کے لئے ہجرت کا عزم کیا۔ لہٰذا باہمی مشورے ہونے لگے کہ کہاں جائیں، کس طرف کو کوچ کریں۔ آپس میں کہنے لگے: ''جب اس بت پرست قوم سے کنارہ کشی اختیار کرلو خدا کو چھوڑ کر جنہیں یہ پوجتے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنا حساب کتاب ان سے جدا کرلو تو غار میں جا پناہ لو۔''

تا کہ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت کا سایہ کردے اور اس مشکل سے نکال کر تمہیں نجات کی راہ پر لگادے۔

''غار'' ایک پناہ گاہ

''کہف'' ایک معنی خیز لفظ ہے، اس سے انسان کی بالکل ابتدائی طرز زندگی کی طرف ذہن چلا جاتا ہے، وہ ماحول کہ جب راتیں تاریک اور سرد تھیں۔ روشنی سے محروم انسان جانکاہ دروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ زندگی جس میں مادی آسائشوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جب نہ نرم بستر تھے نہ خوشحالی۔

اب جب اس طرف توجہ کہ جیسا تاریخ میں منقول ہے اصحاب کہف اس دور میں بادشاہ کے وزیر اور بہت بڑے اہل منصب تھے۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے مذہب کے خلاف قیام کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناز ونعمت سے بھری اس زندگی کو چھوڑنا کس قدر عزم، حوصلہ دلیری اور جاںنثاری کا غماز ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی روح کتنی عظیم تھی۔

یہ تاریک غار، سرد اور خاموش ضرور تھی اور اس میں موذی جانوروں کا خطرہ بھی تھا لیکن یہاں نور وصفا اور توحید و معنویت کی ایک دنیا آباد تھی۔

رحمت الٰہی کے نور کی لکیروں نے اس کی دیواروں پر گویا نقش ونگار کردیا تھا اور لطف الٰہی کے آثار اس میں موجزن تھے۔ اس میں طرح طرح کے مضحکہ خیز بت نہیں تھے اور ظالم

بادشاہ کا ہاتھ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی فضا نے جہل وجرم کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات عطا کر دی تھی اور یہاں انسانی فکر پر کوئی پابندی نہ تھی، فکر و آزادی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھی۔

جی ہاں ان خدا پرست جواں مردوں نے اس دنیا کو ترک کر دیا کہ جو اپنی وسعت کے باوجود ایک تکلیف دہ قید خانہ کی مانند تھی اور اس کو انتخاب کرلیا کہ جو اپنی تنگی و تاریکی کے باوجود وسیع تھی۔

بالکل پاکباز یوسف علیہ السلام کی طرح کہ جنہوں نے عزیز مصر کی خوبصورت بیوی کے شدید اصرار کے باوجود اس کی سرکش ہوس کے سامنے سر نہ جھکایا اور تاریک وخوف ناک قید خانے میں جانا قبول کرلیا۔ اللہ نے ان کی استقامت و پامردی میں اضافہ کر دیا اور آخر کار انہوں نے بارگاہ خداوندی میں یہ حیران کن جملہ کہا: ''پروردگارا یہ قید خانہ اپنی جانکاہ تنگی و تاریکی کے باوجود مجھے اس گناہ سے زیادہ محبوب ہے کہ جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اور اگر تو ان کے وسوسوں کو مجھ سے دفع نہ کرے تو میں ان کے دام میں گرفتار ہو جاؤں گا''۔ [1]

اصحاب کہف کا اہم مقام

قرآن اصحاب کہف کی عجیب وغریب زندگی کی کچھ تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ گویا کوئی شخص ان کے سامنے بیٹھا ہے اور غار میں سوئے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

سورہ کہف میں چھ نشانیاں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

1۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہے اور چونکہ زمین کے شمالی نصف کرہ میں واقع تھی لہذا

---

[1] سورہ کہف آیت 15

سورج کی روشنی مستقیم اس میں نہیں پڑتی تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "اگر تو وقت طلوع سورج کو دیکھتا تو وہ ان کی دائیں جانب جھک کے گزرتا ہے اور غروب کے وقت بائیں جانب"۔[1] غار کا دہانہ شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں اچھی ہوائیں آتی تھیں کیونکہ یہ ہوائیں عموماً شمال کی جانب سے چلتی ہیں۔ لہٰذا تازہ ہوا آسانی سے میں داخل ہو جاتی اور ایک تازگی قائم رکھتی۔

2۔ "وہ کی ایک وسیع جگہ میں تھے"۔[2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کے دہانے پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ تو عموماً تنگ ہوتا ہے۔ وہ کے وسطی حصے میں تھے تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہیں اور سورج کی براہ راست چمک سے بھی۔

3۔ "ان کی نیند عام نیند جیسی نہ تھی"۔ "اگر تو انہیں دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے"۔[3]

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ان کی آنکھیں بالکل ایک بیدار شخص کی طرح پوری طرح کھلی تھیں۔ یہ استثنائی حالت شاید اس بناء پر تھی کہ موذی جانور قریب نہ آئیں کیونکہ وہ بیدار آدمی سے ڈرتے ہیں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول رعب انگیز رہے تاکہ کوئی انسان ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کرے اور یہ صورت حال ان کے لئے ایک پہرہ کا کام دے۔

4۔ "اس بناء پر کہ سالہا سال سوئے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم بوسیدہ نہ ہو جائیں"۔ ہم انہیں دائیں بائیں کروٹیں بدلواتے رہتے تھے۔[4]

تاکہ ان کے بدن کا خون ایک ہی جگہ نہ ٹھہر جائے اور طویل عرصہ تک ایک طرف

[1] سورہ یوسف آیت 33

[2] سورہ کہف آیت 17

[3] سورہ کہف آیت 17

[4] سورہ کہف آیت 18

ٹھہرنے کی وجہ سے ان کے اعصاب خراب نہ ہو جائیں۔

5۔ ''اس دوران میں ان کا کتا کہ جوان کے ہمراہ تھا کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلائے ہوئے تھا اور پہرہ دے رہا تھا''۔ [1]

اس سے پہلے ابھی تک قرآنی آیات میں اصحاب کہف کے کتے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن واقعات کے دوران بعض اوقات ایسی باتیں کرجاتا ہے کہ جن سے دوسرے مسائل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں اصحاب کہف کے کتے کا ذکر آیا ہے، یہاں سے ظاہر ہوا کہ ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا جو ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔

یہ کہ یہ کتا ان کے ساتھ کہاں سے شامل ہوا تھا، کیا ان کا شکاری کتا تھا یا اس چرواہے کا کتا تھا کہ جس سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی تھی اور جب چرواہے نے انہیں پہچان لیا تھا تو اس نے اپنے جانور آبادی کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور خود ان پاکباز لوگوں کے ساتھ ہو لیا تھا کیونکہ وہ ایک حق تلاش اور دیدار الٰہی کا طالب انسان تھا۔ اس وقت کتا ان سے جدا نہ ہوا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام عاشقان حق اس تک رسائی کے لئے اس کے راستے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور کوئے یار کے دروازے کسی کے لئے بند نہیں ہیں۔ ظالم بادشاہ کے تائب ہونے والے وزیروں سے لے کر چرواہے تک بلکہ اس کے کتے تک کے لئے بارگاہ الٰہی کے دروازے کھلے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے؟ قرآن کہتا ہے: ''زمین و آسمان کے تمام ذرے، سارے درخت اور سب چلنے پھرنے والے ذکر الٰہی میں مگن ہیں، سب کے سر میں اس کے عشق کا سودا سمایا ہے اور

---

[1] سورہ کہف آیت 18

سب کے دلوں میں اس کی محبت جلوہ گر ہے"۔ [1]

6۔ غار میں اصحاب کہف کا منظر ایسا رعب دار تھا کہ اگر تو انہیں جھانک کے دیکھ لیتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا وجود سرتا پا خوفزدہ ہو جاتا"۔ [2]

"یہ ایک ہی موقع نہیں کہ خدا تعالیٰ نے رعب اور خوف کو اپنے باایمان بندوں کے لئے ڈھال بنایا تھا۔ بلکہ دوسری جگہ بھی اس طرح کا خطاب ہوا ہے۔"ہم جلد ہی کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیں گے۔"[3]

دعائے ندبہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں منقول ہے:"خداوندا پھر تو نے اپنے پیغمبر کی مدد اس طرح کی کہ اس کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا"۔

لیکن یہ رعب کہ جو اصحاب کہف کو دیکھنے والے کو سرتا پا لرزا دیتا، ان کی جسمانی حالت کے باعث تھا یا یہ کہ پر اسرار روحانی طاقت تھی کہ جو اس سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آیات قرآنی میں کوئی وضاحت نہیں ہے"۔

ایک طویل نیند کے بعد بیداری

اصحاب کہف کی نیند اتنی لمبی ہوگئی کہ وہ تین سو نو سال تک سوئے رہے اور ان کی نیند موت سے بالکل ملتی جلتی تھی اور ان کی بیداری بھی قیامت کی مانند تھی۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے:"اور ہم نے انہیں اسی طرح اٹھا کھڑا کیا"۔ [4]

یعنی اسی طرح کہ جیسے ہم اس پر قادر تھے کہ انہیں لمبی مدت تک سلائے رکھتے اور انہیں

---

[1] سورہ کہف آیت 18

[2] بنی اسرائیل آیت 44

[3] سورہ کہف آیت 18

[4] سورہ آل عمران آیت 151

پھر سے بیدار کرنے پر بھی قادر تھے۔

ہم نے انہیں نیند سے بیدار کردیا، تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں سے ایک نے پوچھا۔ تمہارا خیال ہے کتنی مدت سوئے ہو؟ انہوں نے کہا: ''ایک دن یا دن کا کچھ حصہ''۔ [1]

اس میں تردد شاید انہیں اس لے ہوا کہ جیسے مفسرین نے کہا ہے کہ وہ جب غار میں آئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور آکر وہ سو گئے تھے اور جب اٹھے تو دن کا آخری حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے سوچا کہ شاید ایک دن سو گئے اور جب انہوں نے سورج کی طرف دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ شاید دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

لیکن آخر کار چونکہ انہیں صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی دیر سوئے ہیں لہٰذا کہنے لگے: تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر سوئے ہو۔ [2]

بعض کا کہنا ہے کہ یہ بات ان میں سے بڑے نے کہی جس کا نام ''تملیخا'' تھا اور یہاں پر ''قالوا'' [3] کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ جو جمع کا صیغہ ہے اس کا استعمال ایک معمول جیسی بات ہے۔

یہ بات انہوں نے شاید اس لئے کہی کہ ان کے چہرے سے، ناخنوں سے، بالوں سے اور لباس سے بالکل شک نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر نیند میں رہے ہیں۔

بہر حال انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا کیونکہ ان کے بدن میں جو غذا تھی وہ تو تمام ہو چکی تھی، لہٰذا پہلے انہوں نے یہی تجویز کی کہ ''تمہارے پاس چاندی کا جو سکہ ہے اپنے میں سے ایک کو دو تاکہ وہ جائے اور دیکھے کہ کس کے پاس اچھی پاکیزہ غذا ہے اور جتنی تمہیں

---

[1] سورہ کہف آیت 19

[2] سورہ کہف آیت 19

[3] سورہ کہف آیت 19

چاہئے تمہارے لئے لے آئے"۔ [1]

"لیکن بہت احتیاط سے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے"۔ [2]

"کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے تمہیں آلیا تو سنگسار کر دیں گے یا پھر تمہیں اپنے دین (بت پرستی) کی طرف موڑ لے جائیں گے،" "اور اگر ایسا ہو گیا تو تم نجات اور فلاح کا منہ نہ دیکھ پاؤ گے"۔ [3]

پاکیزہ ترین غذا

یہ بات بہت جاذب نظر ہے کہ اس داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ اصحاب کہف جب بیدار ہوئے تو ظاہر ہے انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس طویل مدت کے دوران ان کے جسم میں جو غذا تھی، وہ ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے جسے کھانا لانے کے لئے بھیجا اسے نصیحت کی کہ ہر غذا نہ خرید لائے بلکہ دیکھ بھال کر کھانا بیچنے والوں کے پاس سے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اسی کو لے کر آئے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہٰذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ خریدنا۔

لیکن ظاہراً اس جملے کا وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی

---

[1] سورہ کہف آیت 19

[2] سورہ کہف آیت 19

[3] سورہ کہف آیت 20

شامل ہے۔

بہر حال جلد ہی لوگوں میں ان عظیم جواں مردوں کی ہجرت کی داستان پھیل گئی۔ ظالم بادشاہ سیخ پا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ہجرت یا بھاگ نکلنا لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سبب بن جائے، اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ دور یا نزدیک کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دین توحید کی تبلیغ نہ کرنے لگیں اور شرک و بت پرستی کے خلاف جدوجہد شروع کر دیں۔ لہٰذا اس نے خاص افراد کو مامور کیا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جائے اور ان کا کچھ اتہ پتہ معلوم ہو تو گرفتار کے لئے تعاقب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔

لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کچھ نہ پایا اور یہ امر خود علاقے کے لوگوں کے لئے ایک معمہ اور ان کے دل و دماغ کے لئے ایک خاص نقطہ بن گیا۔ نیز یہ امر کہ حکومت کے نہایت اہم چند ارکین نے ہر چیز کو ٹھوکر ماردی اور طرح طرح کے خطرات مول لے لئے شاید بعض لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سرچشمہ بن گیا۔

بہر حال ان افراد کی یہ حیران کن داستان ان کی تاریخ میں ثبت ہو گئی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے لگی۔ اور اسی طرح اس مسئلے کو صدیاں گزر گئیں۔

سامان خریدنے والے پر کیا گزری

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پر کیا گزری جو غذا لینے کے لئے آیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا تو اس کا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا، شہر کی عمارتوں کی شکل و صورت تمام تبدیل ہو چکی تھی، سب چہرے ناشناس تھے، لباس نئے انداز کے تھے اور جہاں پہلے محل تھے وہاں ویرانے تھے۔

شاید تھوڑی دیر کے لئے اس نے سوچا ہو کہ ابھی میں نیند میں ہوں اور یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں سب خواب ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ وہ سب چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا

تھا۔اس نے سوچا کہ یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

اب وہ سوچنے لگا کہ وہ میں ایک یا آدھا دن سوئے ہیں تو پھر یہ اتنی تبدیلیاں اتنی مدت میں کیسے ممکن ہیں؟

دوسری طرف اس کا چہرہ مہرہ اور حالت لوگوں کے لئے بھی عجیب اور غیر مانوس تھی۔ اس کا لباس، اس کی گفتار اور اس کا چہرہ سب نیا معلوم ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اسکی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔

اس وقت لوگوں کا تعجب انتہاء کو پہنچ گیا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تا کہ اس کھانے کی قیمت ادا کرے جو اس نے خریدا تھا، دکاندار کی نگاہ سکے پر پڑی وہ تین سو سال سے زیادہ پرانے دور کا تھا اور شاید اس زمانے کے ظالم بادشاہ دقیانوس کا نام بھی اس پر کندہ تھا۔ جب اس نے وضاحت چاہی تو خریدار نے جواب میں کہا: میرے ہاتھ میں تو یہ سکہ ابھی تازہ ہی آیا ہے۔

قرائن اور احوال سے لوگوں کو آہستہ آہستہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص تو انہی افراد میں سے ہے جن کا ذکر ہم نے تین سو سال پہلے کی تاریخ میں پڑھا ہے اور بہت سی محفلوں میں ہم نے جن کی پر اسرار داستان سنی ہے۔

خود اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی گہری اور طولانی نیند میں مستغرق رہے ہیں۔اس بات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں آن کی آن میں پھیل گئی۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک نیک اور خدا پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن معاد جسمانی اور موت کے بعد مردوں کے جی اٹھنے کے مسئلہ پر یقین کرنا وہاں کے لوگوں کے لئے مشکل تھا۔ان میں سے ایک گروہ کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر جی اٹھے گا لیکن اصحاب کہف کی نیند کا واقعہ معاد جسمانی کے طرفداروں کے لئے ایک دندان شکن دلیل بن گیا۔

اسی لئے قرآن کہتا ہے: ''جیسے ہم نے انہیں سلا دیا تھا اسی طرح انہیں اس گہری اور

طویل نیند سے بیدار کیا اور لوگوں کو ان کے حال کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ جان لیں کہ قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے۔ اور دنیا کے خاتمے اور قیام قیامت میں کوئی شک نہیں"۔ [1]

کیونکہ صدیوں پر محیط یہ لمبی نیند موت سے غیر مشابہ نہیں ہے اور ان کا بیدار ہونا قبروں سے اٹھنے کی مانند ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سونا اور جاگنا کئی جہتوں سے مرنے اور پھر جی اٹھنے سے عجیب تر ہے کیونکہ وہ صدیوں سوئے رہے لیکن ان کا بدن بوسیدہ نہ ہوا جبکہ انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا، تو پھر وہ اتنی لمبی مدت زندہ کس طرح رہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہر چیز اور ہر کام پر قادر ہے۔ ایسے منظر کی طرف نظر کی جائے تو موت کے بعد زندگی کا مسئلہ کوئی عجیب معلوم نہیں ہوتا بلکہ یقینی طور پر ممکن دکھائی دیتا ہے۔

اصحاب کہف کے واقعہ کا اختتام

جو شخص غذا لینے شہر میں آیا تھا اس نے یہ صورت دیکھی تو جلدی سے غار کی طرف پلٹا اور اپنے دوستوں کو سارا حال سنایا، وہ سب کے سب گہرے تعجب میں ڈوب گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کے تمام بچے، بھائی اور دوست کوئی بھی باقی نہیں رہا اور ان کے احباب و انصار میں سے کوئی نہیں رہا۔ ایسے میں ان کو یہ زندگی بہت سخت اور ناگوار لگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس جہان سے ہماری آنکھیں بند ہو جائیں اور ہم جوار رحمت حق میں منتقل ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا، اس دنیا سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جسم غار میں پڑے تھے کہ لوگ ان کی تلاش کو نکلے۔ [2]

اس مقام پر معاد جسمانی کے طرفداروں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

---

[1] سورہ کہف آیت 21

[2] سورہ کہف آیت 21

مخالفین کی کوشش تھی کہ لوگ اصحاب کہف کے سونے اور جاگنے کے مسئلہ کو جلد بھول جائیں" لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تا کہ وہ ہمیشہ کے لئے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں"۔ [1]

وہ لوگوں کو خاموش ہونے کے لئے کہتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہ کرو، ان کی داستان اسرار آمیز ہے" ان کا پروردگار ان کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے"۔ [2]

لہٰذا ان کا قصہ ان تک رہنے دو اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جبکہ حقیقی مومن کہ جنہیں اس واقعے کی خبر ہوئی اور جو اسے قیامت کے حقیقی مفہوم کے اثبات کے لئے ایک زندہ دلیل سمجھتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ یہ واقعہ ہرگز فراموش نہ ہونے پائے۔ لہٰذا انہوں نے کہا: "ہم ان کے مدفن کے پاس مسجد بناتے ہیں"۔ [3]

تا کہ لوگ انہیں اپنے دلوں سے ہرگز فراموش نہ کریں علاوہ ازیں ان کی ارواح پاک سے لوگ استمداد کریں۔

قرآن میں ان چند اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ جو اصحاب کہف کے بارے میں لوگوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک ان کی تعداد کے بارے میں ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا"۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔

یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں اور اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

ارشاد ہوتا کہہ دو: میرا رب ان کی تعداد بہتر جانتا ہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ ان کی

---

[1] سورہ کہف آیت 21

[2] سورہ کہف آیت 21

[3] سورہ کہف آیت 21

تعداد جانتے ہیں۔ [1]

قرآن نے ان جملوں میں اگرچہ صراحت سے ان کی تعداد بیان نہیں کی لیکن آیت میں موجود بعض اشاروں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ تیسرا قول صحیح اور مطابق حقیقت ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے قول کے بعد (اندھیرے میں تیر مارنا) آیا ہے کہ جو ان اقوال کے لئے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن تیسرے قول کے بارے میں نہ صرف ایسی کوئی تعبیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: کہہ دے: "میرا رب ان کی تعداد سے بہتر طور پر آگاہ ہے"۔ اور یہ بھی فرمایا گیا ہے "ان کی تعداد کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں"۔ یہ جملے بھی اس تیسرے قول کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

بہر حال آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: "استدلالی اور منطقی گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں بحث نہ کر"۔ [2]

بہر حال اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وحی خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ تو ان کے ساتھ بات کر کیونکہ اس سلسلے میں محکم ترین دلیل یہی ہے۔ "لہذا جو لوگ بغیر دلیل کے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں بات کرتے ہیں ان سے اس بارے میں سوال نہ کر"۔ [3]

اصحاب کہف کی نیند

قرآن میں موجود قرائن سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کی نیند بہت لمبی تھی۔ یہ بات ہر شخص کی حس جستجو کو ابھارتی ہے۔ ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ وہ کتنے برس سوئے رہے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 22

[2] سورہ کہف آیت 22

[3] سورہ کہف آیت 22

قرآن اس داستان کے متعلق تردد کو ختم کرتے ہوئے آخر میں اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''وہ اپنی غار میں تین سو سے نو برس زیادہ سوتے رہے''۔ [1]

اس لحاظ سے وہ کل تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تین سو نو سال کہنے کی بجائے یہ جو کہا 300 سال، نو سال اس سے زیادہ، یہ شمسی اور قمری سالوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے کیونکہ شمسی حساب سے وہ تین سو سال رہے جو قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے اور یہ تعبیر کا ایک لطیف پہلو ہے کہ ایک جزوی تعبیر کے ذریعے عبارت میں ایک اور وضاحت طلب حقیقت بیان کر دی جائے۔

اس کے بعد اس بارے میں لوگوں کے اختلاف آراء کو ختم کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے: ''کہہ دیجئے: خدا ان کے قیام کی مدت کو بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کے غیب کے احوال اس کے سامنے ہیں''۔ [2] اور وہ ہر کسی کی نسبت انہیں زیادہ جانتا ہے۔

اور جو کل کائنات ہستی سے باخبر ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ اصحاب کہف کے غار میں قیام کی مدت سے آگاہ نہ ہو۔

غار کہاں ہے؟

یہ کہ اصحاب کہف کس علاقے میں رہتے تھے اور یہ غار کہاں تھی؟ اس سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے، البتہ اس واقعے کے مقام کو صحیح طور پر جاننے کا اصل داستان، اس کے تربیتی پہلوؤں اور تاریخی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، یہ کوئی واحد واقعہ نہیں کہ جس کی اصل داستان تو ہمیں معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں، لیکن مسلم

---

[1] سورہ کہف آیت 25

[2] سورہ کہف آیت 26

ہے کہ اس واقعے کا مقام جاننے سے اس کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں جو احتمالات ذکر کیے گئے اور جو اقوال نظر سے گزرے ہیں ان میں سے دو زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ واقعہ شہر "افسوس" میں ہوا اور یہ اس شہر کے قریب واقع تھی۔ ترکی میں اب بھی اس شہر کے کھنڈرات "ازمیر" کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہاں قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام "ایاصولوک" ہے اس کے پاس ایک پہاڑ ہے "ینایرداغ"۔ اب بھی اس میں ایک نظر آتی ہے جو افسوس شہر سے کوئی زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے، یہ ایک وسیع غار ہے، کہتے ہیں اس میں سینکڑوں قبروں کے آثار نظر آتے ہیں، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب کہف کی یہی غار ہے۔

جیسا کہ جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ اس کا دہانہ شمال مشرق کی جانب ہے۔ اس وجہ سے بعض بزرگ مفسرین نے اس بارے میں شک کیا ہے کہ یہ وہی غار ہے، حالانکہ اس کی یہی کیفیت اس کے اصلی ہونے کی موید ہے کیونکہ طلوع کے وقت سورج کا دائیں طرف اور غروب کے وقت بائیں طرف ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا کچھ شمال مشرق کی جانب ہو۔

اس وقت وہاں کسی مسجد یا عبادت خانہ کا نہ ہونا بھی اسکے وہی غار ہونے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ تقریباً ستر ہ صدیاں گزرنے کے بعد ممکن ہے اس کے آثار مٹ گئے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ غار ہے کہ جو "اردن" کے دار الحکومت "عمان" میں واقع ہے۔ یہ "رجیب" نامی ایک بستی کے قریب ہے اس کے اوپر گرجے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض قرائن کے مطابق ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔ جب اس علاقے پر مسلمانوں کا غلبہ ہوا تو اسے مسجد میں تبدیل کر لیا گیا تھا اور وہاں محراب بنائی گئی تھی اور آذان کی جگہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

اصحاب کہف کا واقعہ دیگر تواریخ میں

یہ بات مسلّم ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ کسی گزشتہ آسمانی کتاب میں نہیں تھا (چاہے وہ اصلی ہو یا موجودہ تحریف شدہ) اور نہ اسے کتابوں میں ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ظہور مسیح علیہ السلام کے صدیوں بعد کا ہے۔

یہ واقعہ "دکیوس" کے دور کا ہے، جسے عرب "دقیانوس" کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت ظلم ہوتا تھا۔

یورپی مورخین کے مطابق یہ واقعہ 49 تا 152 عیسوی کے درمیان کا ہے۔ ان مورخین کے خیال میں اصحاب کہف کی نیند کی مدت 157 سال ہے۔ یورپی مورخین انہیں "افسوس کے 7 سونے والے" کہتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں انہیں "اصحاب کہف" کہا جاتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ "افسوس" شہر کہاں ہے؟ سب سے پہلے کن علماء نے ان سونے والوں کے بارے میں کتاب لکھی اور وہ کس صدی کے تھے؟

"افسوس" یا "افسس" "ایشیائے کوچک کا ایک شہر تھا (موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ تھا) یہ "دریائے کاسٹر" کے پاس "ازمیر" شہر کے تقریباً چالیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ "الونی" بادشاہ کا پایہ تخت شمار ہوتا تھا۔

افسوس اپنے مشہور بت خانے اور "طامیس" کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے تھا۔

کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کی داستان پہلی مرتبہ پانچویں صدی عیسوی میں ایک عیسائی عالم نے لکھی۔ اس کا نام "اک" تھا۔ وہ شام کے ایک گرجے کا متولی تھا۔ اس نے سریانی زبان کے ایک رسالے میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام "گوگویس" تھا ترجمے کا نام اس نے "جلال شہداء" کا ہم معنی رکھا تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے ایک دو صدیاں پہلے یہ واقعہ عیسائیوں میں مشہور تھا اور گرجوں کی مجالس میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

البتہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلامی مصادر میں اس کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ مذکورہ عیسائیوں کے بیانات سے کچھ مختلف ہیں۔ جیسے ان کے سونے کی مدت کیونکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ مدت 309 سال بیان کی ہے۔

"یاقوت حموی" نے اپنی کتاب "معجم البلدان ج 2 ص 806 پر" خرداد بہ نے اپنی کتاب "المسالک والممالک" ص 106 تا 110 میں اور "ابوریحان بیرونی" نے اپنی کتاب "الاثار الباقیہ" ص 290 پر نقل کیا ہے کہ قدیم سیاحوں کی ایک جماعت نے شہر "آبس" میں ایک غار دیکھی ہے جس میں چند انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے یہ بات اسی داستان سے مربوط ہو۔

سورہ کہف میں قرآن کے لب ولہجہ سے اور اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول شان ہائے نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان یہودی علماء میں بھی ایک تاریخی واقعے کے طور پر مشہور تھی، اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ طولانی نیند کا یہ واقعہ مختلف قوموں کی تاریخی ماخذ میں موجود رہا ہے۔ [1]

---

[1] اصحاب کہف کا واقعہ کیا سائنس کے لحاظ سے قابل قبول ہے؟ رجوع کریں تفسیر نمونہ جلد 7 ص 86۔

ذوالقرنین کی عجیب کہانی

چند قریشیوں نے رسول اللہ ﷺ کو آزمانا چاہا، اس مقصد کے لئے انہوں نے مدینے کے یہودیوں کے مشورے سے تین مسئلے پیش کیے۔ ایک اصحاب کہف کے بارے میں تھا۔ دوسرا مسئلہ روح کا تھا اور تیسرا ذوالقرنین کے بارے میں۔ ذوالقرنین کی داستان ایسی ہے کہ جس پر طویل عرصے سے فلاسفہ اور محققین غور و خوض کرتے چلے آئے ہیں اور ذوالقرنین کی معرفت کے لئے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے ہم ذوالقرنین سے مربوط جو قرآن میں بیان ہوا ہے وہ بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی تحقیق سے قطع نظر ذوالقرنین کی ذات خود سے ایک بہت ہی تربیتی درس کی حامل ہے اور اس کے بہت سے قابل غور پہلو ہیں۔ اس کے بعد ذوالقرنین کی شخصیت کو جاننے کے لئے ہم آیات، روایات اور مورخین کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔

دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور پہلا موضوع وہی ہے جو قرآن کی نظر میں اہم ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں: کہہ دو عنقریب اس کی سرگزشت کا کچھ حصہ تم سے بیان کروں گا''۔ [1]

بہر حال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ پہلے بھی ذوالقرنین کے بارے میں بات کیا

---

[1] سورہ کہف آیت 83

کرتے تھے۔ البتہ اس سلسلے میں ان میں اختلاف اور ابہام پایا جاتا تھا۔ اسی لئے انہوں نے پیغمبر اکرم صلى الله عليه وسلم سے ضروری وضاحتیں چاہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ''ہم نے اسے زمین پر حکمت عطا کی (قدرت، ثبات قوت اور حکومت بخشی)۔ اور ہر طرح کے وسائل اور اسباب اس کے اختیار میں دیئے۔ اس نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچ گیا۔ وہاں اس نے محسوس کیا کہ سورج تاریک اور کیچڑ آلود چشمے یا دریا میں ڈوب جاتا ہے''۔ [1]

وہاں اس نے ایک قوم کو دیکھا (کہ جس میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ تھے) ''تو ہم نے ذوالقرنین سے کہا: کہ تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزا''۔ [2]

ذوالقرنین نے کہا: ''وہ لوگ کہ جنہوں نے ظلم کیے ہیں، انہیں تو ہم سزا دیں گے۔ اور وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور اللہ انہیں شدید عذاب کرے گا''۔ [3]

یہ ظالم و ستمگر دنیا کا عذاب بھی چکھیں گے اور آخرت کا بھی۔

''اور رہا وہ شخص کہ جو باایمان ہے اور عمل صالح کرتا ہے اسے اچھی جزاء ملے گی۔ اور اسے ہم آسان کام سونپیں گے''۔ [4]

اس سے بات بھی محبت سے کریں گے اور اس کے کندھے پر سخت ذمہ داریاں بھی نہیں رکھیں گے اور اس سے زیادہ خراج بھی وصول نہیں کریں گے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 84

[2] سورہ کہف آیت 86

بعض مفسرین نے لفظ ''قلنا'' (ہم نے ذوالقرنین سے کہا) سے ان کی نبوت پر دلیل قرار دیا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے سے قلبی الہام مراد ہو کہ جو غیر انبیاء میں بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تفسیر زیادہ تر نبوت کو ظاہر کرتی ہے۔

[3] سورہ کہف آیت 87

[4] سورہ کہف آیت 88

ذوالقرنین کے اس بیان سے گویا یہ مراد تھی کہ توحید پر ایمان اور ظلم و شرک اور برائی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں میری دعوت پر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہوگا جو اس الٰہی تعمیری پروگرام کو مطمئن ہو کر تسلیم کر لیں گے انہیں اچھی جزا ملے گی اور وہ آرام و سکون سے زندگی گزاریں گے جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس دعوت سے دشمنی پر اتر آئیں گے اور شرک و ظلم اور برائی کے راستے پر ہی قائم رہیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔

ذوالقرنین نے اپنا مغرب کا سفر تمام کیا اور مشرق کی طرف جانے کا عزم کیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "جو وسائل اس کے اختیار میں تھے اس نے ان سے پھر استفادہ کیا۔ اور اپنا سفر اسی طرح جاری رکھا یہاں تک کہ سورج کے مرکز طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں کے علاوہ تن ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں ہے"۔ [1]

یہ لوگ بہت ہی پست درجے کی زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ برہنہ رہتے تھے یا بہت ہی کم مقدار میں لباس پہنتے تھے کہ جس سے ان کا بدن سورج سے نہیں چھپتا تھا۔ [2]

جی ہاں! ذوالقرنین کا معاملہ ایسا ہی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے اختیار میں (اپنے اہداف کے حصول کے لئے) کیا وسائل تھے۔ [3]

---

[1] سورہ کہف آیت 89-90

[2] بعض مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید قرار نہیں دیا کہ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر بھی نہ تھے کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے۔ اس سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ ایسے بیابان میں رہتے تھے کہ جس میں کوئی پہاڑ، درخت، پناہ گاہ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے گویا اس بیابان میں ان کے لئے کوئی سایہ نہ تھا۔

[3] سورہ کہف آیت 91

بعض مفسرین نے یہاں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ ذوالقرنین کے کاموں اور پروگراموں میں اللہ کی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔

ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟

قرآن میں حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کے ایک اور سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''اس کے بعد اس نے حاصل وسائل سے پھر استفادہ کیا''۔ [1]

''اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک اور گروہ کو دیکھا۔ یہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے''۔ [2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہستانی علاقے میں جا پہنچے۔ مشرق اور مغرب کے علاقے میں وہ جیسے لوگوں سے ملے تھے یہاں ان سے مختلف لوگ تھے، یہ لوگ انسانی تمدن کے اعتبار سے بہت ہی پسماندہ تھے کیونکہ انسانی تمدن کیسب سے واضح مظہر انسان کی گفتگو ہے۔ [3]

اس وقت یہ لوگ یاجوج ماجوج نامی خونخوار اور سخت دشمن سے بہت تنگ اور مصیبت میں تھے۔ ذوالقرنین کہ جو عظیم قدرتی وسائل کے حامل تھے، ان کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی تسلی ہوئی۔ انہوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور'' کہنے لگے: اے ذوالقرنینیا جوج ماجوج اس سرزمین پر فساد کرتے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ خرچ آپ کو ہم دے دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں''۔ [4]

---

[1] سورہ کہف آیت 96

[2] سورہ کہف آیت 97

[3] سورہ کہف آیت 97

[4] سورہ کہف آیت 98

وہ ذوالقرنین کی زبان تو نہیں سمجھتے تھے اس لئے ہوسکتا ہے یہ بات انہوں نے اشارے سے کی ہو یا پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اظہار مدعا کیا ہو۔[1]

بہر حال اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت اچھی تھی لیکن سوچ بچار، منصوبہ بندی، اور صنعت کے لحاظ سے وہ کمزور تھے۔لہٰذا وہ اس بات پر تیار تھے کہ اس اہم دیوار کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیں، اس شرط کے ساتھ ذوالقرنین نے اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری قبول کرلیں۔

اس پر ذوالقرنین نے انہیں جواب دیا: "یہ تم نے کیا کہا؟ اللہ نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہتر ہے کہ جو تم مجھے دینا چاہتے ہو"۔[2]

اور میں تمہاری مالی امداد کا محتاج نہیں ہوں۔

"تم قوت وطاقت کے ذریعے میری مدد کرو تا کہ میں تمہارے اور ان دو مفسد قوموں کے درمیان مضبوط اور مستحکم دیوار بنادوں"۔[3]

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا: "لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ"۔[4]

جب لوہے کی سلیں آگئیں تو انہیں ایک دوسرے پر چننے کا حکم دیا "یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ گئی"۔[5]

تیسرا حکم ذوالقرنین نے یہ دیا کہ آگ لگانے کا مواد (ایندھن وغیرہ) لے آؤ اور اسے اس دیوار کے دونوں طرف رکھ دو اور اپنے پاس موجود وسائل سے آگ بھڑکاؤ اور اس میں دھونکو

---

[1] سورہ کہف آیت 95

[2] سورہ کہف آیت 96

[3] سورہ کہف آیت 96

[4] سورہ کہف آیت 96

[5] سورہ کہف آیت 96

یہاں تک کہ لوہے کی سلیں انگاروں کی طرح سرخ ہو کر آخر پگھل جائیں۔ [1]

درحقیقت وہ اس طرح لوہے کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دینا چاہتے تھے۔

یہی کام آج کل خاص مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے، لوہے کی سلوں کو اتنی حرارت دی گئی کہ وہ نرم ہو کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔

پھر ذوالقرنین نے آخری حکم دیا: ''کہا کہ پگھلا ہوا تانبا لے آؤ تاکہ اسے اس دیوار کے اوپر ڈال دوں''۔ [2]

اس طرح اس لوہے کی دیوار پر تانبے کا لیپ کر کے اسے ہوا کے اثر سے اور خراب ہونے سے محفوظ کر دیا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ سائنس کے مطابق اگر تانبے کی کچھ مقدار لوہے میں ملا دی جائے تو اس کی مضبوطی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھے اس لئے انہوں نے یہ کام کیا۔ آخرکار یہ دیوار اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب وہ مفسد لوگ نہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے۔ [3]

یہاں پر ذوالقرنین نے بہت اہم کام انجام دیا تھا۔ مستکبرین کی روش تو یہ ہے کہ ایسا کام کر کے وہ بہت فخر و ناز کرتے ہیں یا احسان جتلاتے ہیں لیکن ذوالقرنین چونکہ مرد خدا تھے۔

''لہٰذا انتہائی ادب کے ساتھ کہنے لگے: یہ میرے رب کی رحمت ہے''۔ [4]

اگر میرے پاس ایسا اہم کام کرنے کے لئے علم و آگاہی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر مجھ میں کوئی طاقت ہے اور میں بات کر سکتا ہوں تو وہ بھی اس کی طرف سے ہے اور اگر یہ

---

[1] سورہ کہف آیت 92

[2] سورہ کہف آیت 93

[3] بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ مراد نہیں کہ وہ مشہور زبانوں میں سے کسی کو جانتے نہیں تھے بلکہ وہ بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے یعنی فکری لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھے۔

[4] سورہ کہف آیت 94

چیزیں اور ان کا ڈھالنا میرے اختیار میں ہے تو یہ بھی پروردگار کی وسیع رحمت کی برکت ہے میرے پاس کچھ بھی میری اپنی طرف سے نہیں ہے کہ جس پر میں فخر وناز کروں اور میں نے کوئی خاص کام بھی نہیں کیا کہ اللہ کے بندوں پر احسان جتاتا پھروں۔ اس کے بعد مزید کہنے لگے: "یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی دائمی دیوار ہے" جب میرے پروردگار کا حکم آگیا تو یہ درہم برہم ہوجائے گی اور زمین بالکل ہموار ہوجائے گی، اور میرے رب کا وعدہ حق ہے"۔ [1]

یہ کہہ کر ذوالقرنین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اختتام دنیا اور قیامت کے موقع پر یہ سب کچھ درہم برہم ہوجائے گا۔

ذوالقرنین کون تھے؟

جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں جو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے یہ تین زیادہ اہم ہیں۔ [2]

جدید ترین نظریہ یہ ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کسی دور میں ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی

---

[1] یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان مترجمین کے ذریعے بات چیت ہوئی ہو یا پھر خدائی الہام کے ذریعے حضرت ذوالقرنین نے ان کی بات سمجھی ہو جیسے حضرت سلیمان بعض پرندوں سے بات کرلیا کرتے تھے۔

[2] پہلا: بعض کا خیال ہے کہ "اسکندر مقدونی" ہی ذوالقرنین ہے۔

کتاب لکھی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ذوالقرنین، "کورش کبیر" "بادشاہ کا فشتی" ہے۔ [1]

لہٰذا وہ اسے اسکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا۔ اس نے اسکندریہ شہر بنایا۔ پھر شام اور بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا۔ وہاں سے ارمنستان گیا۔ عراق و ایران کو فتح کیا۔ پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا وہاں سے خراسان پلٹ آیا۔ اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ پھر وہ عراق آ گیا۔ اس کے بعد وہ شہر "زور" میں بیمار پڑا اور مر گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا جسد خاکی سکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا۔

دوسرا: مورخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا۔

اصمعی نے اپنی تاریخ "عرب قبل از اسلام" میں، ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ "سیرۃ" میں اور ابوریحان بیرونی نے "الآثار الباقیہ" میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔

یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم "حمیری" کے شعراء اور زمانہ جاہلیت کے بعض شعراء کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ذوالقرنین کے اپنے میں سے ہونے پر فخر کیا ہے۔

ذوالقرنین کو یہ نام کیوں دیا گیا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ "ذوالقرنین" کا معنی ہے۔ "دو سینگوں والا" سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق و مغرب تک پہنچے کہ جسے عرب "قرنی الشمس" (سورج کے دو سینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

---

[1] فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کا نام "ذوالقرنین یا کورش کبیر" رکھا گیا ہے۔
اس سلسلے میں مزید آگاہی کیلئے رجوع کریں تفسیر نمونہ جلد ۷ صفحہ 197

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لئے ہوا کہ انہوں نے دو قرن زندگی گزاری یا حکومت کی۔اور پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے،اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا ابھار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین مشہور ہو گئے۔آخر کار بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان کا خاص تاج دو شاخوں والا تھا۔

جناب ذوالقرنین کی ممتاز صفات

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے۔اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دیئے تھے،انہوں نے تین اہم لشکر کشیاں کیں۔پہلے مغرب کی طرف،پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف کہ جہاں ایک کوہستانی درہ موجود تھا،ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔وہ ایک مرد مومن،موحد اور مہربان شخص تھے۔وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔اسی بناء پر اللہ کا لطف خاص ان کے شامل حال تھا۔وہ نیکوں کے دوست اور ظالموں کے دشمن تھے۔انہیں دنیا کے مال و دولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روز جزاء پر بھی۔انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی ہے،یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کے بجائے لوہے اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالحے بھی اس میں ستعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)۔اس دیوار بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم دیدہ لوگوں کی یاجوج وماجوج کے ظلم وستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزول قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا۔لہذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا،جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں:'' رسول اللہ ﷺ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام

سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں ہے کہ: ''وہ نبی نہ تھے بلکہ اللہ کے ایک صالح بندے تھے''۔

دیوار ذوالقرنین کہاں ہے؟

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے مشہور دیوار چین پر منطبق کریں کہ جو اس وقت موجود ہے اور کئی سو کلومیٹر لمبی ہے لیکن واضح ہے کہ دیوار چین لوہے اور تانبے سے نہیں بنی ہے اور نہ وہ کسی چھوٹے کوہستانی درے میں ہے، وہ ایک عام مصالحے سے بنی ہوئی دیوار ہے، اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کئی سو کلومیٹر لمبی ہے اور اب بھی موجود ہے۔ بعض کا اصرار ہے کہ یہ وہی دیوار ''مارب'' ہے کہ جو یمن میں ہے، یہ ٹھیک ہے کہ دیوار مارب ایک کوہستانی درے میں بنائی گئی ہے لیکن وہ سیلاب کو روکنے کے لئے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقصد سے بنائی گئی ہے اور ویسے بھی وہ لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔

جب کہ علماء و محققین کی گواہی کے مطابق سرزمین ''قفقاز'' میں دریائے خزر اور دریائے سیاہ کے درمیان پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو ایک دیوار کی طرح شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس میں ایک دیوار کی طرح کا درہ موجود ہے جو مشہور درہ ''داریال'' ہے، یہاں اب تک ایک قدیم تاریخی لوہے کی دیوار نظر آتی ہے، اسی بناء پر بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ دیوار ذوالقرنین یہی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ وہیں قریب ہی ''سائرس'' نامی ایک نہر موجود ہے اور ''سائرس'' کا معنی ''کورش'' ہی ہے (کیونکہ یونانی ''کورش'' کو ''سائرس'' کہتے تھے)۔ ارمنی کے قدیم آثار میں اس دیوار کو ''بھاگ گورائی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اس لفظ کا معنی ہے ''درہ کورش'' یا ''معبر کورش'' (کورش کے عبور کرنے کی جگہ) ہے یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوار کا

بانی ''کورش'' ہی تھا۔

یاجوج ماجوج [1] کون تھے؟

قرآن واضح طور پر گواہی دیتا ہے کہ یہ دو وحشی خونخوار قبیلوں کے نام تھے، وہ لوگ اپنے اردگرد رہنے والوں پر بہت زیادتیاں اور ظلم کرتے تھے۔ عظیم مفسر علامہ طباطبائی نے المیزان میں لکھا ہے کہ توریت کی ساری باتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج یا یاجوج وماجوج ایک یا کئی ایک بڑے بڑے قبیلے تھے، یہ شمالی ایشیا کے دور دراز علاقے میں رہتے تھے، یہ جنگجو، غارت گر اور ڈاکو قسم کے لوگ تھے۔

تاریخ کے بہت سے دلائل کے مطابق زمین کے شمال مشرق ''مغولستان'' کے اطراف میں گزشتہ زمانوں میں انسانوں کا گویا جوش مارتا ہوا چشمہ تھا، یہاں کے لوگوں کی آبادی بڑی تیزی سے پھلتی اور پھولتی تھی، آبادی زیادہ ہونے پر یہ لوگ مشرق کی سمت یا نیچے جنوب کی طرف چلے جاتے تھے اور سیل رواں کی طرح ان علاقوں میں پھیل جاتے تھے اور پھر تدریجاً وہاں سکونت اختیار کر لیتے تھے، تاریخ کے مطابق سیلاب کی مانند ان قوموں کے اٹھنے کے مختلف دور گزرے ہیں۔ [2]

کورش کے زمانے میں بھی ان کی طرف ایک حملہ ہوا، یہ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح کی

---

[1] قرآن مجید کی دو سورتوں میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے ایک سورہ کہف آیت 94 میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیت 96 میں۔

[2] ان میں ایک حملہ ان وحشی قبائل نے چوتھی صدی عیسوی میں ''اتیلا'' کی کمان میں کیا، اس حملے میں روم کا شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔ ایک اور دور کہ جو ان کے حملوں کا تقریباً آخری دور شمار ہوتا ہے، وہ بارہویں صدی ہجری میں چنگیز خاں کی سرپرستی میں ہوا، انھوں نے مسلمان اور عرب ممالک پر حملہ کیا، اس حملے میں بغداد سمیت بہت سے شہر تباہ برباد ہو گئے۔

بات ہے لیکن اس زمانے میں ''ماد'' اور ''فارس'' کی متحدہ حکومت معرض وجود میں آچکی تھی لہٰذا حالات بدل گئے اور مغربی ایشیا ان قبائل کے حملوں سے آسودہ خاطر ہوگیا۔ لہٰذا یہ زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج انہی وحشی قبائل میں سے تھے، جب کورش ان علاقوں کی طرف گئے تو قفقاز کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں ان قبائل کے حملوں سے بچایا جائے، لہٰذا اس نے وہ مشہور دیوار تعمیر کی ہے جسے دیوار ذوالقرنین کہتے ہیں۔

قوم تُبّع

سرزمین یمن جزیرۃ العرب میں واقع ہے اور اس کا شمار دنیا کی ایسی آباد اور بابرکت زمینوں میں ہوتا ہے، جو ماضی میں درخشندہ تمدن کی حامل تھی، اس سرزمین پر ایسے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے جن کا نام "تُبّع" (جس کی جمع "تبابعہ" ہے) تھا چونکہ لوگ ان کی "اتباع" کیا کرتے تھے، اس لئے ان کو "تُبّع" کہتے تھے یا پھر اس لئے کہ وہ کئی پشتوں تک یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آتے رہے۔

قوم تُبّع کون تھی؟

قرآن مجید میں صرف دو مقام پر "تُبّع" کا لفظ استعمال ہوا ہے، ایک تو سورہ دخان آیت 37 میں اور دوسرے سورہ "ق" کی 14 ویں آیت میں جہاں پر ارشاد ہوتا ہے:

"گھنے درختوں کی سرزمین والی قوم شعیب اور قوم تبع، ایک نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا تو خدا کی تہدید بھی ان کے بارے میں سچ ثابت ہوگئی"۔

"تبع" یمن کے بادشاہوں کا ایک عمومی لقب تھا، جس طرح ایران کے بادشاہوں کو کسریٰ، ترک سلاطین کو خاقان، مصر کے بادشاہوں کو فرعون اور روم کے شہنشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔

یمن کے بادشاہوں کو "تبع" یا تو اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دیا کرتے تھے، یا پھر اس کے لئے کہ وہ یکے بعد دیگرے براہ مملکت ہوا کرتے تھے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے یمن کے تمام بادشاہوں کی بات نہیں کی، بلکہ کسی خاص بادشاہ کا ذکر کیا ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر خاص فرعون کی بات کی ہے)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کا نام "اسعد ابو کرب" تھا۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ بذات خود حق طلب اور صاحب ایمان شخص تھا، انھوں نے قرآن مجید کی دونوں آیات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی مذکورہ دونو ں آیات میں اس کی ذات کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے نقل کی جانے والی روایت بھی اسی بات کی شاہد ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: "تبع" کو برا مت کہو کیونکہ وہ ایمان لا چکا تھا۔"

تبع مدینہ کے نزدیک

ایک اور روایت میں ہے کہ جب "تبع" اپنے کشور کشائی کے ایک سفر میں مدینہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے ساکن یہودی علماء کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کو ویران کرنا چاہتا ہوں تا کہ کوئی بھی یہودی اس جگہ نہ رہنے پائے، اور عرب قانون حکم فرما ہو۔

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم "شامول" تھا، اس نے کہا: یہ وہ شہر ہے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے پیدا ہونے والے ایک پیغمبر کی ہجرت گاہ بنے گا، پھر اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی چند صفات گنوائیں، تبع جس کے ذہن میں گویا اس بارے میں کچھ معلومات تھیں اس نے کہا: "تو پھر اس شہر کو ویران نہیں کروں گا"۔

حتیٰ کہ ایک اور روایت میں اسی داستان کے ذیل میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس نے "اوس" اور "خزرج" کے بعض قبائل کو جو اس کے ہمراہ تھے حکم دیا کہ وہ اسی شہر میں رہ جائیں اور جب پیغمبر موعود ظہور کریں تو وہ ان کی امداد کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہ اسی بات کی وصیت کرتا رہا، حتیٰ کہ اس نے ایک خط بھی تحریر کر کے اس کے سپرد کر دیا، جس میں پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان لانے کا اظہار کیا گیا تھا۔

تُبّع شہر مکہ میں

صاحب "اعلام القرآن" رقمطراز ہیں:

"تبع" یمن کے عالمگیر بادشاہوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ہندوستان تک فوج کشی کی اور اس علاقے کی تمام حکومتوں کو اپنی زیر نگرانی کر لیا، اپنی فوج کشی کی ایک مہم کے دوران میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور اس نے خانہ کعبہ کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا کہ طبیب اس کے معالجے سے عاجز آ گئے۔

اس کے ہمرکابوں میں کچھ اہل علم بھی موجود تھے جس کا سرپرست "شامول" نامی ایک حکیم تھا، اس نے کہا: آپ کی بیماری کا اصل سبب خانہ کعبہ کے بارے میں بری نیت ہے۔

"تبع" اپنے مقصد سے باز آ گیا اور نذر مانی کہ وہ خانہ کعبہ کا احترام کرے گا اور صحت یاب ہونے کے بعد خانہ کعبہ پر یمانی چادر کا غلاف چڑھائے گا۔

دوسری تاریخوں میں بھی خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی داستان منقول ہے جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے یہ فوج کشی اور کعبہ پر غلاف چڑھانے کا مسئلہ 5 عیسوی میں وقوع پذیر ہوا، اب بھی شہر مکہ میں ایک جگہ موجود ہے جس کا نام "دار التبابعہ" ہے۔

بہر حال یمن کے بادشاہوں (تبابعہ یمن) کی داستان کا ایک بہت بڑا حصہ تاریخی لحاظ

سے ابہام سے خالی نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد اور ان کی حکومت کے عرصہ کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہیں، اس بارے میں بعض متضاد روایتیں بھی ملتی ہیں، جو کچھ اسلامی روایات میں ہے وہ تفسیری سواد ہو یا تاریخی او ..تی، صرف بادشاہ کے بارے میں ہے، جس کا قرآن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

انطاکیہ کے رسول

''انطاکیہ'' شام کے علاقہ کا ایک قدیم شہر ہے بعض کے قول کے مطابق یہ شہر مسیح علیہ السلام سے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا، یہ شہر قدیم زمانے میں دولت وثروت اور علم وتجارت کے لحاظ سے مملکت روم کے تین بڑے شہروں میں سے ایک شمار ہوتا تھا۔

شہر انطاکیہ، حلب سے ایک سو کلو میٹر سے کچھ کم اور اسکندریہ سے تقریباً ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

یہ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ''ابوعبیدہ جراح'' کے ہاتھوں فتح ہوا اور رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا اس میں رہنے والے لوگ عیسائی تھے انھوں نے جزیہ دینا قبول کرلیا اور اپنے مذہب پر باقی رہ گئے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ شہر ''فرانسیسیوں'' نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس بات کے پیش نظر کہ ان کے شام سے نکلنے کے بعد اس ملک میں ہونے والے فتنہ وفساد سے عیسائیوں کو کوئی گزند نہ پہنچے، انھوں نے اسے ترکی کے حوالے کردیا۔

انطاکیہ عیسائیوں کی نگاہ میں اسی طرح دوسرا مذہبی شہر شمار ہوتا ہے جس طرح مسلمانوں کی نظر میں مدینہ ہے اور ان کا پہلا شہر بیت المقدس ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کی ابتداء کی اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے ایک گروہ نے

انطاکیہ کی طرف ہجرت کی اور ''پولس'' اور ''برنابا'' شہروں کی طرف گئے، انھوں نے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دی، یہاں سے دین عیسوی نے وسعت حاصل کی، اسی بناء پر قرآن میں اس شہر کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے۔

قرآن اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''تم ان سے بستی والوں کی مثال بیان کرو کہ جس وقت خدا کے رسول ان کی طرف آئے۔'' [1]

قرآن اس اجمالی بیان کے بعد ان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''وہ وقت کہ جب ہم نے دو رسولوں کو ان کی طرف بھیجا لیکن انھوں نے ہمارے رسولوں کی تکذیب کی، لہٰذا ہم نے ان دو کی تقویت کے لئے تیسرا رسول بھیجا، ان تینوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں''۔ [2]

اس بارے میں کہ یہ رسول کون تھے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ ان دو کے نام ''شمعون'' اور ''یوحنا'' تھے اور تیسرے کا نام ''پولس'' تھا اور بعض نے ان کے دوسرے نام ذکر کئے ہیں۔

اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول تھے یا حضرت مسیح علیہ السلام کے بھیجے ہوئے اور ان کے نمائندے تھے (اور اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ ہم نے انہیں بھیجا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کے بھیجے ہوئے بھی خدا ہی کے رسول ہیں)۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے اگرچہ قرآن ظاہر پہلی تفسیر کے موافق ہے اگرچہ اس نتیجہ میں کہ جو قرآن لینا چاہتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس گمراہ قوم نے ان رسولوں کی دعوت پر کیا رد عمل ظاہر کیا؟ قرآن کہتا ہے: انھوں نے بھی وہی بہانہ کیا کہ جو بہت سے سرکش کافروں نے گزشتہ خدائی

---

[1] سورہ یٰسین آیت 13

[2] سورہ یٰسین آیت 14

پیغمبروں کے جواب میں کیا تھا: ''انھوں نے کہا تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی ہے، تمہارے پاس جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔'' [1]

اگر خدا کی طرف سے کوئی بھیجا ہوا ہی آنا تھا تو کوئی مقرب فرشتہ ہونا چاہئے تھا، نہ کہ ہم جیسا انسان اور اسی امر کو انھوں نے رسولوں کی تکذیب اور فرمان الٰہی کے نزول کے انکار کی دلیل خیال کیا۔

حالانکہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ پوری تاریخ میں سب رسول نسل آدم علیہ السلام ہی سے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے کہ جن کی رسالت سب مانتے تھے، یقیناً وہ انسان ہی تھے اس سے قطع نظر کیا انسانوں کی ضروریات، مشکلات اور تکلیفیں انسان کے علاوہ کوئی اور سمجھ سکتا ہے۔؟ [2]

بہر حال یہی پیغمبر اس گمراہ قوم کی شدید اور سخت مخالفت کے باوجود مایوس نہ ہوئے اور انھوں نے کمزوری نہ دکھائی اور ان کے جواب میں ''کہا: ہمارا پروردگار جانتا ہے کہ یقیناً ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔''

''اور ہمارے ذمہ تو واضح اور آشکار طور پر ابلاغ رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔'' (وما علینا الا البلاغ المبین)

---

[1] سورہ یسین آیت 15

[2] یہاں پر خدائی صفت رحمانیت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ یہ اس لحاظ سے ہو کہ خدا ان کی بات کو نقل کرتے ہوئے خصوصیت سے اس صفت کا ذکر کرتا ہے تاکہ ان کا جواب خود ان کی بات ہی سے حل ہو جائے، کیونکہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کہ جس کی رحمت عامہ نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے وہ انسانوں کی تربیت اور رشد و تکامل کی طرف دعوت دینے کے لئے پیغمبر نہ بھیجے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ وصف رحمن کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ خداوند مہربان اپنے بندوں کا کام پیغمبروں کے بھیجنے اور مشکل ذمہ داریاں عائد کرنے سے نہیں کرتا وہ تو آزاد رکھتا ہے، یہ کمزور اور بے بنیاد منطق اس گروہ کے انکار کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔

مسلمہ طور پر انھوں نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا اور قسم پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ "بلاغ مبین" ان کا ابلاغ "بلاغ مبین" کا مصداق نہ ہوتا کیونکہ "بلاغ مبین" تو اس طرح ہونا چاہیئے کہ حقیقت سب تک پہنچ جائے اور بات یقینی اور محکم دلائل اور واضح معجزات کے سوا ممکن نہیں ہے۔

بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح بعض نا قابل علاج بیماروں کو حکم خدا سے شفا بخشی۔

ہم آپ کو سنگسار کردیں گے

لیکن یہ دل کے اندھے واضح منطق اور معجزات کے سامنے نہ صرف جھکے نہیں بلکہ انھوں نے اپنی خشونت اور سختی میں اضافہ کر دیا اور تکذیب کے مرحلے سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے تہدید اور شدت کے مرحلے میں داخل ہو گئے "انھوں نے کہا: ہم تو تمہیں فال بد سمجھتے ہیں تمہارا وجود منحوس ہے اور تم ہمارے شہر کے بدبختی کا سبب ہو۔" [1]

ممکن ہے کہ ان انبیاء الٰہی کے آنے کے ساتھ ہی اس شہر کے لوگوں کی زندگی میں ان کے گناہوں کے زیر اثر یا خدائی تنبیہ کے طور پر بعض مشکلات پیش آئی ہوں، جیسا کہ بعض مفسرین نے نقل بھی کیا ہے کہ ایک مدت تک بارش کا نزول منقطع رہا، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی عبرت حاصل نہیں کی بلکہ اس امر کو پیغمبروں کی دعوت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ کھلی دھمکیوں کے ساتھ اپنی قبیح نیتوں کو ظاہر کیا اور کہا: "اگر تم ان باتوں سے دستبردار نہ ہوئے تو ہم یقینی طور پر سنگسار کردیں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی"۔ [2] یہ وہ مقام تھا کہ خدا کے پیغمبر اپنی منہ بولتی منطق کے ساتھ ان کی فضول

---

[1] سورہ یٰسین آیت 18

[2] سورہ یٰسین آیت 18

ہذیانی باتوں کا جواب دینے کے لئے تیار ہو گئے اور "انھوں نے کہا: تمہاری بدبختی اور نحوست خود تمہاری ہی طرف سے ہے اور اگر تم ٹھیک طرح سے غور کرو تو اس حقیقت سے واقف ہو جاؤ گے"۔ [1]

اگر بدبختی اور منحوس حوادث تمہارے معاشرے کو گھیرے ہوئے ہیں اور برکات الٰہیہ تمہارے درمیان میں سے اٹھ گئی ہیں تو اس کا عامل اپنے اندر اپنے پست افکار اور قبیح اعمال میں تلاش کرو نہ کہ ہماری دعوت میں، یہ تمہی ہو کہ جنھوں نے بت پرستی، خودغرضی، ظلم اور شہوت پرستی سے اپنے زندگی کی فضا کو تاریک بنا ڈالا ہے اور خدا کی برکات کو اپنے سے منقطع کر کے رکھ دیا ہے"۔

تمہاری اصلی بیماری وہی تمہارا حد سے تجاوز ہے اگر تم توحید کا انکار کرتے ہوئے شرک کی طرف رخ کرتے ہو تو اس کی وجہ حق سے تجاوز ہے اور اگر تمہارا معاشرہ برے انجام میں گرفتار ہوا ہے تو اس کا سبب بھی گناہ میں زیادتی اور شہوات میں آلودگی ہے خلاصہ یہ کہ اگر خیرخواہوں کی خیرخواہی کے جواب میں تم انہیں موت کی دھمکی دیتے ہو تو یہ بھی تمہارے تجاوز کی بنا پر ہے۔

ایک جاں بکف مجاہد

قرآن میں ان رسولوں کی جدوجہد کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ ان میں سے تھوڑے سے مومنین نے بڑی شجاعت سے ان انبیاء کی حمایت کی اور وہ کافر و مشرک اور ہٹ دھرم اکثریت کے مقابلے میں کھڑے ہوئے اور جب تک جان باقی رہی انبیاء الٰہی کا ساتھ دیتے رہے۔

[1] سورہ یٰسین آیت 18

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "ایک (باایمان) مرد شہر کے دور دراز مقام سے بڑی تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا کافر گروہ کے پاس آیا اور کہا: اے میری قوم مرسلین خدا کی پیروی کرو۔" [1]

اس شخص کا نام اکثر مفسرین نے "حبیب نجار" بیان کیا ہے وہ ایسا شخص تھا کہ جو پروردگار کے پیغمبروں کی پہلی ہی ملاقات میں ان کی دعوت کی حقانیت اور ان کی تعلیمات کی گہرائی کو پا گیا تھا وہ ایک ثابت قدم اور مصمم کا رمومن ثابت ہوا جس وقت اسے خبر ملی کہ وسط شہر میں لوگ ان انبیاء الٰہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور شاید انہیں شہید کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس نے خاموش رہنے کو جائز نہ سمجھا چنانچہ

"یسعی" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی تیزی اور جلدی کے ساتھ مرکز شہر تک پہنچا اور جو کچھ اس کے بس میں تھا حق کی حمایت اور دفاع میں فروگزاشت نہ کی۔

"رجل" کی تعبیر ناشناختہ شکل میں شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک عام آدمی تھا، کوئی قدرت وشوکت نہیں رکھتا تھا اور اپنی راہ میں یک وتنہا تھا لیکن اس کے باوجود ایمان کے نور وحرارت نے اس کا دل اس طرح سے روشن اور مستعد کر رکھا تھا کہ راہ توحید کے مخالفین کی سخت مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا۔

"اقصی المدینة" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان رسولوں کی دعوت شہر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی اور آمادہ دلوں میں اثر کر چکی تھی، اس سے قطع نظر کہ شہر کے دور دراز کے علاقے ہمیشہ ایسے مستضعفین کے مرکز ہوتے ہیں کہ جو حق کو قبول کرنے کے لئے زیادہ وتیار ہوتے ہیں، اس کے برعکس شہروں میں نسبتاً خوشحال لوگ زندگی بسر کرتے ہیں جن کو حق کی طرف راغب کرنا آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یہ مومن مجاہد اپنے شہر والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے

---

[1] سورہ یسین آیت 20

کس منطق اور دلیل کو اختیار کرتا ہے۔اس نے پہلے یہ دلیل اختیار کی کہ" ایسے لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے اپنی دعوت کے بدلے میں کوئی اجر طلب نہیں کرتے"۔[1]

یہ ان کی صداقت کی پہلی نشانی ہے کہ ان کی دعوت میں کسی قسم کی مادی منفعت نہیں ہے، وہ تم سے نہ کوئی مال چاہتے ہیں اور نہ ہی جاہ و مقام، یہاں تک کہ وہ تو تشکر و سپاس گزاری بھی نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی اور صلہ۔اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے:(علاوہ ازیں) یہ رسول جیسا ان کی دعوت کے مطالب اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے" کہ وہ ہدایت یافتہ افراد ہیں"۔[2]

یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کسی کی دعوت کو قبول نہ کرنا یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس کی دعوت حق نہیں ہے اور وہ بے راہ روی اور گمراہی کی طرف کھینچ رہا ہے یا یہ کہ ہے تو حق لیکن اس کو پیش کرنے والے اس کے ذریعے کوئی خاص مفاد حاصل کر رہے ہیں کیونکہ یہ بات خود اس قسم کی دعوت کے بارے میں بدگمانی کا ایک سبب ہے،لیکن جب نہ وہ بات ہو اور نہ یہ، تو پھر تامل و تردد کے کیا معنی؟

اس کے بعد قرآن ایک اور دلیل پیش کرتا ہے اور اصل توحید کے بارے میں بات کرتا ہے کیونکہ یہی انبیاء کی دعوت کا اہم ترین نکتہ ہے، کہتا ہے:"میں اس ہستی کی پرستش کیوں نہ کروں کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔"[3]

وہ ہستی پرستش کے لائق ہے کہ جو خالق و مالک ہے اور نعمات بخشنے والی ہے، نہ کہ یہ بت کہ جن سے کچھ بھی نہیں ہوسکتا،فطرت سلیم کہتی ہے کہ خالق کی عبادت کرنا چاہئے نہ کہ اس بے قدر و قیمت مخلوق کی۔

اس کے بعد خبردار کرتا ہے کہ یاد رکھو"تم سب کے سب آخرکار اکیلے ہی اس کی طرف

---

[1] سورہ یسین آیت 21

[2] سورہ یسین آیت 22

[3] سورہ یسین آیت 22

لوٹ کر جاؤ گے۔"[1]

اپنے تیسرے استدلال میں بتوں کی کیفیت بیان کرتا ہے اور خدا کے لئے عبودیت کے اثبات کو، بتوں کی عبدیت کی نفی کے ذریعے تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا میں خدا کے سوا اور معبود اپنالوں، جب کہ خدائے رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے معمولی سا فائدہ بھی نہ دے گی اور وہ مجھے اس کے عذاب سے نہ بچا سکیں گے۔"[2]

اس کے بعد یہ مجاہد مومن مزید تاکید وتوضیح کے لئے کہتا ہے: "اگر میں اس قسم کے بتوں کی پرستش کروں اور انھیں پروردگار کا شریک قرار دوں تو میں کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔"[3]

اس سے بڑھ کر کھلی گمراہی کیا ہوگی کہ عاقل و باشعور انسان ان بے شعور موجودات کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور انہیں زمین و آسمان کے خالق کے برابر جانے۔

اس مجاہد مومن نے ان استدلالات اور موثر و وسیع تبلیغات کے بعد ایک پر اثر تاثیر آواز کے ساتھ سب لوگوں کے درمیان اعلان کیا: میں تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا ہوں اور ان رسولوں کی دعوت کو قبول کیا ہے۔" اس بنا پر میری باتوں کو سنو۔"[4]

اور جان لو کہ میں ان رسولوں کی دعوت پر ایمان رکھتا ہوں اور تم میری بات پر عمل کرو کہ یہی تمہارے فائدہ کی بات ہے۔

اس مرد مومن کے مقابلہ میں قوم کا ردّعمل

---

[1] سورہ یسین آیت 22

[2] سورہ یسین آیت 23

[3] سورہ یسین آیت 24

[4] سورہ یسین آیت 25

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس پاکباز مومن کے جواب میں اس ہٹ دھرم قوم کا ردعمل کیا تھا، قرآن نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی لیکن قرآن کے بعد کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے شہید کردیا۔

ہاں اس کی پرجوش اور ولولہ انگیز گفتگو قوی اور طاقتور استدلالات اور ایسے عمدہ و دلنشین نکات کے ساتھ تھی، مگر اس سے نہ صرف یہ کہ ان سیاہ دلوں اور مکر وغرور سے بھرے ہوئے سروں پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا بلکہ کینہ وعداوت کی آگ ان کے دلوں میں ایسے بھڑکی کہ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے اس شجاع مرد مومن کی جان کے پیچھے پڑ گئے، ایک روایت کے مطابق انھوں نے اسے پتھر مارنے شروع کئے اور اس کے جسم کو اس طرح سے پتھروں کا نشانہ بنایا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور جان جان آفرین کے سپرد کردی، اس کے لبوں پر مسلسل یہ بات تھی کہ "خداوندا میری اس قوم کو ہدایت فرما کہ وہ جانتے نہیں ہیں"۔

ایک اور روایت کے مطابق اسے اس طرح پاوں کے نیچے روندا کہ اس کی روح پرواز کرگئی۔

لیکن قرآن اس حقیقت کو ایک عمدہ اور سربستہ جملہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہوجا"۔ [1]

یہ وہی تعبیر ہے کہ جو راہ خدا کے شہیدوں کے بارے میں قرآن کی دو دوسری آیات میں بیان ہوئی ہے: "یہ گمان نہ کرو کہ جو لوگ راہ خدا میں قتل کئے گئے ہیں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ جاوید ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں۔" [2]

جاذب توجہ بات یہ ہے، یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ مرد مومن شہادت پاتے ہی جنت میں داخل ہوگیا، ان دونوں کے درمیان اس قدر کم فاصلہ تھا کہ قرآن مجید نے اپنی

---

[1] سورہ یسین آیت 26

[2] سورہ آل عمران آیت 169

لطیف تعبیر میں اس کی شہادت کا ذکر کرنے کے بجائے اس کے بہشت میں داخل ہونے کو بیان کیا، شہیدوں کی منزل یعنی بہشت وسعادت کس قدر نزدیک ہے۔

بہرحال اس شخص کی پاک روح آسمانوں کی طرف، رحمت الٰہی کے قرب اور بہشت نعیم کی طرف پرواز کر گئی اور وہاں اسے صرف یہ آرزو تھی کہ: ''اے کاش میری قوم جان لیتی۔ اے کاش! وہ جان لیتے کہ میرے پروردگار نے مجھے اپنی بخشش اور عفو سے نوازا ہے اور مجھے مکرم لوگوں کی صف میں جگہ دی ہے۔'' [1]

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام ﷺ نے فرمایا: ''اس باایمان شخص نے اپنی زندگی میں بھی اپنی قوم کی خیرخواہی کی اور موت کے بعد بھی اس کی ہدایت کی ارزو رکھتا تھا۔''

بہرحال یہ تو اس مومن اور سچے مجاہد کا انجام تھا کہ جس نے اپنی ذمہ داری کی انجام دہی اور خدا کے پیغمبروں کی حمایت میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور آخر کار شربت شہادت نوش کیا اور جوار رحمت میں جگہ پائی۔

تین پیغمبروں علیہ السلام کا انجام کار

اگرچہ قرآن میں ان تین پیغمبروں کے انجام کار کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی کہ جوا قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس قوم نے، اس مرد مومن کو شہید کرنے کے علاوہ اپنے پیغمبروں کو بھی شہید کر دیا جب کہ بعض نے تصریح کی ہے کہ اس مرد مومن نے لوگوں کو اپنے ساتھ مشغول رکھا تا کہ وہ پیغمبر اس سازش سے بچ جائیں، کہ جو ان کے خلاف کی گئی تھی، اور کسی پرامن جگہ منتقل ہو جائیں۔

---

[1] سورہ یٰسین آیت 26 تا 27

اس ظالم اور سرکش قوم کا سرانجام

ہم نے دیکھا کہ شہر انطاکیہ کے لوگوں نے خدا کے پیغمبروں کی کیسے مخالفت کی، اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے: ''ہم نے اس کے بعد اس کی قوم پر کوئی لشکر آسمان سے نہیں بھیجا اور اصولاً ہمارا یہ طریقہ ہی نہیں ہے کہ ایسی سرکش اقوام کو نابود کرنے کے لئے ان امور سے کام لیں۔'' [1]

ہم ان امور کے محتاج نہیں ہیں صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ جس سے ہم ان سب کو خاموش کر دیں اور انہیں دیار عدم کی طرف بھیج دیں اور ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیں۔

صرف ایک اشارہ ہی کافی ہے کہ ان کے حیات کے عوامل ہی ان کی موت کے عامل میں بدل جائیں اور مختصر سے وقت میں ان کی زندگی کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیں۔ پھر قرآن مزید کہتا ہے: ''صرف ایک آسمانی چیخ پیدا ہوئی، ایسی چیخ کہ جو ہلا دینے والی اور موت کا پیغام تھی اچانک سب پر موت کی خاموشی طاری ہو گئی''۔ [2]

کیا یہ چیخ بجلی کی کڑک تھی کہ جو بادل سے اٹھی اور زمین پر جا پڑی اور ہر چیز کو لرزہ بر اندام کر دیا اور تمام عمارتوں کو تباہ کر دیا اور وہ سب خوف کی شدت سے موت کی آغوش میں چلے گئے؟

یا یہ ایسی چیخ تھی کہ جو زمین کے اندر سے ایک شدید زلزلے کی صورت میں اٹھی اور فضا میں دھماکہ ہوا اور اس دھماکے کی لہر نے انہیں موت کی آغوش میں سلا دیا۔

---

[1] سورہ یسین آیت 28

[2] سورہ یسین آیت 29

ایک چیخ وہ جو کچھ بھی تھی لمحہ بھر سے زیادہ نہ تھی، وہ ایک ایسی آواز تھی کہ جس نے سب آوازوں کو خاموش کر دیا اور ایسی ہلا دینے والی تھی کہ جس نے تمام حرکتوں کو بے حرکت کر دیا اور خدا کی قدرت ایسی ہی ہے اور ایک گمراہ اور بے ثمر قوم کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر

سزا خود همین است مر بی بری را

''بے ثمر درختوں کی لکڑی جلانے ہی کے کام آتی ہے کیونکہ بے ثمر چیز کی سزا یہی ہے۔''

انطاکیہ کے رسولوں کی داستان مجمع البیان کی زبانی

مفسر عالی قدر ''طبرسی'' مجمع البیان میں کہتے ہیں: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں میں سے اپنے دو نمائندے انطاکیہ کی طرف بھیجے جس وقت وہ شہر کے پاس پہنچے تو انھوں نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ جو چند بھیڑیں چرانے کے لئے لایا تھا، یہ ''حبیب'' صاحب ''یس'' تھا، انھوں نے اُسے سلام کیا، بوڑھے نے جواب دیا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے نمائندے ہیں، ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہیں بتوں کی عبادت کے بجائے خدائے رحمان کی طرف دعوت دیں۔

بوڑھے نے کہا کہ تمہارے پاس کوئی معجزہ یا نشانی بھی ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں ہم بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور مادر زاد اندھوں اور برص میں مبتلا لوگوں کو حکم خدا سے صحت و تندرستی بخشتے ہیں۔

بوڑھے نے کہا: میرا ایک بیمار بیٹا ہے کہ جو سالہا سال سے بستر پر پڑا ہے۔

انھوں نے کہا: ہمارے ساتھ چلو تا کہ ہم تمہارے گھر جا کر اس کا حال معلوم کریں۔

بوڑھا ان کے ساتھ چل پڑا، انھوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ صحیح وسالم اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی اور خدا نے اس کے بعد بیماروں میں سے ایک کثیر گروہ کو ان کے ہاتھ شفا بخشی۔

ان کا بادشاہ بت پرست تھا جب اس تک خبر پہنچی تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا: کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ ہیں، ہم اس لئے آئے ہیں کہ یہ موجودات جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں ان کی عبادت کے بجائے ہم تمہیں اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں جو سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کیا ہمارے خداؤں کے علاوہ کوئی معبود بھی موجود ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں وہی کہ جس نے تجھے اور تیرے معبودوں کو پیدا کیا ہے۔

بادشاہ نے کہا: اٹھ جاؤ کہ میں تمہارے بارے میں کچھ سوچ بچار کروں۔

یہ ان کے لئے ایک دھمکی تھی، اس کے بعد لوگوں نے ان دونوں نمائندوں کو بازار میں پکڑ کر مارا پیٹا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں نمائندوں کو بادشاہ تک رسائی حاصل نہ ہوئی اور ایک مدت تک وہ اس شہر میں رہے ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر آیا ہوا تھا تو انھوں نے تکبیر کی آواز بلند کی۔ اور ''اللہ'' کا نام عظمت کے ساتھ لیا، بادشاہ غضب ناک ہوا اور انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا اور ہر ایک کو سو کوڑے مارے۔

جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں نمائندوں کی تکذیب ہوگئی اور انھیں زدو کوب کیا گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''شمعون الصفا'' کو ان کے پیچھے روانہ کیا، وہ جو حواریوں کے بزرگ تھے۔

شمعون اجنبی صورت میں شہر میں پہنچے اور بادشاہ کے اطرافیوں سے دوستی پیدا کر لی، انہیں ان کی دوستی بہت بھائی اور ان کے بارے میں بادشاہ کو بھی بتایا، بادشاہ نے بھی ان کو

دعوت دی اور انہیں اپنے ہم نشینوں میں شامل کرلیا، بادشاہ ان کا احترام کرنے لگا۔

شمعون نے ایک دن بادشاہ سے کہا: میں نے سنا ہے کہ دو آدمی آپ کی قید میں ہیں اور جس وقت انھوں نے آپ کو آپ کے دین کے بجائے کسی دوسرے دین کی دعوت دی تو آپ نے انہیں مارا پیٹا؟ کیا کبھی آپ نے ان کی باتیں سنی بھی ہیں؟

بادشاہ نے کہا: مجھے ان پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی۔

شمعون نے کہا: اگر بادشاہ مصلحت سمجھیں تو انہیں بلالیں تاکہ ہم دیکھیں تو سہی کہ ان کے پلے ہے کیا۔ بادشاہ نے انہیں بلالیا، شمعون نے یوں ظاہر کیا جیسے انہیں پہچانتے ہی نہ ہوں اور ان سے کہا: تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟

انھوں نے کہا: ''اس خدا نے کہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔''

شمعون نے کہا: تمہارا معجزہ اور نشانی کیا ہے؟

انھوں نے کہا: جو کچھ تم چاہو بادشاہ نے حکم دیا اور ایک اندھے غلام کو لایا گیا جسے انھوں نے حکم خدا سے شفا بخشی، بادشاہ کو بہت تعجب ہوا، اس مقام پر شمعون بول اٹھے اور بادشاہ سے کہا: اگر آپ اس قسم کی درخواست اپنے خداؤں سے کرتے تو کیا وہ بھی اس قسم کے کام کی قدرت رکھتے ہیں؟

بادشاہ نے کہا تم سے کیا چھپا ہوا ہے ہمارے یہ خدا کہ جن کی ہم پرستش کرتے ہیں نہ تو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں، نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ کوئی اور خاصیت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے ان دونوں سے کہا: اگر تمہارا خدا مردے کو زندہ کرسکتا ہے تو ہم اس پر اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔

انھوں نے کہا: ہمارا خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: یہاں ایک مردہ ہے جسے مرے ہوئے سات دن گزر چکے ہیں ابھی

تک ہم نے اسے دفن نہیں کیا، ہم اس انتظار میں ہیں کہ اس کا باپ سفر سے آجائے تم اسے زندہ کر دکھاؤ۔

مردہ کو لایا گیا تو وہ دونوں تو آشکار دعا کر رہے تھے اور شمعون دل ہی دل میں، اچانک مردے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں سات روز سے مر چکا ہوں میں نے جہنم کی آگ اپنی آنکھ سے دیکھی ہے اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تم سب خدائے یگانہ پر ایمان لے او۔

بادشاہ نے تعجب کیا، جس وقت شمعون کو یقین ہو گیا کہ اس کی باتیں اس پر اثر کر گئی ہیں تو اسے خدائے یگانہ کی طرف دعوت دی اور وہ ایمان لے آیا اور اس کے ملک کے باشندے بھی اس کے ساتھ ایمان لے آئے، اگرچہ کچھ لوگ اپنے کفر پر باقی رہے۔

اس روایت کی نظیر تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے، اگرچہ ان کے درمیان کچھ فرق ہے۔

لیکن قرآن کے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس شہر والوں کا ایمان لانا بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ وہ صیحہ آسمانی کے ذریعہ ہلاک ہو گئے۔

ممکن ہے کہ روایت کے اس حصہ میں راوی سے اشتباہ ہوا ہو۔

اصحاب الرس

"اصحاب الرس" کون ہیں اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے۔ [1]

وہ ایسے لوگ تھے جو "صنوبر" کے درخت کی پوجا کرتے تھے اور اسے "درختوں کا بادشاہ" کہتے تھے یہ وہ درخت تھا جسے جناب نوح علیہ السلام کے بیٹے "یافث" نے طوفان نوح کے بعد "روشن آب" کے کنارے کاشت کیا تھا "رس" نامی نہر کے کنارے انھوں نے بارہ شہر آباد کر رکھے تھے جن کے نام یہ ہیں: آبان، آذر، دی، بہمن، اسفند، فروردین، اردبہشت، خرداد، تیر، مرداد، شہریور اور مہر، ایرانیوں نے اپنے کلنڈر کے بارہ مہینوں کے نام انھی شہروں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ وہ درخت صنوبر کا احترام کرتے تھے لہذا انھوں نے اس کے بیج کو دوسرے علاقوں میں بھی کاشت کیا اور آبپاشی کے لئے ایک نہر کو مختص کر دیا انھوں نے اس نہر کا پانی لوگوں

---

[1] سورہ فرقان آیت 38 میں اس ظالم و ستمگر قوم کا ذکر موجود ہے۔
"رس" کا لفظ دراصل مختصر اور تھوڑے سے اثر کے معنی میں ہے جیسے کہتے ہیں: "رس الحدیث فی نفسی" (مجھے اس کی تھوڑی سی بات یاد ہے) یا کہا جاتا ہے "وجد رسا من حمی" (اس نے اپنے اندر بخار کا تھوڑا سا اثر پایا)۔ کچھ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "رس" کا معنی "کنواں" ہے۔ معنی خواہ کچھ بھی ہو اس قوم کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اب تھوڑا سا اثر یا بہت ہی کم نام اور نشان باقی رہ گیا ہے یا اس وجہ سے انہیں "اصحاب الرس" کہتے ہیں کہ وہ بہت سے کنووں کے مالک تھے یا کنووں کا پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو گئے۔ (رجوع کریں تفسیر نمونہ ج 8 ص 386)

کے لئے پینا ممنوع قرار دے دیا تھا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس سے پی لیتا اسے قتل کر دیتے تھے وہ کہتے تھے کیونکہ یہ ہمارے خداؤں کا سرمایہ حیات ہے لہٰذا مناسب نہیں ہے کہ کوئی اس سے ایک گھونٹ پانی کو کم کر دے۔

وہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ماہ ایک ایک شہر میں ایک دن کے لئے عید منایا کرتے تھے اور شہر سے باہر صنوبر کے درخت کے پاس چلے جاتے اس کے لئے قربانی کرتے اور جانوروں کو ذبح کر کے آگ میں ڈال دیتے جب اس سے دھواں اٹھتا تو وہ درخت کے آگے سجدے میں گر پڑتے اور خوب گریہ کیا کرتے تھے۔ ہر مہینے ان کا یہی طریقہ کار تھا چنانچہ جب "اسفند" کی آبادی آتی تو تمام بارہ شہروں کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور مسلسل بارہ دن تک وہاں عید منایا کرتے کیونکہ یہ ان کے بادشاہوں کا دارالحکومت تھا یہیں پر وہ مقدور بھر قربانی بھی کیا کرتے اور درخت کے آگے سجدے بھی کیا کرتے۔

جب وہ کفر اور بت پرستی کی انتہا کو پہنچ گئے تو خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ان کی طرف بھیجا تاکہ وہ انہیں شرک سے روکے اور خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دے لیکن وہ اس نبی پر ایمان نہ لائے اب اس نبی نے فساد اور بت پرستی کی اصل جڑ یعنی اس درخت کے قلع قمع کرنے کی خدا سے دعا کی اور بڑا درخت خشک ہو گیا، جب ان لوگوں نے یہ صورت دیکھی تو سخت پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمارے خداؤں پر جادو کر دیا ہے کچھ کہنے لگے کہ ہمارے خدا اس شخص کی وجہ سے ہم پر ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیں کفر کی دعوت دیتا ہے۔ اب بحث مباحثے کے بعد سب لوگوں نے اللہ کے اس نبی کو قتل کرنے کی ٹھان لی اور گہرا کنواں کھودا جس میں اسے ڈال دیا اور کنوئیں کا منہ بند کر کے اس کے اوپر بیٹھ گئے اور اس کے نالہ و فریاد کی آواز سنتے رہے یہاں تک کہ اس نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی، خداوند عالم نے انہیں ان برائیوں اور ظلم و ستم کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر کے نیست و نابود کر دیا۔

سرسبز باغات کے مالک

قرآن میں پہلے زمانہ کے کچھ دولتمندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز وشاداب باغ کے مالک تھے اور آخر کار وہ خودسری کی بناء پر نابود ہو گئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور ومعروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''ہم نے انہیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی۔''

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعاء کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کی سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے، لیکن مشہور یمن ہی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا، وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے لیا کرتا اور باقی مستضعفین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا، لیکن جب اس نے دنیا سے آنکھ بند کر لی (اور مر گیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال واطفال زیادہ ہیں، لہٰذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے، اس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اٹھاتے تھے محروم کر دیں، لہٰذا ان کی سرنوشت وہی ہوئی جو قرآن میں بیان ہوئی۔

ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے انہیں آزمایا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں بچا کر چنیں گے اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہ کریں گے اور حاجت مندوں کے لئے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں۔'' [1]

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان

[1] سورہ قلم آیت 17۔18

کے بخل اور ضعیف ایمان کی وجہ سے تھا کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ حاجت مندوں کے لئے مخصوص کر سکتا ہے۔

اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: ''رات کے وقت جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہو گیا'' [1]

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مسلط ہوئی کہ: ''وہ سرسبز و شاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہو گیا۔ [2] اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔

بہر حال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ پھلوں سے لدے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لئے جائیں: ''صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکارا۔ انھوں نے کہا: ''اگر تم باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔'' [3]

اسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمہارے پاس نہ آنے پائے۔ [4]

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہو جائے اور بچے کچے پھل چننے کے لئے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آ جائے۔

---

[1] سورہ قلم آیت 19
[2] سورہ قلم آیت 20
[3] سورہ قلم آیت 21
[4] سورہ قلم آیت 22،21

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے ساتھ نیک اعمال کی بناء پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے انتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصہ انہیں بھی ملے، اسی لئے یہ بخیل اور ناخلف بیٹے اس طرح سے مخفی طور پر چلے کہ کسی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آ پہنچا ہے، اور جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

اسی طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لئے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔ [1]

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

وہ باغ والے اس امید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چنیں اور مساکین کی نظریں بچا کر اسے جمع کر لیں اور یہ سب کچھ اپنے لئے خاص کر لیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے، یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگبار صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کر دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: ''جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے، ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔'' [2]

پھر انھوں نے مزید کہا: ''بلکہ ہم تو حقیقت میں محروم ہیں۔'' [3]

ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم تو خود سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں مادی منافع سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہ خدا

---

[1] سورہ قلم آیت 23،24

[2] سورہ قلم آیت 26

[3] سورہ قلم آیت 27

میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں کو دینے سے ہمارے ہاتھ آئیں۔

"اس اثنا میں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ عقل مند تھا، اس نے کہا: "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔" [1]

کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت کا شکریہ بجالاؤ اور حاجت مندوں کو اپنے سوال سے بہرہ مند کرو لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سنا اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مرد مومن تھا جو انہیں بخل اور حرص سے منع کیا کرتا تھا، چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہٰذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی زبان کھل گئی، اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہوگئی، اور وہ انہیں مسلسل ملامت اور سرزنش کرتا رہا۔

وہ بھی ایک لحہ کے لئے بیدار ہو گئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا: "انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک اور منزہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم و ستمگر تھے، [2] ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور (دوسروں پر بھی۔"

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہوگیا: "انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رخ کیا اور ایک دوسرے کی ملامت و سرزنش کرنے لگے"۔ [3]

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کی سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے ورنہ ہم خدا اور اس کی عدالت سے اس قدر بیگانے نہیں تھے۔

---

[1] سورہ قلم آیت 28

[2] سورہ قلم آیت 29

[3] سورہ قلم آیت 30

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہا سے آگاہ ہوئے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے کہا: "وائے ہو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔" [1]

آخر کار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا اور کہا: امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ دے گا، کیونکہ ہم نے اسکی طرف رخ کرلیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگالی ہے۔ لہٰذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں۔ [2]

کیا یہ گروہ واقعاً اپنے فعل پر پشیمان ہوگیا تھا، اس نے پرانے طرزِ عمل میں تجدیدِ نظر کرلی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؟ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہوجاتے ہیں، لیکن جب عذاب ختم ہوجاتا ہے تو وہ دوبارہ انہیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیت کے لب ولہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے جمع نہ ہونے کی بناء پر قبول نہیں ہوئی، لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے خلوص نیت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ قبول کرلی اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیا جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوں والے انگور کے پُرمیوہ درخت تھے۔

قرآن آخر میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کیلئے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: خدا کا عذاب اس طرح کا ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے۔ [3]

---

[1] سورہ قلم آیت 31

[2] سورہ قلم آیت 32

[3] سورہ قلم آیت 33

قوم سبا

قوم سبا ایک ایسی جمعیت اور قوم تھی کہ جو جزیرہ عرب میں رہتی تھی، اور ایک اعلیٰ حکومت اور درخشاں تمدن کی مالک تھی۔

یمن کا علاقہ وسیع اور زرخیز تھا لیکن زرخیز علاقہ ہونے کے باوجود چونکہ وہاں کوئی اہم دریا نہیں تھا، لہٰذا اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا تھا، سیلاب اور بارشیں پہاڑوں پر برستی تھیں اور ان کا پانی بیابانوں میں بے کار اور بے فائدہ ضائع ہو جاتا تھا، اس سرزمین کے سمجھدار لوگ ان پانیوں سے استفادہ کرنے کی فکر میں لگ گئے اور اہم علاقوں میں بہت سے بند باندھے، جن میں سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ پانی کا ذخیرہ رکھنے والا بند "مارب" [1] تھا۔

"مارب" (بروزن مغرب) ایک شہر تھا کہ جو ان دروں میں سے ایک کے آخر میں واقع تھا، اور "صراۃ" کے کوہستانوں کے بڑے بڑے سیلاب اس کے قریب سے گزرتے تھے، اس درہ کے دہانہ پر "بلق" نامی دو پہاڑوں کے دامن میں انھوں نے ایک مضبوط بند بنایا تھا، اور اس میں سے پانی کی کئی نہریں نکالی تھیں، اس بند کے اندر پانی کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اس بات پر قادر ہو گئے تھے کہ اس نہر کے دونوں طرف، کہ جو بند تک جاتی تھی، بہت ہی خوبصورت وزیبا باغات لگائیں اور پر برکت کھیت تیار کریں۔

اس سرزمین کی آباد بستیاں ایک دوسری سے متصل تھیں اور درختوں کے وسیع سائے

---

[1] مغرب کے وزن پر

ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، اور ان کی شاخوں پر اتنے پھل لگا کرتے تھے کہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھ کر ان کے نیچے سے گزرتا تھا تو یکے بعد دیگرے اتنے پھل اس میں آ کر گرتے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹوکری بھر جاتی تھی۔

امن وامان کے ساتھ نعمت کے وفور نے پاک وصاف زندگی کے لئے بہت ہی عمدہ اور مرفہ ماحول پیدا کر رکھا تھا، ایک ایسا ماحول جو خدا کی اطاعت اور معنوی پہلوؤں کے ارتقاء و تکامل کے لئے مہیا تھا۔

لیکن انھوں نے ان تمام نعمتوں کی قدر کو نہ پہچانا اور خدا کو بھول گئے اور کفران نعمت میں مشغول ہو گئے، اور فخر ومباہات کرنے لگے اور طبقاتی اختلاف پیدا کر دیئے۔

صحرائی چوہوں نے مغرور و مست لوگوں کی آنکھوں سے دور، مٹی کے اس بند کی دیوار کا رخ کیا اور اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا، اچانک ایسی شدید بارشیں برسیں اور ایسا عظیم سیلاب آیا کہ جس سے بند کی وہ دیواریں کہ جو سیلاب کے دباؤ کو برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں دھڑام سے گر پڑیں اور بہت ہی زیادہ پانی کہ جو بند کے اندر جمع ہو رہا تھا، اچانک باہر نکل پڑا اور تمام آبادیوں، باغات، کھیتوں، فصلوں اور چوپایوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خوبصورت سجے سجائے قصور ومحلات اور مکانات کو ویران کر دیا اور اس کے بعد آباد سرزمین کو خشک اور بے آب وگیاہ صحرا میں بدل دیا اور ان تمام سرسبز وشاداب باغوں اور پھلدار درختوں میں سے صرف چند "اراک" کے کڑوے شجر، کچھ، جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت باقی رہ گئے، غزل خوانی کرنے والے پرندے وہاں سے کوچ کر گئے اور الوؤں اور کوؤں نے ان کی جگہ لے لی۔

ہاں جب خدا اپنی قدرت دکھانا چاہتا ہے تو چوہوں کے ذریعہ ایک عظیم تمدن کو برباد کر دیتا ہے، تا کہ بندے اپنے ضعف اور کمزوری سے آگاہ ہو جائیں، اور قدرت اور اقتدار کے وقت مغرور نہ ہوں۔

اس بارے میں کہ "سبا" کس کا نام ہے؟ اور یہ کیا چیز ہے؟ مورخین کے درمیان

اختلاف ہے،

لیکن مشہور یہ ہے کہ "سباء"، "یمن" کے اعراب کے باپ کا نام ہے اور اس روایت کے مطابق کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے، وہ ایک آدمی تھا اور اس کا نام "سباء" تھا اور اس کے دس بیٹے تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے وہاں کے قبائل میں سے ایک قبیلہ وجود میں آیا۔ [1]

ایک درخشاں تمدن جو کفران نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا

قرآن مجید نے ان کی عبرت انگیز سرگزشت بیان کی ہے، اور ان کی زندگی کے جزئیات وخصوصیات کے اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلے کہتا ہے: قوم سبا کے لئے ان کے محل سکونت میں خدائی قدرت کی ایک نشانی تھی۔ [2]

جیسا کہ ہم دیکھیں گے، خدا کی اس بزرگ آیت کا سرچشمہ یہ تھا کہ قوم سباء اس علاقے کے اطراف میں واقع پہاڑوں کے محل وقوع اور ان کے خاص حالات وشرائط، اور اپنی خداداد ذہانت اور ہوشمندی سے استفادہ کرتے ہوئے، ان سیلابوں کو کہ جو سوائے ویرانی وتباہی کے کوئی نتیجہ نہ دیتے تھے، ایک قوی اور مستحکم بند کے پیچھے روک دینے پر قادر ہو گئے تھے اور اس کے ذریعہ انھوں نے بہت ہی آباد ملک تعمیر کر لیا تھا، یہ کتنی عظیم آیت ہے کہ ایک ویران اور برباد کرنے والا عامل، عمران وآبادی کے اہم ترین عوامل میں بدل جائے۔

جب کہ زیر بحث آیت کا ظاہر یہ ہے کہ سبا ایک قوم تھی کہ جو اس علاقے میں رہتی

---

[1] بعض "سباء" کو سرزمین یمن کا اس کے کسی علاقے کا نام سمجھتے ہیں، سورہ نمل میں سلیمان وہدہد کے قصہ میں قرآن مجید کا ظاہر بھی یہی نشاندہی کرتا ہے "سبا" کسی جگہ، علاقے یا مقام کا نام ہے، جہاں پر وہ کہتا ہے کہ "میں سرزمین سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔"

[2] سورہ سبا آیت 15

تھی، کیونکہ ضمیر جمع مذکر (ھم) ان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ لیکن ان دونوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ ابتداء میں سبا کسی شخص کا نام ہو، پھر اس کے تمام بیٹے اور قوم اس نام سے موسوم ہوں اور اس کے بعد یہ نام اس سرزمین کی طرف بھی منتقل ہو گیا ہو۔

اس کے بعد قرآن اس خدائی آیت کی تفسیر کی تشریح کرتے ہوئے کہ جو قوم سباء کے اختیار میں قرار پائی تھی، اس طرح کہتا ہے: "دو بڑے باغ تھے دائیں اور بائیں طرف"

یہ دونوں باغ کوئی معمولی اور سادہ قسم کے باغ نہیں تھے، بلکہ یہ ایک عظیم نہر کے دونوں طرف باغوں کا مسلسل اور ملا ہوا سلسلہ تھا، جو اس عظیم بند کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے قوم سباء اس عظیم بند کے ذریعہ، جو انھوں نے اس علاقہ کے اہم پہاڑوں کے درمیان بنایا تھا، اس بات پر قادر ہو گئی تھی کہ ان فراواں سیلابوں کو، جو ویرانی کا سبب بنتے تھے یا کم از کم بیابانوں میں بے کار و فضول طور سے ضائع اور تلف ہو جاتے تھے، اس بند کے پیچھے ذخیرہ کر لیں، اور اس کے اندر کھڑکیاں بنا کر پانی کے اس عظیم مخزن سے استفادہ کرنے کے لئے اپنے کنٹرول میں کر لیں اور اس طرح سے وسیع و عریض زمینوں کو زیر کاشت لائیں۔

وہی سیلاب کہ جو خرابی و بربادی کا باعث بنیں، وہ اس طرح سے آبادی کا باعث بن جائیں، کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ کیا یہ خدا کی عظیم آیت اور نشانی شمار نہیں ہوتی۔؟

یہ بات تو آبادی کے لحاظ سے ہے، لیکن چونکہ لوگوں کی آبادی کافی نہیں ہے، بلکہ اہم اور بنیادی شرط امن و امان ہوتا ہے، لہٰذا مزید کہتا ہے: "ہم نے ان آبادیوں کے درمیان مناسب اور نزدیک فاصلے رکھے" (تا کہ وہ آسانی اور امن و امان کے ساتھ ایک دوسری جگہ آجا سکیں) اور ہم نے ان سے کہا: "تم ان بستیوں کے درمیان راتوں میں اور دنوں میں پورے امن و امان کے ساتھ سفر کرو، اور ان آبادیوں میں چلو پھرو۔" [1]

---

[1] سورہ سباء آیت 18

اس طرح یہ آبادیاں مناسب اور نپا تلا فاصلہ رکھتی تھیں، اور وحشی اور بیابانی درندوں، یا چوروں اور ڈاکوؤں کے حملہ کے لحاظ سے بھی انتہائی امن وامان میں تھیں، اس طرح سے کہ لوگ زادراہ، سفرخرچ اور سواری کے بغیر ہی، اس صورت میں کہ نہ اکٹھے قافلوں میں چلنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی مسلح افراد ساتھ لینے کی کوئی احتیاج تھی، راستے کی بے امنی کی جہت سے، یا پانی اور غذا کی کمی کی وجہ سے کسی ڈر اور خوف کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ہم نے ان سے کہا کہ اپنے پروردگار کی فراواں روزی میں سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ ایک پاک و پاکیزہ شہر ہے اور پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس چھوٹے سے جملے نے تمام مادی ومعنوی نعمتوں کے مجموعے کو زیباترین شکل میں منعکس کر دیا ہے، مادی نعمتوں کے لحاظ سے تو وہ پاک و پاکیزہ زمین رکھتے تھے کہ جو چوروں، ظالموں، آفات وبلیات، خشک سالی وقحط اور بدامنی ووحشت جیسے طرح طرح کے مصائب سے پاک تھی، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمین موذی حشرات سے بھی پاک و پاکیزہ تھی، پاک و پاکیزہ ہوائیں چلتی تھیں اور فرحت بخش نسیم رواں دواں تھی، زمین زرخیز تھی اور درخت پربار تھے۔

اور معنوی نعمت کے لحاظ سے خدا کی بخشش وغفران ان کے شامل حال تھی، وہ ان کی تقصیر وکوتاہی پر صرف نظر کرتا تھا اور انہیں مشمول عذاب اور ان کی سرزمین کو بلا ومصیبت میں گرفتار نہیں کرتا تھا۔

لیکن ان ناشکرے لوگوں نے ان تمام نعمتوں کی قدردانی نہیں کی اور آزمائش کی بھٹی سے صحیح وسالم باہر نہ آسکے، انھوں نے کفران نعمت اور روگردانی کی راہ اختیار کر لی لہٰذا خدا نے بھی ان کی سختی کے ساتھ گوشمالی کی۔

اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: ''وہ خدا سے روگرداں ہو گئے۔'' [1]

یہ وہ موقع تھا کہ عذاب کا کوڑا ان کے پیکر پر آ کر پڑا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''ہم نے بنیادوں کو اکھاڑ کر پھینک دینے والا وحشت ناک سیلاب ان کے پاس بھیجا'' اور ان کی آباد سرزمین ایک ویرانے میں بدل گئی۔

اس کے بعد قرآن اس سرزمین کی باقی ماندہ حالت وکیفیت کی اس طرح سے توصیف کرتا ہے: ''ہم نے ان کے دو وسیع اور پر نعمت باغوں کو، بے قدر و قیمت کڑوے پھلوں والے، اور جھاؤ کے بے مصرف درختوں اور تھوڑے سے بیری کے درختوں میں بدل دیا۔''

اور اس طرح سے ان تمام سرسبز وشاداب درختوں کے بجائے، بہت ہی کم قدر و قیمت والے بیابانی اور جنگلی قسم کے چند ایک درخت، کہ شاید ان میں سے سب سے زیادہ اہم درخت وہی بیری کے درخت تھے، کہ وہ بھی تھوڑی سی ہی مقدار میں، باقی رہ گئے تھے، (اب تم اس کی اس مجمل داستان کو پڑھنے کے بعد خود ہی ان کی مفصل داستان کا اندازہ لگا لو، کہ خود ان کے اوپر اور ان کی آباد سرزمین پر کیا گزری؟)

ممکن ہے کہ ان تین قسم کے درختوں کا بیان ہے کہ جو اس سرزمین میں باقی رہ گئے تھے، (درختوں کے) تین مختلف گروہوں کی طرف اشارہ ہو، کہ ان درختوں میں سے ایک حصہ نقصان دہ تھا، بعض بے مصرف تھے۔ اور بعض بہت ہی کم نفع دینے والے تھے۔

ہم نے انہیں اس طرح منتشر کیا کہ ضرب المثل بن گئے

کس قدر عمدہ تعبیر ہے قرآن اس جملہ کے بعد، کہ جو ان کے دردناک انجام کے بارے میں بیان کیا ہے، کہتا ہے: ''ہم نے انہیں ایسی سزا دی اور ان کی زندگی لپیٹ کر رکھ دیا

---

[1] سورہ سبا، آیت 16

کہ: انہیں ہم نے دوسروں کے لئے داستان اور افسانہ بنا دیا۔" [1]

ہاں ان کی تمام تر بارونق زندگی اور درخشاں و وسیع تمدن میں سے زبانی قصوں، دلوں کی یادوں اور تاریخوں کے صفحات پر چند سطروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا: "اور ہم نے انہیں بری طرح سے حیران و پریشان کر دیا۔" [2]

ان کی سرزمین ایسی ویران ہوئی کہ ان میں وہاں قیام کرنے کی طاقت نہ رہی، اور زندگی کو باقی رکھنے کے لئے وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ان میں سے ہر گروہ کسی طرف رخ کرے اور خزاں کے پتوں کی طرح، کہ جو تند و تیز ہواؤں کے اندر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں، ہر ایک کسی گوشہ میں جا گرے، اس طرح سے کہ ان کی پریشانی ضرب المثل بن گئی، کہ جب بھی لوگ یہ کہنا چاہتے کہ فلاں جمعیت سخت پراگندہ اور تتر بتر ہو گئی تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ: (وہ قوم سبا اور ان کی نعمتوں کی طرح پراگندہ ہو گئے ہیں)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق قبیلہ "غسان" شام کی طرف گیا اور "اسد" عمان کی طرف، "خزاعہ" تہامہ کی طرف، اور قبیلہ "انمار" یثرب کی طرف۔

اور آخر میں فرماتا ہے: "یقیناً اس سرگزشت میں، صبر اور شکر کرنے والوں کے لئے عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں۔" [3]

دو دوست یا دو برادر

قرآن میں دو دوست یا دو بھائی کی داستان مثال کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ ان میں

---

[1] سورہ سبا، آیت 9

[2] سورہ سبا، آیت 9

[3] سورہ سبا، آیت 19

سے ہر ایک مستکبرین اور مستضعفین کا ایک نمونہ تھا۔ ان کی طرز فکر اور ان کی گفتار و کردار ان دونوں گروہوں کے موقف کا ترجمان تھے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: ''اے رسول ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کرو کہ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے۔ جو طرح طرح کے انگور تھے۔ ان کے گرد اگرد کھجور کے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان دونوں باغوں کے درمیان ہری بھری کھیتی تھی''۔ [1]

ایسے باغ اور کھیتیاں جن میں ہر چیز خوب تھی۔ انگور بھی تھے، کھجوریں بھی تھیں، گندم اور دوسرا اناج بھی تھا۔ خود کفیل کھیتیاں تھیں۔ یہ دونوں باغ پیداوار کے لحاظ سے بھرے پڑے تھے۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور کھیتیوں کے پودے خوب خوشہ دار تھے۔ ان دونوں باغوں میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ [2]

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پانی جو ہر چیز کے لئے مایہ حیات ہے، خصوصاً باغات و زراعت کے لئے، انہیں فراہم تھا: ''کیونکہ دونوں باغوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی تھی''۔ [3]

''اس طرح سے ان باغات اور کھیتیوں کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی''۔ [4]

دنیا کا مقصد پورا ہو رہا ہو اور تو کم ظرف اور بے وقعت انسان اپنی دنیاوی مراد پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ پہلے وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ باغات کے اس مالک نے بھی اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کہا: ''میں دولت اور سرمائے کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں، میری آبرو، عزت اور حیثیت تجھ

[1] سورہ کہف آیت 32
[2] سورہ کہف آیت 32
[3] سورہ کہف آیت 33
[4] سورہ کہف آیت 33

سے زیادہ ہے"۔ [۱]

اور افرادی قوت بھی میرے پاس بہت زیادہ ہے۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ میرا زیادہ ہے۔ معاشرے میں میری حیثیت زیادہ ہے۔ تو میرے مقابلے میں کیا ہے اور تو کس کھاتے میں ہے؟

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بڑھتے چلے گئے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ دنیا کو جاوداں، مال و دولت کو ابدی اور مقام و حشمت کو دائمی خیال کرنے لگا۔" وہ مغرور تھا حالانکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ ایسے میں اپنے باغ میں داخل ہوا اس نے ایک نگاہ سر سبز درختوں پر ڈالی جن کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے خم ہو گئی تھیں۔ اس نے اناج کی ڈالیوں کو دیکھا، نہر کے آب رواں کی لہروں پر نظر کی کہ جو چلتے چلتے درختوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور کہنے لگا میرا خیال نہیں ہے کہ میرا باغ کبھی اجڑے گا"۔ [۲]

پھر اس نے اس سے بھی آگے کی بات کی۔ اس جہان کا دائمی ہونا چونکہ عقیدہ قیامت کے منافی ہے لہٰذا وہ انکار قیامت کا سوچنے لگا۔ اس نے کہا: میرا ہرگز نہیں خیال کہ کوئی قیامت بھی ہے۔ [۳]

پھر مزید کہنے لگا: فرض کیا جائے کہ قیامت ہو بھی" اور میں اپنی اس حیثیت اور مقام کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاؤں بھی تو یقیناً اس سے بہتر جگہ پاؤں گا"۔ [۴]

وہ ان خام خیالوں میں غرق تھا اور ایک کے بعد دوسری فضول بات کرتا جاتا تھا۔

[۱] سورہ کہف آیت 34

[۲] سورہ کہف آیت 34

[۳] سورہ کہف آیت 35

[۴] سورہ کہف آیت 36

مستضعفین کا جواب

قرآن میں اس مغرور، بے ایمان، خود غرض دولت مند کی بے بنیاد باتوں کا جواب اس کے مومن دوست کی زبانی دیا گیا ہے۔ پہلے وہ خاموشی سے اس کوتاہ فکر انسان کی باتیں سنتا رہا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر آجائے اور پھر ایک ہی بار اسے جواب دیا جائے۔ "اس نے کہا: کیا تو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا"۔ [1]

اس کے بعد اس با ایمان شخص نے اس کے کفر اور غرور کو توڑنے کے لئے کہا: "لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا پروردگار ہے، [2] اور مجھے اس عقیدے پر فخر ہے"۔

تو اس بات پر نازاں ہے کہ تیرے پاس باغات، کھیتیاں، پھل اور پانی فراواں ہیں لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، میرا خالق و رازق وہ ہے، تجھے اپنی دنیا پر فخر ہے اور مجھے اپنے عقیدہ توحید و ایمان پر، "اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا"۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ میں مغرور شخص کی جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں ان میں وجود خدا کا صریح انکار تو موجود نہیں ہے جبکہ ایک توحید پرست شخص اسے جو جواب دے رہا ہے بظاہر اس سے پہلے اسے انکار خدا پر سرزنش کر رہا ہے اور اسے تخلیق انسان کے حوالے سے خدائے عالم و قادر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کیونکہ تخلیق انسان دلائل توحید میں سے بہت واضح دلیل ہے۔

مفسرین نے مذکورہ سوال کے جواب میں مختلف تفسیریں پیش کی ہیں، مثلاً:

---

[1] سورہ کہف آیت 36

[2] سورہ کہف آیت 37

1۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس مغرور شخص نے صراحت کے ساتھ معاد اور قیامت کا انکار کیا ہے یا پھر اسے شک کی نظر سے دیکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ انکار خدا ہے کیونکہ معاد جسمانی کے منکر در حقیقت قدرت خدا کے منکر ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں کہ منتشر ہو جانے کے بعد مٹی پھر سے لباس حیات پہن سکے گی۔

2۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے شرک اور کفر کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مالکیت خود اس کی اپنی طرف سے ہے۔ یعنی وہ اپنے لئے مالکیت کا قائل تھا اور اپنی مالکیت کو جاودانی خیال کرتا تھا۔

3۔ تیسرا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، وہ یہ کہ اس نے اپنی کچھ باتوں میں خدا کا انکار کیا تھا اور اللہ تعالی نے اس کی ساری باتیں بیان نہیں کیں۔ اس کا اندازہ اس باایمان شخص کی باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

توحید اور شرک کا مسئلہ انسان کی سرنوشت میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ پھر اس کے بارے میں گفتگو آگے بڑھائی اور اس کی ملامت کرتے ہوئے کہا: "جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے"۔ [1] تو نے اسے اللہ کی جانب سے کیوں نہیں جانا اور اس کا شکر کیوں نہیں بجالایا۔ "تو نے کیوں نہیں کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی کچھ طاقت نہیں"۔ [2]

اگر تو نے زمین میں ہل چلایا ہے، بیج بویا ہے، درخت لگائے ہیں، قلمیں لگائی ہیں اور تجھے ہر موقع پر سب کچھ میسر آیا ہے یہاں تک کہ تو اس مقام پر پہنچا ہے تو سب اللہ کی قدرت سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام وسائل اور صلاحیتیں تجھے اللہ نے بخشی ہیں، اپنی طرف سے تو کچھ بھی تیرے پاس نہیں ہے اور اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اس نے

[1] سورہ کہف آیت 38

[2] سورہ کہف آیت 38

مزید کہا: "یہ جو تجھے نظر آتا ہے کہ میں مال واولاد کے لحاظ سے تجھ سے کم ہوں (یہ کوئی اہم بات نہیں ہے)۔ اللہ تیرے باغ کی نسبت مجھے بہتر عطا کر سکتا ہے"۔ [1]

"بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا آسمان سے تیرے باغ پر بجلی گرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرسبز وشاداب زمین ایسے چٹیل میدان میں بدل جائے کہ جہاں پاؤں پھسلتے ہوں"۔ [2]

یا زمین کو حکم دے کہ وہ نگل جائیں اور "یہ چشمے اور نہریں اس کی تہہ میں ایسی چلی جائیں کہ پھر تو انہیں پا نہ سکے"۔ [3]

دراصل وہ کہتا ہے کہ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا کم از کم سنا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمان سے بجلی لحہ بھر میں باغوں، گھروں اور کھیتوں کو مٹی کے ٹیلوں یا بے آب وگیاہ زمین میں بدل کے رکھ دیتی ہے۔ نیز تو نے سنا ہے یا دیکھا ہے کبھی زمین پر ایسا زلزلہ آتا ہے کہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور نہریں نیچے چلی جاتی ہیں اسطرح سے کہ وہ قابل اصلاح بھی نہیں رہتیں۔ جب تو ان چیزوں کو جانتا ہے تو پھر یہ غرور وغفلت کس بناء پر؟ تو نے یہ منظر دیکھے ہیں تو پھر یہ دل بستگی آخر کیوں؟ تو یہ کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ نعمتیں کبھی فنا ہوں گی اور تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہیں گی۔ یہ کیسی نادانی اور حماقت ہے؟

اور یہ ان کا انجام

ان دونوں کی آپس کی گفتگو ختم ہو گئی۔ اس خدا پرست شخص کی باتوں کا اس مغرور و بے ایمان دولت مند کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے انہی جذبات اور طرز فکر کے ساتھ اپنے گھر

[1] سورہ کہف آیت 39

[2] سورہ کہف آیت 39

[3] سورہ کہف آیت 39 تا 40

لوٹ گیا۔ اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی تباہی کے لئے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ اپنے تکبر اور شرک کی سزا اسی جہان میں پالے گا اور اس کا انجام دوسروں کے لئے باعث عبرت بن جائے گا۔

شاید اس وقت کہ جب رات کی تاریکی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی، عذاب الٰہی نازل ہوا تباہ کن بجلی کی صورت میں یا وحشت ناک طوفان کی شکل میں یا ہولناک زلزلے کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اس نے چند لمحوں میں تروتازہ باغات، سر بہ فلک درخت اور خوشوں سے لدی کھیتیاں درہم برہم اور تباہ کر دیں۔ ''اور عذاب الٰہی حکم خدا سے ہر طرف سے اس کے ثمرہ پر محیط ہو گیا اور اسے نابود کر دیا''۔ [1]

دن چڑھا۔ باغ کا مالک باغ کی طرف چلا۔ سرکشی اسکے ذہن میں تھی۔ وہ اپنے باغات کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا، جب وہ باغ کے قریب پہنچا تو اچانک اس نے وحشت ناک منظر دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ وہاں بے حس وحرکت کھڑا ہو گیا۔

اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ یہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ سب درخت اوندھے پڑے تھے، کھیتیاں زیروزبر ہو چکی تھیں۔ زندگی کے کوئی آثار وہاں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا وہاں کبھی بھی شاداب وسرسبز باغ اور کھیتیاں نہ تھیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ حلق خشک ہو گیا۔ اس کے دل ودماغ سے سب غرور ونخوت جاتی رہی، اسے ایسے لگا جیسے وہ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوا ہے، ''وہ مسلسل اپنے ہاتھ مل رہا تھا، اسے ان اخراجات کا خیال آرہا تھا جو اس نے پوری زندگی میں ان پر صرف کئے تھے، اب وہ سب برباد ہو چکے تھے اور درخت اوندھے گرے پڑے تھے''۔ [2]

[1] سورہ کہف آیت 40

[2] سورہ کہف آیت 42

اس وقت وہ اپنی فضول باتوں اور بیہودہ سوچوں پر پشیمان ہوا، "وہ کہتا تھا: کاش میں نے کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ قرار دیا ہوتا، اے کاش میں نے شرک کی راہ پر قدم نہ رکھا ہوتا"۔ [1]

زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام مصائب و آلام کے سامنے وہ تن تنہا کھڑا تھا "خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا کہ جو اس مصیبت عظیم اور اتنے بڑے نقصان پر اس کی مدد کرتا۔" [2] اور چونکہ اس کا سارا سرمایہ تو یہی تھا جو برباد ہو گیا، اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ لہٰذا "وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔" [3]

درحقیقت اس واقعے نے اس کے تمام غرور آمیز تصورات و خیالات کو زمین بوس اور باطل کر دیا، کبھی تو وہ کہتا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم دولت و سرمایہ کبھی فنا ہو گا لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کی تباہی دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ اپنے خدا پرست اور باایمان دوست کے سامنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ قوی ہوں، میرے مددگار زیادہ ہیں لیکن اس واقعے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔ اسے کبھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بہت قوت ہے لیکن جب یہ واقعہ رونما ہوا اور اس نے دیکھا کہ کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اس نقصان کے کچھ حصے کی بھی تلافی کر سکے۔

---

[1] سورہ کہف آیت 42

[2] سورہ کہف آیت 42

[3] سورہ کہف آیت 43

برصیصائے عابد

بنی اسرائیل میں ایک نامی گرامی عابد تھا جس کا نام "برصیصا" تھا۔ [1]
جس نے طویل عرصہ تک عبادت پروردگار کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جان بلب مریضوں کو اس کے پاس لاتے تھے اور اس کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ صحت وسلامتی میسر ہو جاتی تھی ایک دن ایک معقول گھرانے کی عورت کو اس کے بھائی اس کے پاس لائے اور طے پایا کہ کچھ عرصہ تک وہ عورت وہیں رہے تا کہ اس کو شفا حاصل ہو۔

اب شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس قدر اس کو اپنے دام میں اسیر کیا کہ اس عابد نے عورت کے ساتھ زیادتی کی اور کچھ دنوں بعد یہ بات کھل گئی کہ وہ عورت حاملہ ہے (کیونکہ ہمیشہ ایک گناہ عظیم تر گناہوں کا سرچشمہ بنتا ہے) اس نے عورت کو قتل کر دیا اور بیابان کے ایک گوشہ میں دفن کر دیا۔ اس عورت کے بھائی اس واقعہ سے باخبر ہوئے کہ مرد عابد نے اس قسم کے ظلم عظیم کا اقدام کیا ہے۔

یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی، یہاں تک کہ امیر شہر کے کانوں تک جا پہنچی، وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلا تا کہ حقیقت حال سے باخبر ہو، جس وقت وہ ظلم ثابت ہو گیا تو اس کو اس کی عبادت گاہ سے کھینچ کر باہر لے آئے، اقرار گناہ کے بعد حکم دیا گیا کہ اسے سولی پر چڑھا دیا جائے جس وقت وہ سولی پر چڑھا دیا جانے لگا تو شیطان اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا وہ میں تھا جس نے تجھے اس مصیبت میں پھنسایا، اب اگر جو کچھ میں کہوں وہ مان لے تو میں تیری نجات کا سامان

فراہم کرتا ہوں، عابد نے کہا میں کیا کروں، اس نے کہا میرے لئے تیرا صرف ایک سجدہ کافی ہے۔

عابد نے کہا جس حالت میں تو مجھے دیکھ رہا ہے اس میں سجدہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے، شیطان نے کہا: اشارہ ہی کافی ہے، عابد نے گوشہ چشم یا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرح شیطان کی بارگاہ میں سجدہ بجالایا اور اسی وقت مر گیا اور دنیا سے کافر گیا۔

انسانوں کو جلا دینے والی بھٹیاں

قرآن سورہ بروج میں فرماتا ہے: موت اور عذاب ہو تشدد کرنے والوں پر۔ وہی خندقیں جو آگ اور لکڑیوں سے پر تھیں جن میں سے بڑے بڑے شعلے نکل رہے تھے۔ جس وقت وہ اس آگ کی خندق کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (سرد مہری سے) اور جو کچھ وہ مومنین کے بارے میں انجام دے رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے۔ [1]

''اخدود'' عظیم گڑھے اور خندق کے معنی میں ہے اور یہاں بڑی بڑی خندقیں مراد ہیں جو آگ سے پر تھیں تا کہ تشدد کرنے والے اس میں مومنین کو پھینک کر جلائیں۔

یہ واقعہ کس قوم سے متعلق ہے اور کس وقت معرض وجود میں آیا اور کیا یہ ایک خاص معین و مقرر واقعہ تھا، یا دنیا کے مختلف علاقوں کے اسی قسم کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین و مؤرخین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سرزمین یمن کے ''قبیلہ حمیر'' کے ''ذونواس'' نامی بادشاہ کے دور کا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ذونواس، جو حمیر نامی قبیلہ سے متعلق تھا یہودی ہو گیا اس کے ساتھ ہی اس کا پورا قبیلہ بھی یہودی ہو گیا، اس نے اپنا نام یوسف رکھا، ایک عرصہ تک یہی صورت حال رہی، ایک وقت ایسا آیا کہ کسی نے اسے خبر دی کہ سرزمین نجران (یمن کا شمالی حصہ) میں

---

[1] اس واقعہ کو بعض مفسرین نے سورہ حشر 16، 17 کے ذیل میں بیان کیا ہے

ابھی تک ایک گروہ نصرانی مذہب پر قائم ہے ذونواس کے ہم مسلک لوگوں نے اسے اس بات پر ابھارا کہ اہل نجران کو دین یہود کے قبول کرنے پر مجبور کرے۔

وہ نجران کی طرف روانہ ہوگیا، وہاں پہنچ کر اس نے وہاں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا اور دین یہود ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے اصرار کیا کہ وہ اس دین کو قبول کریں، لیکن انھوں نے انکار کیا اور شہادت قبول کرنے پر تیار ہو گئے، انھوں نے اپنے دین کو خیر باد نہ کہا، ذونواس اور اس کے ساتھیوں نے ایک گروہ کو پکڑ کر اسے آگ میں زندہ جلایا اور ایک گروہ کو تلوار کے گھاٹ اتارا، اس طرح آگ میں جلنے والوں اور مقتولین کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سلسلہ دار و گیر سے بچ کر نصاری بنی نجران کا ایک آدمی قیصر روم کے دربار میں جا پہنچا، اس نے وہاں ذوانواس کی شکایت کی اور اس سے مدد طلب کی، قیصر روم نے کہا تمہاری سرزمین مجھ سے دور ہے، میں بادشاہ حبشہ کو خط لکھتا ہوں جو عیسائی ہے اور تمہارا ہمسایہ ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کرے۔

پھر اس نے خط لکھا اور حبشہ کے بادشاہ سے نصاری نجران کے عیسائیوں کے خون کا انتقام لینے کی خواہش کی، وہ نجرانی شخص بادشاہ حبشہ نجاشی کے پاس گیا، نجاشی اس سے یہ تمام ماجرا سن کر بہت متاثر ہوا اور سرزمین نجران میں شعلہ دین مسیح کے خاموش ہوجانے کا اسے بہت افسوس ہوا، اس نے ذونواس سے شہیدوں کے خون کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

اس مقصد کے پیش نظر حبشہ کی فوج یمن کی طرف روانہ ہوئی اور ایک گھمسان جنگ کے نتیجے میں اس نے ذونواس کو شکست فاش دی اور ان میں سے بہت سے افراد کو قتل کیا، جلد ہی نجران کی حکومت نجاشی کے قبضہ میں آگئی اور نجران حبشہ کا ایک صوبہ بن گیا۔

بعض مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس خندق کا طول چالیس ذراع (ہاتھ) تھا اور اس کا عرض بارہ ذراع تھا۔[1]

---

[1] ایک ذراع تقریباً آدھا میٹر ہے اور بعض اوقات گز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو تقریباً ایک میٹر ہے۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سات گڑھے تھے جن میں سے ہر ایک کی وسعت اتنی ہی تھی جتنی اوپر بیان ہوئی۔

جو کچھ ہم نے تحریر کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ تشدد کرنے والے بے رحم افراد آخر کار عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور ان سے اس خون ناحق کا انتقام دنیا ہی میں لیا گیا اور عاقبت کا عذاب جہنم ابھی ان کے انتظار میں ہے۔

انسانوں کو جلانے والی یہ بھٹیاں جو یہودیوں کے ہاتھ سے معرض وجود میں آئیں، احتمال اس امر کا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلی آدم سوز بھٹیاں تھیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی قسم کی قساوت اور بے رحمی کا خود یہودی بھی شکار ہوئے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ ''ہٹلر'' کے حکم سے آدم سوز بھٹیوں میں جلائے گئے اور اس جہان میں بھی عذاب حریق کا شکار ہوئے۔

علاوہ ازیں ''ذونواس یہودی'' جو اس منحوس اقدام کا بانی تھا، وہ بھی بد اعمالی کے انجام سے نہ بچ سکا، جو کچھ اصحاب اخدود کے بارے میں درج کیا گیا ہے یہ مشہور و معروف نظریات کے مطابق ہے۔ [1]

اس ضمن میں کچھ اور روایات بھی موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اصحاب اخدود صرف یمن میں ذونواس ہی کے زمانے میں نہیں تھے۔

بعض مفسرین نے تو ان کے بارے میں دس قول نقل کیے ہیں۔

ایک روایت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا ہے ''وہ اہل

---

[1] مندرجہ بالا واقعہ تاریخ و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں درج ہے، منجملہ دیگر کتب کے عظیم مفسر طبری نے مجمع البیان میں، ابو الفتاح رازی نے اپنی تفسیر میں فخر رازی نے اپنے تفسیر کبیر میں، الوسی نے روح المعانی میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح ہشام نے اپنی سیرت (جلد اول ص 35) میں اور ایک دوسری جماعت نے اپنی کتب میں اس واقعہ کو تحریر کیا ہے۔

کتاب مجوسی تھے جو اپنی کتاب پر عمل کرتے تھے، ان کے بادشاہوں میں سے ایک نے اپنی بہن سے مباشرت کی اور خواہش ظاہر کی کہ بہن سے شادی کو جائز قرار دے، لیکن لوگوں نے قبول نہیں کیا، بادشاہ نے ایسے بہت سے مومنین کو جنھوں نے یہ بات قبول نہیں کی تھی جلتی ہوئی آگ کی خندق میں ڈلوادیا۔"

یہ فارس کے اصحاب الاخدود کے بارے میں ہے، شام کے اصحاب الاخدود کے بارے میں بھی علماء نے لکھا ہے کہ وہاں مومنین رہتے تھے اور "انتیا خوس" نے انھیں خندق میں جلوایا تھا۔

بعض مفسرین نے اس وقعہ کو بنی اسرائیل کے مشہور پیغبر حضرت دانیال علیہ السلام کے اصحاب و انصار کے ساتھ مربوط سمجھا ہے جس کی طرف توریت کی کتاب دانیال میں اشارہ ہوا ہے اور ثعلبی نے بھی اخدود فارسی کو انھی پر منطبق کیا ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ اصحاب اخدود میں یہ سب کچھ اور ان جیسے دوسرے لوگ شامل ہوں اگر چہ اس کا مشہور معروف، مصداق سرزمین یمن کا ذونواس ہی ہے۔

بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا

بیٹیوں کا زندہ درگور کرنے کی داستان بڑی ہی دردناک ہے ان واقعات پر نظر پڑے تو حالت غیر ہو جاتی ہے۔

ایک شخص پیغبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسلام قبول کر لیا، سچا اسلام۔

ایک روز وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا: اگر میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا تواب ورحیم ہے۔

اس نے عرض کیا: یارسول اللہ میرا گناہ بہت ہی بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، تیرا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو خدا کی بخشش سے بڑا تو نہیں؟ وہ کہنے لگا: اب جب کہ آپ یہ کہتے ہیں تو میں عرض کروں: زمانہ جاہلیت میں میں ایک دور دراز کے سفر پر گیا ہوا تھا ان دنوں میری بیوی حاملہ تھی میں چار سال بعد گھر واپس لوٹا، میری بیوی نے میرا استقبال کیا میں گھر آیا تو مجھے ایک بچی نظر آئی میں نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے؟ اس نے کہا: ایک ہمسایے کی لڑکی ہے، میں نے سوچا گھنٹے بھر تک اپنے گھر چلی جائے گی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہ گئی، مجھے علم نہ تھا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اس کی ماں حقیقت کو چھپا رہی ہے کہ کہیں یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آخر کار میں نے بیوی سے کہا: سچ بتاؤ یہ کس کی لڑکی ہے؟ بیوی نے جواب دیا: جب تم سفر پر گئے تھے تو میں امید سے تھی بعد میں یہ بچی پیدا ہوئی، یہ تمہاری ہی بچی ہے۔

اس شخص نے مزید کہا: میں نے وہ رات بڑی پریشانی کے عالم میں گزاری کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں بیدار ہو جاتا، صبح قریب تھی، میں بستر سے نکلا، لڑکی کے بستر کے پاس گیا وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی، میں نے اسے بستر سے نکالا، اسے جگایا، اس سے کہا: میرے ساتھ نخلستان کی طرف چلو۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی یہاں تک کہ ہم نخلستان میں پہنچ گئے میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا وہ میری مدد کر رہی تھی میرے ساتھ مل کر مٹی باہر پھینکتی تھی گڑھا مکمل ہو گیا میں نے اسے بغل کے نیچے سے پکڑ کر اس گڑھے کے درمیان دے مارا۔

اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس نے مزید بتایا: میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تا کہ وہ باہر نہ نکل سکے دائیں ہاتھ سے میں اس پر مٹی ڈالنے لگا اس نے بہت ہاتھ پاوں مارے، بڑی مظلومانہ فریاد کی: وہ کہتی تھی ابو جان آپ مجھ سے یہ سلوک کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: میں اس پر مٹی ڈال رہا تھا کہ کچھ مٹی میری داڑھی پر آپڑی بچی نے ہاتھ بڑھایا اور میرے چہرے سے مٹی صاف کی لیکن میں اسی قساوت اور سنگدلی سے اس کے منہ پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اس کے نالہ وفریاد کی آخری آواز بہ خاک دم توڑ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داستان بڑے غم کے عالم میں سنی، وہ بہت دکھی اور پریشان تھے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے جارہے تھے۔ اپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر رحمت خدا کو اس کے غضب پر سبقت نہ ہوتی تو ضروری تھا کہ جتنا جلدی ہوتا وہ تجھ سے انتقام لیتا[1]۔

میں نے اپنی بارہ بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے

"قیس بن عاصم" ابن تمیم کے سرداروں میں سے تھا، ظہور رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اسلام لے آیا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ چاہتا تھا کہ جو سنگین بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے اسے کچھ ہلکا کرے، اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

گزشتہ زمانے میں بعض باپ ایسے بھی تھے جنھوں نے جہالت کے باعث اپنی بے گناہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا میری بھی بارہ بیٹیاں ہوئیں میں نے سب کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیا لیکن جب میرے یہاں تیرھویں بچی ہوئی بیوی نے اسے مخفی طور پر جنم دیا اس نے یہ ظاہر کیا کہ نومولود مردہ پیدا ہوئی ہے، لیکن اسے چپ چھپا کر اپنے قبیلے والوں کے یہاں بھیج دیا

---

[1] سورہ نحل آیت 58، 59

اس وقت تو میں مطمئن ہو گیا لیکن بعد میں مجھے اس ماجرے کا علم ہو گیا میں نے اسے حاصل کیا اور اپنے ساتھ ایک جگہ لے گیا۔ اس نے بہت آہ و زاری کی، میری منتیں کیں، گریہ و بکا کی مگر میں نے پرواہ نہ کی اور اسے زندہ در گور کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ واقعہ سنا تو بہت ناراحت ہوئے، آپ کی آنکھوں سے انسو جاری تھے کہ آپ نے فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اس پر رحم نہیں کھایا جائے گا۔

اس کے بعد آپ نے قیس کی طرف رخ کیا اور یوں گویا ہوئے: تمہیں سخت ترین دن درپیش ہے۔

قیس نے عرض کیا: میں کیا کروں کہ اس گناہ کا بوجھ میرے کندھے سے ہلکا ہو جائے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے جتنی بیٹیوں کو قتل کیا ہے اتنے غلام آزاد کر (کہ شاید تیرے گناہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے)۔

نیز مشہور شاعر فرزدق کے دادا "صعصعہ بن ناجیہ" کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ حریت فکر رکھنے والا ایک شریف انسان تھا زمانہ جاہلیت میں وہ لوگوں کی بہت سی بری عادات کے خلاف جد وجہد کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے 360 لڑکیاں ان کے والدوں سے خرید کر انہیں موت سے نجات بخشی، ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک باپ اپنی نومولود بیٹی کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے، اس بچی کی نجات کے لئے اس نے اپنی سواری کا گھوڑا تک اور دو اونٹ اس کے باپ کو دے دیئے اور اس بچی کو نجات دلائی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے اور تیری جزا اللہ کے یہاں محفوظ ہے۔ [1]

---

[1] فرزدق نے اپنے دادا کے اس کام پر فخر کرتے ہوئے کہا:

ترجمہ شعر: "اور وہ شخص ہمارے خاندان سے تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے خلاف قیام کیا، اس نے لڑکیوں کو لے لیا اور انہیں زندگی عطا کی اور انہیں تہ خاک دفن نہ ہونے دیا۔"

اصحاب فیل

مفسرین اور مؤرخین نے اس داستان کو مختلف صورتوں میں نقل کیا ہے اور اس کے وقوع کے سال میں بھی اختلاف ہے لیکن اصل داستان ایسی مشہور ہے کہ یہ اخبار متواتر میں شمار ہوتی ہے اور ہم اسے مشہور روایات کے مطابق ''سیرۃ ابن ہشام'' و ''بلوغ الارب'' و ''بحار الانوار'' اور ''مجمع البیان'' سے خلاصہ کر کے نقل کرتے ہیں۔

یمن کے بادشاہ ''ذونواس'' نے نجران کے عیسائیوں کو جو اس سرزمین کے نزدیک بستے تھے، اس لئے بہت تنگ کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دین مسیحیت چھوڑ دیں۔ (قرآن نے اس واقعہ کو سورہ ''بروج'' میں ''اصحاب الاخدود'' کے عنوان سے بیان کیا ہے۔)

اس عظیم جرم کے بعد ''دوس'' نامی ایک شخص ان میں سے اپنی جان بچا کر نکل گیا اور وہ قیصر روم کے پاس، جو مسیحیت پر تھا جا پہنچا اور اس کے سامنے یہ سارا ماجرا بیان کیا۔

چونکہ ''روم'' اور ''یمن'' کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا لہٰذا اس نے حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' کو خط لکھا کہ وہ ''ذونواس'' سے نصارائے نجران کا انتقام لے، اور اس خط کو اسی شخص کے ہاتھ ''نجاشی'' کے پاس روانہ کیا۔

''نجاشی'' نے ایک بہت بڑا لشکر جو ستر ہزار افراد سے زیادہ پر مشتمل تھا ''ارياط'' نامی شخص کے کمان میں یمن کی طرف روانہ کیا۔ ''ابرہہ'' بھی اس لشکر کے افسروں میں سے ایک تھا۔

''ذونواس'' کو شکست ہوئی، اور ''ارياط'' یمن کا حکمران ہوگیا۔ کچھ مدت کے

بعد "ابرہہ" نے اریاط کے خلاف بغاوت کردی اور اس کا خاتمہ کرنے کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس واقعہ کی خبر نجاشی کو پہنچی تو اس نے "ابرہہ" کی سرکوبی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ابرہہ نے اپنی نجات کے لئے اپنے سر کے بال منڈوا کر یمن کی کچھ مٹی کے ساتھ مکمل تسلیم کی نشانی کے طور پر نجاشی کے پاس بھیج دیئے، اور وفاداری کا اعلان کیا۔ نجاشی نے جب یہ دیکھا تو ابرہہ کو معاف کردیا، اور اسے اس کے منصب پر برقرار رکھا۔

ابرہہ نے بہت بڑا گرجا گھر تعمیر کرایا

اس موقع پر "ابرہہ" نے اپنے حسن خدمت کو ثابت کرنے کے لئے ایک اہم اور بہت ہی خوبصورت گرجا گھر تعمیر کرایا۔ جس کی اس زمانے میں کرہ ارض پر کوئی مثل ونظیر نہ تھی۔ اور اس کے بعد جزیرہ عرب کے لوگوں کو خانہ کعبہ کے بجائے اس گرجے کی طرف دعوت دینے کا مصمم ارادہ کرلیا، اور یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ اس جگہ کو عرب کے حج کا مرکز بنا کر مکہ کی اہم مرکزیت کو وہاں منتقل کردے۔

اس مقصد کے لئے اس نے ہر طرف عرب کے قبائل اور سرزمین حجاز میں بہت سے مبلغ بھیجے۔ عربوں نے، جو مکہ اور کعبہ کے ساتھ شدید لگاؤ رکھتے تھے اور اسے ابراہیم علیہ السلام کے آثار میں سے جانتے تھے، اس سے خطرہ محسوس کیا۔ بعض روایات کے مطابق ایک گروہ نے وہاں جا کر مخفی طور پر اس گرجے کو آگ لگادی، اور دوسری روایت کے مطابق بعض نے اسے مخفی طور پر گندہ اور ملوث کردیا۔ اور اس طرح سے انہوں نے اس عظیم دعوت کے مقابلہ میں شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا، اور "ابرہہ" کے عبادت خانے کو بے اعتبار اور حقیر بنادیا۔

ابرہہ حملہ کے لئے تیار

ظاہر ہے اس پر "ابرہہ" کو بہت غصہ آیا اور اس نے خانہ کعبہ کو کلی طور پر ویران کرنے

کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اس کا خیال تھا اس طرح وہ انتقام بھی لے لے گا اور عربوں کو نئے معبد کی طرف متوجہ بھی کردے گا۔ چنانچہ وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ، جن میں سے کچھ لوگ ہاتھیوں پر سوار تھے، مکہ کی طرف روانہ ہوا۔

جب وہ مکہ کے قریب پہنچا تو اس نے کچھ لوگوں کو مکہ والوں کے اونٹ اور دوسرے اموال لوٹنے کے لئے بھیجا۔ ان میں سے دوسو اونٹ عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے بھی لوٹ لئے گئے۔

''ابرہہ'' نے کسی آدمی کو مکہ کے اندر بھیجا اور اس سے کہا کہ رئیس مکہ کو تلاش کر کے اس سے کہنا کہ ''ابرہہ'' یمن کا بادشاہ کہتا ہے کہ: میں جنگ کرنے کے لئے نہیں آیا۔ میں تو صرف اس لئے آیا ہوں کہ اس خانہ کعبہ کو ویران کردوں۔ اگر تم جنگ نہ کرو تو مجھے تمہارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اونٹوں کا مالک ہوں

''ابرہہ'' کا قاصد مکہ میں داخل ہوا اور رئیس و شریف مکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ سب نے ''عبدالمطلب رضی اللہ عنہ'' کی طرف راہنمائی کی۔ اس نے عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے سامنے ماجرا بیان کیا۔ عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے بھی یہی جواب دیا کہ: ہم میں تم سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، رہا خانہ کعبہ تو خدا خود اس کی حفاظت کرے گا۔

''ابرہہ'' کے قاصد نے عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ اس کے پاس چلنا پڑے گا۔ جب عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اس کے دربار میں داخل ہوئے تو وہ آپ کے بلند قد، حسین چہرے اور حد سے زیادہ رعب اور دبدبہ کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا، یہاں تک کہ ''ابرہہ'' ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور زمین پر بیٹھ گیا اور عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھائے۔ اس کے بعد اس نے اپنے

مترجم سے کہا کہ ان سے پوچھ کہ ان کی کیا حاجت ہے؟

آپ نے مترجم سے کہا: میری حاجت یہ ہے کہ میرے دو سو اونٹ تیرے لشکری لوٹ کر لے گئے ہیں، تو انہیں حکم دے کہ وہ میرا مال واپس کر دیں۔

''ابرہہ'' کو ان کے اس مطالبہ پر سخت تعجب ہوا اور اس نے اپنے مترجم سے کہا: ان سے کہو: جب میں نے تمہیں دیکھا تھا، تو میرے دل میں تمہاری بہت زیادہ عظمت پیدا ہوئی تھی، لیکن جب تم نے یہ بات کہی تو میری نظر میں تمہاری توقیر گھٹ گئی۔ تم اپنے دو سو اونٹوں کے بارے میں تو بات کرتے ہو لیکن ''کعبہ'' کے بارے میں جو تمہارا اور تمہارے آباؤ واجداد کا دین ہے، اور میں اسے ویران کرنے کے لئے آیا ہوں، بالکل کوئی بات نہیں کرتے۔

عبدالمطلب علیہ السلام نے کہا: ''انا رب الابل وان للبیت رباً سیمنعه''۔

''میں اونٹوں کا مالک ہوں، اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔'' (اس بات نے ابرہہ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا)۔

عبدالمطلب علیہ السلام مکہ کی طرف آئے، اور لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو جائیں اور آپ خود ایک گروہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے پاس آئے تاکہ دعا کریں اور مدد طلب کریں۔ آپ نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر میں ہاتھ ڈال کر مشہور اشعار پڑھے:

لاهم ان المرء يمنع رحله فامنع رحالك

لايغلبن صليبهم و محالهم ابداً محالك

جروا جميع بلادهم والفيل كي يبسواعيالك

لاهم ان المرء يمنع رحله فامنع عيالك

والنصر على ال الصليب و عابديه اليوما لك

خدایا! ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے

گھر کی حفاظت فرما۔ ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی دن ان کی
صلیب اور ان کی قدرت تیری قدرتوں پر غلبہ
حاصل کرے۔ اور اپنے شہروں کی تمام توانائیاں
اور ہاتھیساتھ لے کر آئے ہیں تا کہ تیرے حرم کے
ساکنوں کو قیدی بنالیں۔

اس کے بعد عبدالمطلب علیہ السلام اطراف مکہ کے ایک درہ کی طرف آئے، قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں پناہ لی اور اپنے ایک بیٹے کو حکم دیا کہ وہ کوہ ''ابوقیس'' کے اوپر جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

آپ کا بیٹا بڑی تیزی کے ساتھ آپؑ کے پاس آیا اور کہا: بابا جان سمندر (دریائے احمر) کی طرف سے ایک سیاہ بادل آتا ہوا نظر آ رہا ہے عبدالمطلب علیہ السلام خوش ہو گئے اور پکار کر کہا: ''اے جمعیت قریش اپنے گھروں کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ خدا کی نصرت تمہاری مدد کے لئے آ رہی ہے''۔ یہ تو اس طرف کی بات تھی۔

دوسری طرف سے ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی پر سوار ہوا جس کا نام ''محمود'' تھا اس نے کثیر لشکر کے ساتھ کعبہ کو تباہ کرنے کے لئے اطراف کے پہاڑوں سے مکہ کی طرف اترا، لیکن وہ اپنے ہاتھی پر جتنا دباؤ ڈالتا تھا وہ آگے نہ بڑھتا تھا، لیکن جب وہ اس کا رخ یمن کی طرف کرتا تھا تو وہ فوراً چل پڑتا تھا۔ ابرہہ اس واقعہ سے سخت متعجب ہوا اور حیرت میں ڈوب گیا۔

اسی اثناء میں سمندر کی طرف سے غول کے غول اور جھنڈ کے جھنڈ، چھوٹے چھوٹے پرندوں کے آن پہنچے، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین تین کنکریاں تھیں، ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں، جو تقریباً چنے کے دانے کے برابر تھیں۔ انہوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر برسانی شروع کر دیں۔ یہ کنکریاں جس کسی کو لگتیں وہ ہلاک ہو جاتا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ

کنکریاں ان کے بدن پر جہاں بھی لگتی سوراخ کر دیتی تھیں، اور دوسری طرف نکل جاتی تھیں۔

اس وقت ابرہہ کے لشکر پر ایک عجیب و غریب وحشت طاری ہوگئی۔ جو زندہ بچے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، اور واپسی کے لئے یمن کی راہ پوچھتے تھے، لیکن مسلسل خزاں کے پتوں کی طرح سڑک کے بیچوں بیچ گر جاتے تھے۔

ایک پتھر خود "ابرہہ" کے آ کر لگا اور وہ زخمی ہوگیا۔ اس کو صنعا (یمن کے پائے تخت) کی طرف واپس لے گئے اور وہ وہاں جا کر ہلاک ہوگیا۔

بعض نے کہا ہے کہ چیچک کی بیماری پہلی مرتبہ عرب میں اسی سال پھیلی تھی۔

ہاتھیوں کی تعداد جو ابرہہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، بعض نے وہی "محمود" ہاتھی، بعض نے آٹھ، بعض نے دس اور بعض نے بارہ لکھی ہے۔

مشہور قول کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ کی ولادت اسی سال ہوئی اور عالم آپؐ کے نور وجود سے منور ہوگیا۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ایک رابطہ موجود تھا۔

بہر حال اس عظیم حادثہ کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھی کا سال) رکھا گیا اور یہ عربوں کی تاریخ کا مبداء قرار پایا۔

ایک بے نظیر معجزہ (اس گھر کا ایک مالک ہے)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مفصل وطولانی داستان کو چند مختصر اور چبھنے والے انتہائی فصیح و بلیغ جملوں میں بیان کر دیا ہے اور حقیقتاً ایسے نکات بیان کئے ہیں جو قرآنی اہداف، یعنی مغرور سرکشوں کو بیدار کرنے اور خدا کی عظیم قدرت کے مقابلہ میں انسان کی کمزوری دکھانے میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ماجرا اس بات کی نشانی دہی کرتا ہے کہ معجزات وخوارق عادات، بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف، لازمی نہیں ہے کہ پیغمبر یا امام ہی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔ بلکہ جن حالات میں خدا چاہے اور ضروری سمجھے انجام پا جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ خدا کی عظمت اور اس کے دین کی حقانیت سے آشنا ہو جائیں۔

یہ عجیب وغریب اعجاز آمیز اور عذاب دوسری سرکش اقوام کے عذاب کے ساتھ ایک واضح فرق رکھتا ہے کیونکہ طوفان نوح علیہ السلام کا عذاب، اور قوم لوط علیہ السلام کا زلزلہ اور سنگ باری، قوم عاد کی تیز آندھی اور قوم ثمود کا صاعقہ طبعی حوادث کا ایک سلسلہ تھے، کہ جن کا صرف ان خاص حالات میں وقوع معجزہ تھا۔

لیکن لشکر ابرہہ کی نابودی کی داستان ان سنگریزوں کے ذریعے جو چھوٹے چھوٹے پرندوں کی چونچ اور پنجوں سے گرتے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو طبعی حوادث سے مشابہ ہو۔

ان چھوٹے چھوٹے پرندوں کا اٹھنا، اسی خاص لشکر کی طرف آنا، اپنے ساتھ کنکریوں کا لانا، خاص طور سے انہی کو نشانہ بنانا اور ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ایک عظیم لشکر کے افراد کے اجسام کا ریزہ ریزہ ہو جانا، یہ سب کے سب خارق العادۃ امور ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی قدرت کے سامنے بہت ہی معمولی چیز ہے۔

وہی خدا جس نے انہی سنگ ریزوں کے اندر ایٹم کی قدرت پیدا کی ہے کہ اگر وہ آزاد ہو جائیں تو ایک عظیم تباہی پھیلا دیں۔ اس کے لئے یہ بات آسان ہے کہ ان کے اندر ایسی خاصیت پیدا کر دے کہ ابرہہ کے لشکر کے جسموں کو "**عصف ماکول**" (کھائے ہوئے بھوسے کی مانند) بنا دے۔

ہمیں بعض مصری مفسرین کی طرح اس حادثہ کی توجیہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ان کنکریوں میں وبا یا چیچک کے جراثیم تھے۔ اور اگر بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صدمہ زدہ لوگوں کے بدنوں سے چیچک میں مبتلا افراد کی طرح خون اور پیپ آتی تھی تو یہ اس بات کی

دلیل نہیں ہے کہ وہ حتمی طور پر چیچک میں مبتلا تھے۔ اسی طرح سے ہمیں اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ سنگ ریزے پسے ہوئے ایٹم تھے جن کے درمیان کی ہوا ختم ہو گئی تھی، اور وہ حد سے زیادہ سخت تھے، اس طرح سے کہ وہ جہاں بھی گرتے تھے سوراخ کر دیتے تھے۔

یہ سب کی سب ایسی توجیہات ہیں جو اس حادثہ کو طبعی بنانے کے لئے ذکر ہوئی ہیں اور ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان سنگ ریزوں میں ایسی عجیب و غریب خاصیت تھی جو جسموں کو ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی اطلاع ہمارے پاس نہیں ہے۔ بہر حال خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا۔

ایک مسلم تاریخی روئیداد

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "اصحاب فیل" کا ماجرا عربوں کے درمیان ایسا مسلم تھا کہ یہ ان کے لئے تاریخ کا آغاز قرار پایا اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، قرآن مجید نے ایک نہایت ہی عمدہ تعبیر - الم تر - (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے جو نہ تو اس زمانہ میں موجود تھے اور نہ ہی سے دیکھا تھا، جو اس ماجرے کے مسلم ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ کے سامنے ان آیات کی تلاوت کی تو کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔ اگر یہ مطلب مشکوک ہوتا تو کم از کم کوئی اعتراض کرتا اور ان کا اعتراض ان کے باقی اعتراضوں کی طرح ہی تاریخ میں ثبت ہو جاتا۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس دین پر تھے؟

اس بات میں تو شک کی گنجائش ہی نہیں کہ بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو کسی بت کو سجدہ کیا اور نہ ہی توحید کی راہ سے سرمو انحراف کیا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس دین پر پابند تھے؟ تو اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ دین مسیح علیہ السلام پر تھے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو مستقل، قانونی اور غیر منسوخ دین تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین ہی تھا۔

بعض علماء آپ کو دین ابراہیمی پر پابند سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جناب ابراہیم علیہ السلام شیخ الانبیاء اور ابوالانبیاء تھے اور قرآن کی بعض آیات میں بھی دین اسلام کا دین ابراہیم علیہ السلام کے نام سے تعارف کروایا گیا ہے۔[1]

بعض علماء نے اس بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ یقیناً آپ کسی دین پر تو پابند تھے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کونسا دین تھا؟

اگرچہ ان احتمالات میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ پر دلیل تو ہے لیکن مسلّم کوئی بھی نہیں۔

---

[1] ملۃ ابیکم ابراھیم۔ (سورہ حج آیت 78)

البتہ ان تینوں اقوال سے ہٹ کر ایک چوتھا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ" آنحضرت ﷺ خداوند عالم کی طرف سے اپنے لئے ایک خاص پروگرام رکھتے تھے، اور اسی پر عمل پیرا تھے اور درحقیقت یہ آپ کی ذات کے لیے مخصوص ایک دین تھا، جب تک کہ اسلام نازل نہیں ہو گیا"۔

اس قول پر وہ حدیث شاہد ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے: "جس وقت سے پیغمبر ﷺ کی دودھ بڑھائی ہوئی، اللہ نے اپنے فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتے کو آپ کے ساتھ ملا دیا، جو شب و روز مکارم الاخلاق اور نیک راستوں پر آپ کو اپنے ساتھ رکھتا"۔

اس قول کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ کسی بھی تاریخ میں نہیں ملتا کہ پیغمبر اسلام ﷺ یہود یا نصاریٰ یا کسی اور مذہب کے عبادت خانوں میں عبادت کے لیے تشریف لے گئے ہوں، نہ تو کفار کے ساتھ مل کر کبھی کسی بت خانے میں گئے اور نہ ہی اہل کتاب کے ساتھ کسی عبادت خانے میں بلکہ ہمیشہ راہ توحید پر گامزن رہے اور آپ اخلاقی اصولوں اور عبادت الٰہی کے تحت پابند تھے۔

بحار الانوار میں علامہ مجلسی کے مطابق، بہت سی اسلامی روایات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ اپنی عمر کے آغاز ہی سے روح القدس کے ساتھ موید تھے اور اس تائید کے ساتھ یقیناً وہ روح القدس کی راہنمائی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔

علامہ مجلسی ذاتی طور پر اس بات کے معتقد ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ رسالت کے مرتبے پر فائز ہونے سے پہلے مقام نبوت پر فائز تھے، اور کبھی آپ ان کی آواز سنا کرتے تھے اور کبھی سچے خواب کی صورت میں آپ پر خدائی الہام ہوا کرتا تھا۔ چالیس سال کے بعد اعلان رسالت کا حکم ہوا اور اسلام و قرآن باقاعدہ طور پر آپ پر نازل ہوئے۔

علامہ مجلسی نے اپنے اس مدعا پر چھ دلائل ذکر کئے ہیں جن میں سے کچھ ان دلائل کے ساتھ ملتے جلتے اور ہم آہنگ ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

آغاز وحی

پیغمبر اکرم ﷺ کوہ حرا پر گئے ہوئے تھے کہ جبرائیل آئے اور کہا: اے محمد پڑھ: پیغمبر ﷺ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ جبرائیل نے انہیں آغوش میں لے کر دبایا اور پھر دوبارہ کہا: پڑھ، پیغمبر ﷺ نے پھر اسی جواب کو دہرایا۔ اس کے بعد جبرائیل نے پھر وہی کام کیا اور وہی جواب سنا، اور تیسری بار کہا: (اقرا باسم ربك الذی خلق)[1]

جبرائیل علیہ السلام یہ بات کہہ کر پیغمبر ﷺ کی نظروں سے غائب ہو گئے رسول خدا ﷺ جو وحی کی پہلی شعاع کو حاصل کرنے کے بعد بہت تھکے ہوئے تھے خدیجہ سلام اللہ علیہا کے پاس آئے اور فرمایا: "زملونی ودثرونی" مجھے اڑھادو اور کوئی کپڑا میرے اوپر ڈال دو تا کہ میں آرام کروں۔

"علامہ طبرسی" بھی مجمع البیان میں یہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے خدیجہ سے فرمایا: "جب میں تنہا ہوتا ہوں تو ایک آواز سن کر پریشان ہو جاتا ہوں"۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے عرض کیا: خدا آپ کے بارے میں خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہیں کرے گا کیونکہ خدا کی قسم آپ امانت کو ادا کرتے ہیں اور صلہ رحم بجالاتے ہیں اور جو بات کرتے ہیں اس میں سچ بولتے ہیں۔

"خدیجہ" سلام اللہ علیہا کہتی ہیں: اس واقعہ کے بعد ہم ورقہ بن نوفل کے پاس گئے (نوفل حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا زاد بھائی اور عرب کے علماء میں سے تھا) رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ "ورقہ" سے بیان کیا "ورقہ" نے کہا: جس وقت وہ پکارنے والا آپ کے پاس آئے تو غور سے سنو کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کے بعد مجھ سے بیان کرنا۔

---

[1] سورہ علق آیت 1

پیغمبر ﷺ نے اپنی خلوت گاہ میں سنا کہ وہ کہہ رہا ہے: اے محمد کہو:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ①

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ② الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ③ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ④ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ⑤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦

اور کہو "لا الہ الا اللہ" اس کے بعد آپ ورقہ کے پاس آئے اور اس ماجرے کو بیان کیا۔

ورقہ نے کہا: "آپ کو بشارت ہو پھر بھی آپ کو بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت ہیں اور پیغمبر مرسل ہیں۔ آج کے بعد بہت جلد ہی جہاد کے لیے مامور ہوں گے اور اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو آپ کے ساتھ مل کر جہاد کروں گا"۔

جب ورقہ دنیا سے رخصت ہو گیا تو رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "میں نے اس روحانی شخص کو بہشت (برزخی جنت) میں دیکھا ہے کہ وہ جسم پر ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی"۔ [1]

---

[1] یقینی طور پر مفسرین کے بعض کلمات یا تاریخ کی کتابوں میں پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کی اس فصل کے بارے میں ایسے ناموزوں مطالب نظر آتے ہیں جو مسلمہ طور پر جعلی و وضعی گھڑی ہوئی روایات اور اسرائیلیات سے ہیں مثلاً یہ کہ پیغمبر ﷺ نزول وحی کے پہلے واقعہ کے بعد بہت ہی ناراحت ہوئے اور ڈر گئے کہ کہیں یہ شیطانی القاآت نہ ہوں یا آپ نے کئی مرتبہ اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ خود کو پہاڑ سے گرا دیں اور اسی قسم کے فضول اور بے ہودہ باتیں جو نہ تو نبوت کے بلند مقام کے ساتھ سازگار ہیں اور نہ ہی پیغمبر ﷺ کی اس عقل اور حد سے زیادہ دانشمندی مدبریت صبر و تحمل و شکیبائی نفس پر تسلط اور اس اعتماد کو ظاہر کرتی ہیں جو تاریخوں میں ثبت ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس قسم کی ضعیف و رکیک روایات دشمنان اسلام کی ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو بھی مورد اعتراض قرار دے دیں اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی کو بھی۔

پہلا مسلمان [1]

اس سوال کے جواب میں سب نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ عورتوں میں سے جو خاتون سب سے پہلے مسلمان ہوئیں وہ جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا تھیں جو پیغمبر اکرم ﷺ کی وفادار اور فدا کار زوجہ تھیں باقی رہا مردوں میں سے تو تمام شیعہ علماء ومفسرین اور اہل سنت علماء کے ایک بہت بڑے گروہ نے کہا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مردوں میں سے دعوت پیغمبر ﷺ پر لبیک کہی علماء اہل سنت میں اس امر کی اتنی شہرت ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اس پر اجماع واتفاق کا دعویٰ کیا ہے ان میں سے حاکم نیشاپوری [2] نے کہا ہے:

مؤرخین میں اس امر پر کوئی اختلاف نہیں کہ علی ابن ابی طالب علیہما السلام اسلام لانے والے پہلے شخص ہیں۔ اختلاف اسلام قبول کرتے وقت ان کے بلوغ کے بارے میں ہے۔

جناب ابن عبدالبر (3) لکھتے ہیں: اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ خدیجہ سلام اللہ علیہا وہ پہلی خاتون ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور جو کچھ وہ لائے تھے اسی کی تصدیق کی۔ پھر حضرت علی علیہ السلام نے ان کے بعد یہی کام انجام دیا۔ [3]

ابوجعفر اسکافی معتزلی لکھتا ہے: تمام لوگوں نے یہی نقل کیا ہے کہ سبقت اسلام کا افتخار علی سے مخصوص ہے۔ [4] قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے، خود حضرت علی علیہ السلام سے اور صحابہ سے اس بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، ذیل میں چند روایات ہم نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں: پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] اس سوال کو اکثر مفسرین نے سورۂ توبہ آیت 100 'السابقون الاولون' کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

[2] مستدرک علی صحیحین کتاب معرفت ص22

[3] استیعاب، ج2 ص457

[4] العقد یر، ج3 ص237

1۔ پہلا شخص جو حوض کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچے گا وہ شخص ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور وہ علی بن ابی طالب ہے۔ [1]

2۔ علماء اہل سنت کے ایک گروہ نے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

یہ پہلا شخص ہے جو مجھ پر ایمان لایا اور پہلا شخص ہے جو قیامت میں مجھ سے مصافحہ کرے گا اور یہ "صدیق اکبر" ہے۔ [2]

3۔ ابو سعید خدری رسول اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان ہاتھ مار کر فرمایا: "اے علی! تم سات ممتاز صفات کے حامل ہو کہ جن کے بارے میں روز قیامت کوئی تم سے حجت بازی نہیں کر سکتا۔ تم وہ پہلے شخص ہو جو خدا پر ایمان لائے اور خدائی پیمانوں کے زیادہ وفادار ہو اور فرمان خدا کی اطاعت میں تم زیادہ قیام کرنیوالے ہو"۔ [3]

تحریف تاریخ

یہ امر لائق توجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی جو ایمان اور اسلام میں حضرت علی علیہ السلام کی سبقت کا سیدھے طریقے سے تو انکار نہیں کر سکے لیکن کچھ واضح البطلان علل کی بنیاد پر ایک اور طریقے سے انکار کی کوشش کی ہے یا اسے کم اہم بنا کر پیش کیا ہے بعض نے کوشش کی ہے ان کی

---

[1] الغدیر ج 3 ص 237

[2] الغدیر میں یہ حدیث مستدرک حاکم ج 2 ص 136، استیعاب ج 2 ص 457 اور شرح ابن ابی الحدید ج 3 ص 258 سے نقل کی گئی ہے۔

[3] الغدیر ہی میں یہ حدیث طبرانی اور بیہقی سے نقل کی گئی ہے نیز ہیثمی نے مجمع میں، حافظ گنجی نے کفایہ الکمال میں اور کنز العمال میں نقل کی ہے۔

جگہ حضرت ابوبکر کو پہلا مسلمان قرار دیں یہ لوگ کبھی کہتے ہیں کہ علی اس وقت دس سال کے تھے لہٰذا طبعاً نابالغ تھے اس بناء پر ان کا اسلام ایک بچے کے اسلام کی حیثیت سے دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کے محاذ کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ [1]

یہ بات واقعاً عجیب ہے اور حقیقت میں خود پیغمبر خدا پر اعتراض ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یوم الدار (دعوت ذی العشیرہ کے موقع پر) رسول اللہ ﷺ نے اسلام اپنے قبیلے کے سامنے پیش کیا اور کسی نے حضرت علی علیہ السلام کے سوا اسے قبول نہ کیا اس وقت حضرت علی علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے ان کے اسلام کو قبول کیا بلکہ یہاں تک اعلان کیا کہ تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

یہ وہ حدیث ہے جو شیعہ سنی حافظان حدیث نے کتب صحاح اور مسانید میں نقل کی ہے، اسی طرح کئی مورخین اسلام نے اسے نقل کیا ہے یہ نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کی اس کم سنی میں نہ صرف ان کا اسلام قبول کیا ہے بلکہ ان کا اپنے بھائی، وصی اور جانشین کی حیثیت سے تعارف بھی کروایا ہے۔ [2]

کبھی کہتے ہیں کہ عورتوں میں پہلی مسلمان خدیجہ تھیں، مردوں میں پہلے مسلمان ابوبکر تھے اور بچوں میں پہلے مسلمان علی علیہ السلام تھے یوں دراصل وہ اس امر کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں۔ [3]

حالانکہ اول تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں حضرت علی علیہ السلام کی اہمیت اس وقت کی سن سے اس امر کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی خصوصاً جب کہ قرآن حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے:

---

[1] الغدیر میں یہ حدیث حلیۃ الاولیاء ج 1 ص 66 کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

[2] یہ بات فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں سورۂ توبہ آیت 100 کے ذیل میں ذکر کی ہے۔

یہ تعبیر مشہور اور متعصب مفسر مؤلف المنار نے بھی سورۂ توبہ آیت 100 کے ذیل میں ذکر کی ہے۔

[3] یہ حدیث مختلف عبارات میں نقل ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اسے ابوجعفر اسکافی نے کتاب "نقض العثمانیہ" میں، برہان الدین نے "نجباء الانباء" میں، ابن اثیر نے کامل میں اور بعض دیگر علماء نے نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لئے الغدیر عربی کی جلد دوم ص 278 تا 286 کی طرف رجوع کریں)

''ہم نے اسے بچپن کے عالم میں حکم دیا''۔ [1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بچپن کے عالم میں بھی بول اٹھے اور افراد ان کے بارے میں شک کرتے تھے ان سے کہا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے آسمانی کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے''۔ [2]

ایسی آیات کو اگر ہم مذکورہ حدیث سے ملا کر دیکھیں کہ جس میں آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا وصی، خلیفہ اور جانشین قرار دیا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صاحب المنار کی متعصبانہ گفتگو کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر تاریخی لحاظ سے مسلم نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام لانے والے تیسرے شخص تھے بلکہ تاریخ وحدیث کی بہت سی کتب میں ان سے پہلے بہت سے افراد کے اسلام قبول کرنے ذکر ہے۔ یہ بحث ہم اس نکتے پر ختم کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے خود اپنے ارشادات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں پہلا مومن، پہلا مسلمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پہلا نماز گذار ہوں اور اس سے آپ نے اپنے مقام وحیثیت کو واضح کیا ہے یہ بات آپ سے بہت سی کتب میں منقول ہے۔

علاوہ ازیں ابن ابی الحدید مشہور عالم ابو جعفر اسکافی معتزلی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابوبکر اسلام میں سبقت رکھتے تھے اگر یہ امر صحیح ہے تو پھر خود انھوں نے اس سے کسی مقام پر اپنی فضیلت کے لیے استدلال کیوں نہیں کیا اور نہ ہی ان کے حامی کسی صحابی نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ [3]

دعوت ذوالعشیرۃ

تاریخ اسلام کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعثت کے تیسرے سال اس دعوت کا حکم ہوا کیونکہ اب تک آپ کی دعوت مخفی طور پر جاری تھی اور اس مدت میں بہت کم لوگوں نے اسلام

---

[1] سورہ مریم آیت 12

[2] سورہ مریم آیت 30

[3] الغدیر ج 2 ص 240

قبول کیا تھا، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ [1]
اور یہ آیت بھی ۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ [2] تو آپ کھلم کھلا دعوت دینے پر مامور ہو گئے اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنے کا حکم ہوا۔

اس دعوت اور تبلیغ کی اجمالی کیفیت کچھ اس طرح سے ہے: آنحضرت ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جناب ابو طالب علیہ السلام کے گھر میں دعوت دی اس میں تقریباً چالیس افراد شریک ہوئے آپ کے چچاؤں میں سے ابو طالب علیہ السلام، حمزہ علیہ السلام اور ابولہب نے بھی شرکت کی کھانا کھا لینے کے بعد جب آنحضرت ﷺ نے اپنا فریضہ ادا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے بڑھ کر کچھ ایسی باتیں کیں جس سے سارا مجمع منتشر ہو گیا لہٰذا آپ نے انہیں کل کے کھانے کی دعوت دے دی۔

دوسرے دن کھانا کھانے کے بعد آپ نے ان سے فرمایا: ”اے عبدالمطلب کے بیٹو: پورے عرب میں مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو اپنی قوم کے لیے مجھ سے بہتر چیز لایا ہو، میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں اس دین کی دعوت دوں، تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے تاکہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہو“؟ سب لوگ خاموش رہے سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جو سب سے کم سن تھے، علی علیہ السلام اٹھے اور عرض کی: ”اے اللہ کے رسول اس راہ میں میں آپ کا یار و مددگار ہوں گا“ آنحضرت ﷺ نے اپنا ہاتھ علی علیہ السلام کی گردن پر رکھا اور فرمایا:

”ان هذا اخی ووصی وخلیفتی فیکم فاسمعوا له واطیعوه“۔

یہ (علی علیہ السلام) تمہارے درمیان میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی باتوں

---

[1] سورہ شعراء، آیت 214

[2] سورہ حجر آیہ 94

کو سنو اور اس کے فرمان کی اطاعت کرو۔ یہ سن کر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور تمسخر آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی، ابوطالب علیہ السلام سے کہنے لگے، "اب تم اپنے بیٹے کی باتوں کو سنا کرو اور اس کے فرمان پر عمل کیا کرنا"۔ [1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دنوں کس حد تک تنہا تھے اور لوگ آپ کی دعوت کے جواب میں کیسے کیسے تمسخر آمیز جملے کہا کرتے تھے اور علی علیہ السلام ان ابتدائی ایام میں جب کہ آپ بالکل تنہا تھے کیونکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدافع بن کر آپ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت قریش کے ہر قبیلے کا نام لے لے کر انہیں بلایا اور انہیں جہنم کے عذاب سے ڈرایا، کبھی فرماتے:

"یابنی کعب انقذوا انفسکم من النار"۔

اے بنی کعب: خود کو جہنم سے بچاؤ، کبھی فرماتے: "یا بنی عبد الشمس" کبھی فرماتے: "یا بنی عبد مناف"۔ کبھی فرماتے: "یا بنی ہاشم"۔ کبھی فرماتے: **"یابنی عبد المطلب انقذوا انفسکم النار"**۔ تم خود ہی اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، ورنہ کفر کی صورت میں میں تمہارا دفاع نہیں کرسکوں گا۔

ایمان ابوطالب علیہ السلام

---

[1] اس روایت کو بہت سے اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری مورخ ابن اثیر نے یہ واقعہ اپنی کتاب "کامل" میں اور "ابوالفداء" نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے بہت سے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے مزید آگاہی کے لئے کتاب "المراجعات" ص 130 کے بعد سے اور کتاب "احقاق الحق" ج 2، ص 62 ملاحظہ فرمائیں۔

تمام علمائے شیعہ اور اہل سنت کے بعض بزرگ علماء مثلاً ''ابن ابی الحدید'' شارح نہج البلاغہ نے اور ''قسطلانی'' نے ارشاد الساری میں اور ''زینی دحلان'' نے سیرۃ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابوطالب علیہ السلام کو مومنین اہل اسلام میں سے بیان کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام پر ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے جا تہمتیں کیوں لگائی گئیں؟

جو شخص اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا کرتا تھا اور بارہا خود اپنے فرزند کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود مقدس کو بچانے کے لئے خطرات کے مواقع پر ڈھال بنادیا کرتا تھا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے۔

یہی سبب ہے کہ دقت نظر کے ساتھ تحقیق کرنے والوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کے خلاف، مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ سے ہے جو ''شجرہ خبیثہ بنی امیہ'' کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ صرف حضرت ابوطالب علیہ السلام کی ذات ہی نہیں تھی کہ جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ سے ایسے حملے کی زد میں آئی ہو، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے قربت رکھتا ہے ایسے ناجوانمردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا، حقیقت میں حضرت ابوطالب علیہ السلام کا کوئی گناہ نہیں تھا سوائے اس کے وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے عظیم پیشوائے اسلام کے باپ تھے۔

ایمان ابوطالب پر سات دلیل

ہم یہاں پر ان بہت سے دلائل میں سے جو واضح طور پر ایمان ابوطالب علیہ السلام کی

گواہی دیتے ہیں کچھ دلائل مختصر طور پر فہرست وار بیان کرتے ہیں تفصیلات کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

1۔ حضرت ابوطالب علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کا بھتیجا مقام نبوت تک پہنچے گا کیونکہ مورخین نے لکھا ہے کہ جس سفر میں حضرت ابوطالب علیہ السلام قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو اپنے بارہ سالہ بھتیجے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔اس سفر میں انہوں نے آپ سے بہت سی کرامات مشاہدہ کیں۔

ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جونہی قافلہ ''بحیرا'' نامی راہب کے قریب سے گزرا جو قدیم عرصے سے ایک گرجے میں مشغول عبادت تھا اور کتب عہدین کا عالم تھا، تجارتی قافلے اپنے سفر کے دوران اس کی زیارت کے لئے جاتے تھے، تو راہب کی نظریں قافلہ والوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جم کر رہ گئیں، جن کی عمر اس وقت بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بحیرا نے تھوڑی دیر کے لئے حیران وششدر رہنے اور گہری اور پرمعنی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا: یہ بچہ تم میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے؟ لوگوں نے ابوطالب علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

''بحیرا'' نے کہا: اس بچہ کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کی نبوت ورسالت کی آسمانی کتابوں نے خبر دی ہے اور میں نے اسکی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہیں۔

ابوطالب علیہ السلام اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دوسرے قرائن سے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔

اہل سنت کے عالم شہرستانی (صاحب ملل ونحل) اور دوسرے علماء کی نقل کے مطابق:

''ایک سال آسمان مکہ نے اپنی برکت اہل مکہ سے روک لی اور سخت قسم کی قحط سالی نے لوگوں کو گھیر لیا تو ابوطالب علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کے بھتیجے محمد کو جو ابھی شیر خوار ہی تھے لایا جائے، جب

بچے کو اس حال میں کہ وہ ابھی کپڑے میں لپٹا ہوا تھا انہیں دیا گیا تو وہ اسے لینے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تضرع وزاری کے ساتھ اس طفل شیر خوار کو تین مرتبہ اوپر کی طرف بلند کیا اور ہر مرتبہ کہتے تھے، پروردگارا، اس بچے کے حق کا واسطہ ہم پر برکت والی بارش نازل فرما۔

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ افق کے کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور مکہ کے آسمان پر چھا گیا اور بارش سے ایسا سیلاب آیا کہ یہ خوف پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسجد الحرام ہی ویران نہ ہو جائے''۔

اس کے بعد شہرستانی لکھتا ہے کہ یہی واقعہ جو ابو طالب علیہ السلام کی اپنے بھتیجے کے بچپن سے اس کی نبوت و رسالت سے آگاہ ہونے پر دلالت کرتا ہے ان کے پیغمبر پر ایمان رکھنے کا ثبوت بھی ہے اور ابو طالب علیہ السلام نے بعد میں اشعار ذیل اسی واقعہ کی مناسبت سے کہے تھے:

و ابیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامی عصمة الارامل

''وہ ایسا روشن چہرے والا ہے کہ بادل اس کی خاطر سے بارش برساتے ہیں وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں''

یلوذ به الهلاك من آل هاشم
فهم عنده فی نعمة و فواضل

''بنی ہاشم میں سے جو چل بسے ہیں وہ اسی سے پناہ لیتے ہیں اور اسی کے صدقے میں نعمتوں اور احسانات سے بہرہ مند ہوتے ہیں،،

ومیزان عدله یخیس شعیرة
ووزان صدق وزنه غیر هائل

"وہ ایک ایسی میزان عدالت ہے کہ جو ایک جو برابر بھی ادھر ادھر نہیں کرتا اور درست کاموں کا ایسا وزن کرنے والا ہے کہ جس کے وزن کرنے میں کسی شک وشبہ کا خوف نہیں ہے"

قحط سالی کے وقت قریش کا ابو طالب علیہ السلام کی طرف متوجہ ہونا اور ابو طالب علیہ السلام کا خدا کو آنحضرتؐ کے حق کا واسطہ دینا شہرستانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سے عظیم مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ [1]

اشعار ابو طالب علیہ السلام زندہ گواہ

2۔ اس کے علاوہ مشہور اسلامی کتابوں میں ابو طالب علیہ السلام کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہماری دسترس میں ہیں ان میں سے کچھ اشعار ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

والله ان یصلوالیك بجمعهم
حتیٰ اوسدفی التراب دفینا

"اے میرے بھتیجے خدا کی قسم جب تک ابو طالب علیہ السلام مٹی میں نہ سو جائے اور لحد کو اپنا بستر نہ بنالے دشمن ہرگز ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے"

فاصدع بأمرك ماعلیك غضاضته
وابشر بذاك وقر منك عیونا

"لہٰذا کسی چیز سے نہ ڈر اور اپنی ذمہ داری اور ماموریت کا ابلاغ کر، بشارت دے اور آنکھوں کو ٹھنڈا کر"۔

ودعوتنی وعلمت انك ناصحی

---

[1] علامہ امینی نے اسے اپنی کتاب "الغدیر" میں "شرح بخاری"، "المواھب اللدنیہ"، "الخصائص الکبری"، "شرح بہجۃ المحافل"، "سیرہ حلبی"، "سیرہ نبوی" اور "طلبۃ الطالب" سے نقل کیا ہے۔

ولقد دعوت وكنت ثم امينا

''تو نے مجھے اپنے مکتب کی دعوت دی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرا ہدف و مقصد صرف پند و نصیحت کرنا اور بیدار کرنا ہے، تو اپنی دعوت میں امین اور صحیح ہے''

ولقد علمت ان دين محمدً
من خير اديان البرية ديناً

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محمد کا دین و مکتب تمام دینوں اور مکتبوں میں سب سے بہتر دین ہے''۔

اور یہ اشعار بھی انہوں نے ہی ارشاد فرمائے ہیں:

الم تعلموا انا وجدنا محمداً
رسولا كموسىٰ خط فى اول الكتب

''اے قریش کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ محمد (ﷺ) موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے مانند خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی پہلی آسمانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ہم نے اسے پا لیا ہے''۔

وان عليه فى العباد محبة
ولاحيف فى من خصه الله فى الحب

''خدا کے بندے اس سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور جسے خداوند متعال نے اپنی محبت کے لئے مخصوص کر لیا ہو اس شخص سے یہ لگاؤ بے موقع نہیں ہے۔''

ابن ابی الحدید نے جناب ابوطالب علیہ السلام کے کافی اشعار نقل کرنے کے بعد (کہ جن کے مجموعہ کو ابن شہر آشوب نے ''متشابہات القرآن'' میں تین ہزار اشعار کہا ہے) کہتا ہے: ''ان تمام اشعار کے مطالعہ سے ہمارے لئے کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ

ابو طالب علیہ السلام اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان رکھتے تھے"۔

3۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی ایسی احادیث بھی نقل ہوئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کے فداکار چچا ابو طالب علیہ السلام کے ایمان پر گواہی دیتی ہیں منجملہ ان کے کتاب "ابو طالب علیہ السلام مومن قریش" کے مولف کی نقل کے مطابق ایک یہ ہے کہ جب ابو طالب علیہ السلام کی وفات ہوگئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تشیع جنازہ کے بعد اس سوگواری کے ضمن میں جو اپنے چچا کی وفات کی مصیبت میں آپ کر رہے تھے آپ یہ بھی کہتے تھے:

"ہائے میرے بابا ہائے ابو طالب علیہ السلام میں آپ کی وفات سے کس قدر غمگین ہوں کس طرح آپ کی مصیبت کو میں بھول جاؤں، اے وہ شخص جس نے بچپن میں میری پرورش اور تربیت کی اور بڑے ہونے پر میری دعوت پر لبیک کہی، میں آپ کے نزدیک اس طرح تھا جیسے آنکھ خانہ چشم میں اور روح بدن میں"۔

نیز آپ ہمیشہ یہ کیا کرتے تھے: **ما نالت منی قریش شیئاً اکرھہ حتیٰ مات ابو طالب**۔

"اہل قریش اس وقت تک کبھی میرے خلاف ناپسندیدہ اقدام نہ کر سکے جب تک ابو طالب علیہ السلام کی وفات نہ ہوگئی"۔

4۔ ایک طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابو طالب علیہ السلام کی وفات سے کئی سال پہلے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ رابطہ نہ رکھیں، اس کے باوجود ابو طالب علیہ السلام کے ساتھ اس قسم کے تعلق اور مہر و محبت کا اظہار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مکتب توحید کا معتقد جانتے تھے، ورنہ یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی تھی کہ دوسروں کو تو مشرکین کی دوستی سے منع کریں اور خود ابو طالب علیہ السلام سے عشق کی حد تک مہر و محبت رکھیں۔

5۔ ان احادیث میں بھی کہ جو اہل بیت پیغمبر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں حضرت

ابوطالب علیہ السلام کے ایمان واخلاص کے بڑی کثرت سے مدارک نظر آتے ہیں، جن کا یہاں نقل کرنا طول کا باعث ہوگا، یہ احادیث منطقی استدلالات کی حامل ہیں ان میں سے ایک حدیث چوتھے امام علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس میں امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابوطالب علیہ السلام مومن تھے؟ جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا: "ان ھنا قوماً یزعمون انه کافر"، اس کے بعد فرمایا کہ: "تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگ یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ ابوطالب علیہ السلام کافر تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ اس عقیدہ کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوطالب علیہ السلام پر طعن کرتے ہیں کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی کئی آیات میں اس بات سے منع کیا گیا ہے (اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ) مومن عورت ایمان لانے کے بعد کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور یہ بات مسلم ہے کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا سابق ایمان لانے والوں میں سے ہیں اور وہ ابوطالب علیہ السلام کی زوجیت میں ابوطالب علیہ السلام کی وفات تک رہیں۔"

ابوطالب علیہ السلام تین سال تک شعب میں

6۔ ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے اگر انسان ہر چیز میں ہی شک کریں تو کم از کم اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں کرسکتا کہ ابوطالب علیہ السلام اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجہ اول کے حامی ومددگار تھے، ان کی اسلام اور پیغمبر کی حمایت اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی کہ جسے کسی طرح بھی رشتہ داری اور قبائلی تعصبات سے منسلک نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا زندہ نمونہ شعب ابوطالب علیہ السلام کی داستان ہے۔ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ جب قریش نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کا ایک شدید اقتصادی، سماجی اور سیاسی بائیکاٹ کرلیا اور اپنے ہر قسم کے روابط ان سے منقطع کرلئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واحد حامی اور مدافع، ابوطالب علیہ السلام نے اپنے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا اور برابر تین سال تک ہاتھ کھینچے رکھا

اور بنی ہاشم کو ایک درہ کی طرف لے گئے جو مکہ کے پہاڑوں کے درمیان تھا اور ''شعب ابوطالب'' کے نام سے مشہور تھا اور وہاں پر سکونت اختیار کر لی۔

ان کی فداکاری اس مقام تک جا پہنچی کہ قریش کے حملوں سے بچانے کے لئے کئی ایک مخصوص قسم کے برج تعمیر کرنے کے علاوہ ہر رات پیغمبر اکرم ﷺ کو ان کے بستر سے اٹھاتے اور دوسری جگہ ان کے آرام کے لئے مہیا کرتے اور اپنے فرزند دلبند علی کو ان کی جگہ پر سلا دیتے اور جب حضرت علی علیہ السلام کہتے: ''بابا جان میں تو اسی حالت میں قتل ہو جاؤں گا'' تو ابوطالب علیہ السلام جواب میں کہتے: میرے پیارے بچے بردباری اور صبر ہاتھ سے نہ چھوڑو، ہر زندہ موت کی طرف رواں دواں ہے، میں نے تجھے فرزند عبداللہ کا فدیہ قرار دیا ہے۔

یہ بات اور بھی طالب توجہ ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام باپ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بابا جان میرا یہ کلام اس بنا پر نہیں تھا کہ میں راہ محمدؐ میں قتل ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ میرا یہ کلام اس بنا پر تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کس طرح سے آپ کا اطاعت گزار اور احمد مجتبیٰ کی نصرت و مدد کے لئے آمادہ و تیار ہوں۔

قارئین کرام ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی تعصب کو ایک طرف رکھ کر غیر جانبداری کے ساتھ ابوطالب علیہ السلام کے بارے میں تاریخ کی سنہری سطروں کو پڑھے گا تو وہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ہمصدا ہو کر کہے گا:

و لو لا ابوطالب وابنه لما
مثل الدين شخصا و قاما
فذاك بمكة آوى و حامى وهذا
بيثرب جس الحماما

''اگر ابوطالب علیہ السلام اور ان کا بیٹا نہ ہوتے تو ہرگز مکتب اسلام باقی نہ رہتا اور اپنا

قد سید ھا نہ کرتا، ابوطالب علیہ السلام تو مکہ میں پیغمبر کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور علی یثرب (مدینہ) میں حمایت اسلام کی راہ میں گرداب موت میں ڈوب گئے"

ابوطالب علیہ السلام کا سال وفات "عام الحزن"

7۔ "ابوطالب علیہ السلام کی تابناک زندگی، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان کی عظیم قربانیاں اور رسول اللہ اور مسلمانوں کی ان سے شدید محبت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے ہم یہاں تک دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کی موت کے سال کا نام "عام الحزن" رکھا یہ سب باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کو اسلام سے عشق تھا اور وہ جو پیغمبر اسلام کی اس قدر مدافعت کرتے تھے وہ محض رشتہ داری کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس دفاع میں آپ کی حیثیت ایک مخلص، ایک جاں نثار اور ایسے فدا کار کی تھی جو اپنے رہبر اور پیشوا کا تحفظ کر رہا ہو۔"

ابولہب کی دشمنی

اس کا نام "عبدالعزیٰ" (عزیٰ بت کا بندہ) اور اس کی کنیت "ابولہب" تھی۔ اس کے لیے اس کنیت کا انتخاب شاید اس وجہ سے تھا کہ اس کا چہرہ سرخ اور بھڑکتا ہوا تھا، چونکہ لغت میں لہب آگ کے شعلہ کے معنی میں ہے۔

وہ اور اس کی بیوی "ام جمیل" جو ابوسفیان کی بہن تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت بدزبان اور سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔

"طارق محارق" نامی ایک شخص کہتا ہے: میں "ذی المجاز" کے بازار میں تھا۔ [1] اچانک میں نے ایک جوان کو دیکھا جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا: اے لوگو: لا الہ الا اللہ کا

---

[1] ذی المجاز عرفات کے نزدیک مکہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر ہے۔

اقرار کرلو تو نجات پا جاؤ گے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اس کے پاؤں کے پچھلے حصہ پر پتھر مارتا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے پاؤں سے خون جاری تھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اے لوگو یہ جھوٹا ہے اس کی بات نہ ماننا"۔

میں نے پوچھا کہ یہ جوان کون ہے؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کا گمان یہ ہے کہ وہ پیغمبر ہے اور یہ بوڑھا اس کا چچا ابولہب ہے جو اس کو جھوٹا سمجھتا ہے۔

"ربیع بن عباد" کہتا ہے: میں اپنے باپ کے ساتھ تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ وہ قبائل عرب کے پاس جاتے اور ہر ایک کو پکار کر کہتے: میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں: تم خدائے یگانہ کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

جب وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا تو ایک خوبرو بھینگا آدمی جوان کے پیچھے پیچھے تھا، پکار کر کہتا: اے فلاں قبیلے: یہ شخص یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزیٰ بت اور اپنے ہم پیمان جنوں کو چھوڑ دو اور اس کی بدعت وضلالت کی پیروی کرنے لگ جاؤ اس کی نہ سننا، اور اس کی پیروی نہ کرنا"۔

میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ" اس کا چچا ابولہب ہے"۔

ابولہب پیغمبر کا پیچھا کرتا رہا

جب مکہ سے باہر کے لوگوں کا کوئی گروہ اس شہر میں داخل ہوتا تھا تو وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی رشتہ داری اور سن وسال کے لحاظ سے بڑا ہونے کی بنا پر ابولہب کے پاس جاتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تحقیق کرتا تھا وہ جواب دیتا تھا: محمد ایک جادوگر ہے، وہ بھی پیغمبر سے ملاقات کئے بغیر ہی لوٹ جاتے اسی اثناء میں ایک ایسا گروہ آیا جنہوں نے یہ کہا کہ ہم تو اسے دیکھے بغیر واپس نہیں جائیں گے ابولہب نے کہا: "ہم مسلسل اس کے جنون کا علاج کر رہے

ہیں: وہ ہلاک ہو جائے"۔

وہ اکثر مواقع پر سایہ کی طرح پیغمبر کے پیچھے لگا رہتا تھا اور کسی خرابی سے فروگذاشت نہ کرتا تھا خصوصاً اس کی زبان بہت ہی گندی اور آلودہ ہوتی تھی اور وہ رکیک اور چبھنے والی باتیں کیا کرتا تھا اور شاید اسی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سب دشمنوں کا سرغنہ شمار ہوتا تھا اسی بناء پر قرآن کریم اس پر اور اس کی بیوی ام جمیل پر ایسی صراحت اور سختی کے ساتھ تنقید کر رہا ہے وہی ایک اکیلا ایسا شخص تھا جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی ہاشم کی حمایت کے عہد و پیمان پر دستخط نہیں کیے تھے اور اس نے آپ کے دشمنوں کی صف میں رہتے ہوئے دشمنوں کے عہد و پیمان میں شرکت کی تھی۔

ابولہب کے ہاتھ کٹ جائیں

"ابن عباس" سے نقل ہوا ہے کہ جس وقت آیہ **-وانذر عشیرتك الاقربین-** نازل ہوئی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریبی رشتہ داروں کو انذار کرنے اور اسلام کی دعوت دینے پر مامور ہوئے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر آئے اور پکار کر کہا "یا صباحاہ" (یہ جملہ عرب اس وقت کہتے تھے جب ان پر دشمن کی طرف سے غفلت کی حالت میں حملہ ہو جاتا تھا تا کہ سب کو باخبر کر دیں اور وہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جائیں، لہٰذا کوئی شخص "یا صباحاہ" کہہ کر آواز دیتا تھا "صباح" کے لفظ کا انتخاب اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ عام طور پر غفلت کی حالت میں حملے صبح کے وقت کیے جاتے تھے۔

مکہ کے لوگوں نے جب یہ صدا سنی تو انہوں نے کہا کہ یہ کون ہے جو فریاد کر رہا ہے۔ کہا گیا کہ یہ "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کچھ لوگ آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے قبائل عرب کو ان کے نام کے ساتھ پکارا۔ آپ کی آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے تو آپ نے ان سے فرما

یا:

''مجھے بتلاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ دشمن کے سوار اس پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کرنے والے ہیں، تو کیا تم میری بات کی تصدیق کرو گے''۔

انہوں نے جواب دیا: ''ہم نے آپؐ سے کبھی بھی جھوٹ نہیں سنا''۔

آپؐ نے فرمایا:

"انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید"۔

''میں تمہیں خدا کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں''۔

(''میں تمہیں توحید کا اقرار کرنے اور بتوں کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہوں'') جب ابولہب نے یہ بات سنی تو اس نے کہا:

"تبا لکا ما جمعتنا الا لھذا؟"۔

تو ہلاک ہو جائے کیا تو نے ہمیں صرف اس بات کے لیے جمع کیا ہے؟

اس موقع پر یہ سورہ نازل ہوا: (تبت یدا ابی لھب و تب)۔ [1]

''اے ابولہب تو ہی ہلاک ہو اور تیرے ہاتھ ٹوٹیں، تو ہی زیاں کار اور ہلاک ہونے والا ہے، اس کے مال و ثروت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے اس نے، اسے ہرگز کوئی فائدہ نہیں دیا اور وہ اسے عذاب الٰہی سے نہیں بچائے گا''۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دولت مند مغرور شخص تھا جو اپنی اسلام دشمن کوششوں کے لئے اپنے مال و دولت پر بھروسہ کرتا تھا۔

بعد میں قرآن مزید یہ کہتا ہے، ''وہ جلدی ہی اس آگ میں داخل ہوگا جس کے شعلے

[1] سورہ لہب آیت 1 تا 2

بھڑ کنے والے ہیں"۔ [1]

اگر اس کا نام "ابولہب" ہے تو اس کے لئے عذاب بھی "بولہب" ہے یعنی اس کے لئے بھڑ کتے ہوئے آگ کے شعلے ہیں۔

ایندھن اٹھائے ہوئے

قرآن کریم نے اس کے بعد اس کی بیوی "ام جمیل" کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: "اس کی بیوی بھی جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوگی، جو اپنے دوش پر ایندھن اٹھاتی ہے"۔ [2]

"اور اس کی گردن میں خرما کی چھال کی رسی یا گردن بند ہے"۔ [3]

"فی جیدھا حبل من مسد"

"مسد" (بروزن حسد) اس رسی کے معنی میں ہے جو کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ "مسد" وہ رسی ہے جو جہنم میں اس کی گردن میں ڈالیں گے جس میں کھجور کے پتوں جیسی سختی ہوگی اور اس میں آگ کی حرارت اور لوہے کی سنگینی ہوگی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ بڑے لوگوں کی عورتیں اپنی شخصیت کو آلات وزیورات خصوصاً گردن کے قیمتی زیورات سے زینت دینے میں خاص بات سمجھتی ہیں، لہٰذا خدا قیامت میں اس مغرور وخود پسند عورت کی تحقیر کے لیے لیف خرما کا ایک گردن بند اس کی گردن میں ڈال دے گا یا یہ اصلاً اس کی تحقیر سے کنایہ ہے۔

---

[1] سورہ لہب آیت 3

[2] سورہ تبت آیت 4

[3] سورہ تبت آیت 4

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر کے بیان کرنے کا سبب یہ ہے کہ "ام جمیل" کے پاس جواہرات کا ایک بہت ہی قیمتی گردن بند تھا اور اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اسے پیغبر اکرم ﷺ کی دشمنی میں خرچ کرے گی لہٰذا اس کے اس کام کے بدلے میں خدا نے بھی اس کے لئے ایسا عذاب مقرر کردیا ہے۔

ابولہب کا عبرت ناک انجام

روایات میں آیا ہے کہ جنگ "بدر" اور سخت شکست کے بعد، جو مشرکین قریش کو اٹھانی پڑی تھی، ابولہب نے جو خود میدان جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا، ابوسفیان کے واپس آنے پر اس ماجرے کے بارے میں سوال کیا، ابوسفیان نے قریش کے لشکر کی شکست اور سرکوبی کی کیفیت بیان کی، اس کے بعد اس نے مزید کہا: خدا کی قسم ہم نے اس جنگ میں آسمان وزمین کے درمیان ایسے سوار دیکھے ہیں جو محمد کی مدد کے لیے آئے تھے۔

اس موقع پر "عباس" کے ایک غلام "ابورافع" نے کہا: میں وہاں بیٹھا ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور کہا کہ وہ آسمانی فرشتے تھے۔

اس سے ابولہب بھڑک اٹھا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا، مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مجھے پیٹے چلے جارہا تھا وہاں عباس کی بیوی "ام الفضل" بھی موجود تھی اس نے ایک چھڑی اٹھائی اور ابولہب کے سر پردے ماری اور کہا: "کیا تو نے اس کمزور آدمی کو اکیلا سمجھا ہے؟"

ابولہب کا سر پھٹ گیا اور اس سے خون بہنے لگا سات دن کے بعد اس کے بدن میں بدبو پیدا ہوگئی، اس کی جلد میں طاعون کی شکل کے دانے نکل آئے اور وہ اسی بیماری سے واصل جہنم ہوگیا۔

اس کے بدن سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ لوگ اس کے نزدیک جانے کی جرأت نہیں کرتے تھے وہ اسے مکہ سے باہر لے گئے اور دور سے اس پر پانی ڈالا اور اس کے بعد اس کے اوپر پتھر پھینکے یہاں تک کہ اس کا بدن پتھروں اور مٹی کے نیچے چھپ گیا۔

ابوسفیان وابوجہل چھپ کر قرآن سنتے ہیں

ایک شب ابوسفیان، ابوجہل اور مشرکین کے بہت سے دوسرے سردار جداگانہ طور پر اور ایک دوسرے سے چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سننے کے لئے آگئے آپ اس وقت نماز پڑھنے میں مشغول تھے اور ہر ایک، ایک دوسرے سے بالکل بے خبر علیحدہ علیحدہ مقامات پر چھپ کر بیٹھ گئے چنانچہ وہ رات گئے تک قرآن سنتے رہے اور جب واپس پلٹنے لگے تو اس وقت صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ اتفاق سے سب نے واپسی کے لیے ایک ہی راستے کا انتخاب کیا اور ان کی اچانک ایک دوسرے سے ملاقات ہوگئی اور ان کا بھانڈا وہیں پر پھوٹ گیا انھوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور اس بات پر زور دیا کہ آئندہ ایسا کام نہیں کریں گے، اگر نا سمجھ لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ شک وشبہ میں پڑ جائیں گے۔

دوسری اور تیسری رات بھی ایسا ہی اتفاق ہوا اور پھر وہی باتیں دہرائی گئیں اور آخری رات تو انھوں نے کہا جب تک اس بات پر پختہ عہد نہ کرلیں اپنی جگہ سے ملیں گے نہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر ہر ایک نے اپنی راہ لی۔ اسی رات کی صبح اخنس بن شریق نامی ایک مشرک اپنا عصا لے کر سیدھا ابوسفیان کے گھر پہنچا اور اسے کہا: تم نے جو کچھ محمدؐ سے سنا ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا: خدا کی قسم: کچھ مطالب ایسے سنے ہیں جن کا معنی بخوبی سمجھ سکا ہوں اور کچھ مسائل کی مراد اور معنی کو نہیں سمجھ سکا۔ اخنس وہاں سے سیدھا ابوجہل کے پاس پہنچا اس سے بھی

وہی سوال کیا: تم نے جو کچھ محمد سے سنا ہے اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

ابو جہل نے کہا: سنا کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری اور اولاد عبد مناف کی قدیم زمانے سے رقابت چلی آرہی ہے انھوں نے بھوکوں کو کھانا کھلایا، ہم نے بھی کھلایا، انھوں نے پیدل لوگوں کو سواریاں دیں ہم نے بھی دیں، انھوں نے لوگوں پر خرچ کیا، سو ہم نے بھی کیا گویا ہم دوش بدوش آگے بڑھتے رہے۔ جب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے پاس وحی آسمانی بھی آتی ہے تو اس بارے میں ہم ان کے ساتھ کس طرح برابری کر سکتے ہیں؟ اب جب کہ صورت حال یہ ہے تو خدا کی قسم ہم نہ تو کبھی اس پر ایمان لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔ اخنس نے جب یہ بات سنی تو وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ [1]

جی ہاں: قرآن کی کشش نے ان پر اس قدر اثر کر دیا کہ وہ سپیدہ صبح تک اس الٰہی کشش میں گم رہے لیکن خود خواہی، تعصب اور مادی فوائد ان پر اس قدر غالب آچکے تھے کہ انھوں نے حق قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نور الٰہی میں اس قدر طاقت ہے کہ ہر آمادہ دل کو وہ جہاں بھی ہو، اپنی طرف جذب کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس (قرآن) کا ان آیات میں "جہاد کبیر" کہہ کر تعارف کروایا گیا ہے۔ [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن "اخنس بن شریق" کا ابو جہل سے آمنا سامنا ہو گیا جب کہ وہاں پر اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ تو اخنس نے اس سے کہا: سچ بتاؤ محمد سچا ہے، یا جھوٹا؟ قریش میں سے کوئی شخص سوا میرے اور تیرے یہاں موجود نہیں ہے جو ہماری باتوں کو سنے۔

ابو جہل نے کہا: وائے ہو تجھ پر خدا کی قسم وہ میرے عقیدے میں سچ کہتا ہے اور اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اگر یہ اس بات کی بنا ہو جائے کہ محمد کا خاندان سب چیزوں کو اپنے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص 337، اور تفسیر فی ظلال القرآن جلد 6 ص 173

[2] تفسیر نمونہ ج 8 ص 144

قبضہ میں کر لے، حج کا پرچم، حاجیوں کو پانی پلانا، کعبہ کی پردہ داری اور مقام نبوت تو باقی قریش کے لئے کیا باقی رہ جائے گا۔ [1]

اسلام کے پہلے مہاجرین

پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت اور عمومی دعوت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے قریش نے قبائل عرب کو یہ نصیحت کر رکھی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر اکرم ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں انتہائی سخت دباؤ ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں میں سے ہر کوئی اپنی قوم و قبیلہ کی طرف سے انتہائی سختی اور دباؤ میں مبتلا تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد جہاد آزادی شروع کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس چھوٹے سے گروہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے لئے حجاز سے باہر قیام گاہ مہیا کرنے کے لئے انہیں ہجرت کا حکم دے دیا اور اس مقصد کے لئے حبشہ کو منتخب فرمایا اور کہا کہ وہاں ایک نیک دل بادشاہ ہے جو ظلم و ستم کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ کوئی مناسب موقع ہمیں عطا فرمائے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی مراد نجاشی سے تھی (نجاشی ایک عام نام تھا جیسے ''کسریٰ'' جو حبشہ کے تمام بادشاہوں کا خاص لقب تھا لیکن اس نجاشی کا اصل نام جو پیغمبر اکرم ﷺ کا ہم عصر تھا اصحمہ تھا جو کہ حبشہ کی زبان میں عطیہ و بخشش کے معنی میں ہے)۔

مسلمانوں میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ جانے کے لئے تیار ہوئے اور ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر لے کر بحری راستے سے حبشہ جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جناب جعفر بن ابوطالب علیہ السلام بھی

[1] مندرجہ بالا روایات تفسیر المنار اور مجمع البیان سے سورہ انعام آیت 33 کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر سے لی گئی ہیں۔

مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ اب اس اسلامی جمعیت میں 82 مردوں کے علاوہ کافی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔

مشرکین، مہاجرین کی تعقیب میں

اس ہجرت کی بنیاد بت پرستوں کے لئے سخت تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ لوگ جو تدریجاً اسلام کو قبول کر چکے ہیں اور حبشہ کی سرزمین امن وامان کی طرف چلے گئے ہیں، مسلمانوں کی ایک طاقتور جماعت کی صورت اختیار کرلیں گے یہ حیثیت ختم کرنے کے لئے انہوں نے کام کرنا شروع کر دیا اس مقصد کے لئے انہوں نے جوانوں میں سے دو ہوشیار، فعال، حیلہ باز اور عیار جوانوں یعنی عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کا انتخاب کیا بہت سے ہدیے دے کر ان کو حبشہ کی طرف روانہ کیا گیا، ان دونوں نے کشتی میں بیٹھ کر شراب پی اور ایک دوسرے سے لڑ پڑے لیکن آخر کار وہ اپنی سازش کو روبہ عمل لانے کے لئے سرزمین حبشہ میں داخل ہو گئے۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ نجاشی کے دربار میں پہنچ گئے، دربار میں باریاب ہونے سے پہلے انہوں نے نجاشی کے درباریوں کو بہت قیمتی ہدیے دے کر ان کو اپنا موافق بنایا تھا اور ان سے اپنی طرفداری اور تائید کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

''عمرو عاص'' نے اپنی گفتگو شروع کی اور نجاشی سے اس طرح ہم کلام ہوا:

ہم سرداران مکہ کے بھیجے ہوئے ہیں ہمارے درمیان کچھ کم عقل جوانوں نے مخالفت کا علم بلند کیا ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے دین سے پھر گئے ہیں، اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں، انہوں نے فتنہ وفساد برپا کر دیا ہے لوگوں میں نفاق کا بیج بو دیا ہے، آپ کی سرزمین کی آزادی سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور انہوں نے یہاں آ کر پناہ لے لی ہے، ہمیں اس

بات کا خوف ہے کہ وہ یہاں بھی خلل اندازی نہ کریں بہتر یہ ہے کہ آپ انہیں ہمارے سپرد کردیں تاکہ ہم انہیں اپنی جگہ واپس لے جائیں۔

یہ کہہ کر ان لوگوں نے وہ ہدیے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے پیش کیے۔

نجاشی نے کہا: جب تک میں اپنی حکومت میں پناہ لینے والوں کے نمائندوں سے نہ مل لوں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرسکتا اور چونکہ یہ ایک مذہبی بحث ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تمہاری موجودگی میں مذہبی نمائندوں کو بھی ایک جلسہ میں دعوت دی جائے۔

جعفر بن ابی طالب مہاجرین کے بہترین خطیب

چنانچہ دوسرے دن ایک اہم جلسہ منعقد ہوا، اس میں نجاشی کے مصاحبین اور عیسائی علماء کی ایک جماعت شریک تھی جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش کے نمائندے بھی حاضر ہوئے نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی باتیں سننے کے بعد جناب جعفر کی طرف رخ کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کریں جناب جعفر ادائے احترام کے بعد اس طرح گویا ہوئے: پہلے ان سے پوچھیے کہ کیا ہم ان کے بھاگے ہوئے غلاموں میں سے ہیں؟

عمرو نے کہا: نہیں بلکہ آپ آزاد ہیں۔

جعفر: ان سے یہ بھی پوچھئے کہ کیا ان کا کوئی قرض ہمارے ذمہ ہے کہ جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟

عمرو: نہیں ہمارا آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

جعفر: کیا ہم نے تمہارا کوئی خون بہایا ہے کہ جس کا ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟

عمرو: نہیں ایسا کچھ نہیں ہے؟

جعفر: تو پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ تم نے ہم پر اتنی سختیاں کیں اور اتنی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم تمہاری سرزمین سے جو سراسر مرکز ظلم و جور تھی باہر نکل آئے ہیں۔

اس کے بعد جناب جعفر نے نجاشی کی طرف رخ کیا اور کہا: ہم جاہل اور نادان تھے، بت پرستی کرتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے، طرح طرح کے برے اور شرمناک کام انجام دیتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، اپنے ہمسایوں سے برا سلوک کرتے تھے اور ہمارے طاقتور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے تھے۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا، جس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کا کوئی مثل اور شریک نہ بنائیں اور فحشاء و منکر، ظلم وستم اور قمار بازی ترک کر دیں ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں،

زکوۃ ادا کریں، عدل و احسان سے کام لیں اور اپنے وابستگان کی مدد کریں۔

نجاشی نے کہا: عیسیٰ مسیح علیہ السلام بھی انہی چیزوں کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔

اس کے بعد اس نے جناب جعفر سے پوچھا: ان آیات میں سے جو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں کچھ تمہیں یاد ہیں۔ جعفر نے کہا: جی ہاں: اور پھر انہوں نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کر دی، اس سورہ کی ایسی ہلا دینے والی آیات کے ذریعہ جو مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں کو ہر قسم کی ناروا تہمتوں سے پاک قرار دیتی ہیں، جناب جعفر کے حسن انتخاب نے عجیب وغریب اثر کیا یہاں تک کہ مسیحی علماء کی آنکھوں سے فرط شوق میں آنسو بہنے لگے اور نجاشی نے پکار کر کہا: خدا کی قسم: ان آیات میں حقیقت کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

جب عمر نے چاہا کہ اب یہاں کوئی بات کرے اور مسلمانوں کو اس کے سپرد کرنے کی درخواست کرے، نجاشی نے ہاتھ بلند کیا اور زور سے عمرو کے منہ پر مارا اور کہا: خاموش رہو، خدا کی قسم اگر ان لوگوں کی مذمت میں اس سے زیادہ کوئی بات کی تو میں تجھے سزا دوں گا، یہ کہہ کر مامورین حکومت کی طرف رخ کیا اور پکار کر کہا: ان کے ہدیے ان کو واپس کر دو اور انہیں حبشہ کی سرزمین سے باہر نکال دو جناب جعفر اور ان کے ساتھیوں سے کہا: تم آرام سے میرے ملک میں

زندگی بسر کرو۔

اس واقعہ نے جہاں جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں سے کہا تم آرام سے میرے ملک میں زندگی بسر کرو۔[1]

اس واقعہ نے جہاں حبشہ کے کچھ لوگوں پر اسلام شناسی کے سلسلے میں گہرا تبلیغی اثر کیا وہاں یہ واقعہ اس بات کا بھی سبب بنا کہ مکے کے مسلمان اس کو ایک اطمینان بخش جائے پناہ شمار کریں اور نئے مسلمان ہونے والوں کو اس دن کے انتظار میں کہ جب وہ کافی قدرت وطاقت حاصل کریں، وہاں پر بھیجتے رہیں۔

فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹنے کی

کئی سال گزر گئے پیغمبر ﷺ بھی ہجرت فرما گئے اور اسلام روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا، عہد نامہ حدیبیہ لکھا گیا اور پیغمبر اکرم ﷺ فتح خیبر کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت جب کہ مسلمان یہودیوں کے سب سے بڑے اور خطرناک مرکز کے لوٹنے کی وجہ سے اتنے خوش تھے کہ پھولے نہیں سماتے تھے، دور سے انہوں نے ایک مجمع کو لشکر اسلام کی طرف آتے ہوئے دیکھا، تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مہاجرین حبشہ ہیں، جو آغوش وطن میں پلٹ کر آرہے ہیں، جب کہ دشمنوں کی بڑی بڑی طاقتیں دم توڑ چکی ہیں اور اسلام کا پودا اپنی جڑیں کافی پھیلا چکا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے جناب جعفر اور مہاجرین حبشہ کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

---

[1] بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ سورہ مائدہ آیات 82 تا 84 نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

''میں نہیں جانتا کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹ آنے کی''

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ شامیوں میں سے آٹھ افراد کہ جن میں ایک مسیحی راہب بھی تھا اور ان کا اسلام کی طرف شدید میلان پیدا ہو گیا تھا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سورہ یٰسین کی کچھ آیات سننے کے بعد رونا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ آیات مسیح علیہ السلام کی سچی تعلیمات سے کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔

اس روایت کے مطابق جو تفسیر المنار، میں سعید بن جبیر سے منقول ہے نجاشی نے اپنے یار و انصار میں سے تیس بہترین افراد کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کے ساتھ اظہار عقیدت کے لئے مدینہ بھیجا تھا اور یہ وہی تھے جو سورہ یٰسین کی آیات سن کر رو پڑے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔

معراج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علماء اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت مکہ میں تھے تو ایک ہی رات میں آپ قدرت الٰہی سے مسجد الحرام سے اقصی پہنچے کہ جو بیت المقدس میں ہے، وہاں سے آپ آسمانوں کی طرف گئے، آسمانی وسعتوں میں عظمت الٰہی کے آثار مشاہدہ کئے اور اسی رات مکہ واپس آ گئے۔

نیز یہ بھی مشہور ہے کہ یہ زمینی اور آسمانی سیر جسم اور روح کے ساتھ تھی البتہ یہ سیر چونکہ بہت عجیب غریب اور بے نظیر تھی لہٰذا بعض حضرات نے اس کی توجیہ کی اور اسے معراج روحانی قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک طرح کا خواب تھا یا مکاشفہ روحی تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بات قرآن کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ظاہر قرآن اس معراج کے جسمانی ہونے کی

گواہی دیتا ہے۔

معراج کی کیفیت قرآن وحدیث کی نظر سے

قرآن حکیم کی دو سورتوں میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پہلی سورت بنی اسرائیل ہے اس میں اس سفر کے ابتدائی حصے کا تذکرہ ہے۔ (یعنی مکہ کی مسجد الحرام سے بیت المقدس کی مسجد الاقصی تک کا سفر) اس سلسلے کی دوسری سورت سورہ نجم ہے اس کی آیات 13 تا 18 میں معراج کا دوسرا حصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آسمانی سیر کے متعلق ہے ارشاد ہوتا ہے:

ان چھ آیات کا مفہوم یہ ہے: رسول اللہ نے فرشتہ وحی جبرائیل کو اس کو اصلی صورت میں دوسری مرتبہ دیکھا (پہلے آپ اسے نزول وحی کے آغاز میں کوہ حرا میں دیکھ چکے تھے) یہ ملاقات بہشت جاوداں کے پاس ہوئی، یہ منظر دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کسی اشتباہ کا شکار نہ تھے آپ نے عظمت الٰہی کی عظیم نشانیاں مشاہدہ کیں۔

یہ آیات کہ جو اکثر مفسرین کے بقول واقعہ معراج سے متعلق ہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں پیش آیا خصوصاً **ما زاغ البصر وما طغی**۔ اس امر کا شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھ کسی خطا و اشتباہ اور انحراف سے دوچار نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے سلسلے میں مشہور اسلامی کتابوں میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں۔

علماء اسلام نے ان روایات کے تواتر اور شہرت کی گواہی دی ہے۔

معراج کی تاریخ

واقعہ معراج کی تاریخ کے سلسلے میں اسلامی مورخین کے درمیان اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بعثت کے دسویں سال 27 رجب کی شب پیش آیا، بعض کہتے ہیں کہ یہ بعثت

کے بارہویں سال 17 رمضان المبارک کی رات وقوع پذیر ہوا جب کہ بعض اسے اوائل بعثت میں ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ میں اختلاف، اصل واقعہ پر اختلاف میں حائل نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صرف مسلمان ہی معراج کا عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ دیگر ادیان کے پیروکاروں میں بھی کم وبیش یہ عقیدہ پایا جاتا ہے ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ عجیب تر صورت میں نظر آتا ہے جیسا کہ انجیل مرقس کے باب 6 لوقا کے باب 24 اور یوحنا کے باب 21 میں ہے:

عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہونے کے بعد دفن ہو گئے تو مردوں میں سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور چالیس روز تک لوگوں میں موجود رہے پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے (اور ہمیشہ کے لیے معراج پر چلے گئے)

ضمناً یہ وضاحت بھی ہو جائے کہ بعض اسلامی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ انبیاء کو بھی معراج نصیب ہوئی تھی۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آسمانی سفر چند مرحلوں میں طے کیا۔

پہلا مرحلہ، مسجد الحرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیانی فاصلہ کا مرحلہ تھا، جس کی طرف سورہ اسراء کی پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے: ''منزہ ہے وہ خدا جو ایک رات میں اپنے بندہ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا''۔ بعض معتبر روایات کے مطابق آپؐ نے اثناء راہ میں جبرائیل علیہ السلام کی معیت میں سرزمین مدینہ میں نزول فرمایا اور وہاں نماز پڑھی۔

اور مسجد الاقصیٰ میں بھی ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام انبیاء کی ارواح کی موجودگی میں نماز پڑھی اور امام جماعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، اس کے بعد وہاں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آسمانی سفر شروع ہوا، اور آپؐ نے ساتوں آسمانوں کو یکے بعد دیگرے عبور کیا اور ہر آسمان میں ایک نیا ہی منظر دیکھا، بعض آسمانوں میں پیغمبروں اور فرشتوں سے، بعض آسمانوں میں دوزخ اور دوزخیوں سے

اور بعض میں جنت اور جنتیوں سے ملاقات کی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے ہر ایک سے بہت سی تربیتی اور اصلاحی قیمتی باتیں اپنی روح پاک میں ذخیرہ کیں اور بہت سے عجائبات کا مشاہدہ کیا جن میں سے ہر ایک عالم ہستی کے اسرار میں سے ایک راز تھا، اور واپس آنے کے بعد ان کو صراحت کے ساتھ اور بعض اوقات کنایہ اور مثال کی زبان میں امت کی آگاہی کے لئے مناسب فرصتوں میں بیان فرماتے تھے، اور تعلیم و تربیت کے لئے اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس آسمانی سفر کا ایک اہم مقصد، ان قیمتی مشاہدات کے تربیتی و عرفانی نتائج سے استفادہ کرنا تھا، اور قرآن کی یہ پر معنی تعبیر لقد رای من آیات ربه الکبری۔ [1]

ان تمام امور کی طرف ایک اجمالی اور سربستہ اشارہ ہو سکتی ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ بہشت اور دوزخ جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر معراج میں مشاہدہ کیا اور کچھ لوگوں کو وہاں عیش میں اور عذاب میں دیکھا، وہ قیامت والی جنت اور دوزخ نہیں تھیں، بلکہ وہ برزخ والی جنت و دوزخ تھیں، کیونکہ قرآن مجید کے مطابق جیسا کہ کہتا ہے کہ قیامت والی جنت و دوزخ قیام قیامت اور حساب و کتاب سے فراغت کے بعد نیکو کاروں اور بدکاروں کو نصیب ہوگی۔

آخر کار آپ ساتویں آسمان پر پہنچ گئے، وہاں نور کے بہت سے حجابوں کا مشاہدہ کیا، وہی جگہ جہاں پر "سدرة المنتہیٰ" اور "جنة الماویٰ" واقع تھی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جہان سراسر نور و روشنی میں، شہود باطنی کی اوج، اور قرب الی اللہ اور مقام "قاب قوسین او ادنی" پر فائز ہوئے اور خدا نے اس سفر میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے بہت سے اہم احکام دیئے اور بہت سے

---

[1] سورہ نجم آیت ۱۸

ارشادات فرمائے جن کا ایک مجموعہ اس وقت اسلامی روایات میں "احادیث قدسی" کی صورت میں ہمارے لئے یادگار رہ گیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایات کی تصریح کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عظیم سفر کے مختلف حصوں میں اچانک علی علیہ السلام کو اپنے پہلو میں دیکھا، اور ان روایات میں کچھ ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی علیہ السلام کے مقام کی حد سے زیادہ عظمت کی گواہ ہیں۔

معراج کی ان سب روایات کے باوجود کچھ ایسے پیچیدہ اور اسرار آمیز جملے ہیں جن کے مطالب کو کشف کرنا آسان نہیں ہے، اور اصطلاح کے مطابق روایات متشابہ کا حصہ ہیں یعنی ایسی روایات جن کی تشریح کو خود معصومین علیہم السلام کے سپرد کر دینا چاہئے۔ [1]

ضمنی طور پر، معراج کی روایات اہل سنت کی کتابوں میں بھی تفصیل سے آئی ہیں، اور ان کے راویوں میں سے تقریباً 30 افراد نے حدیث معراج کو نقل کیا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے: یہ اتنا لمبا سفر طے کرنا اور یہ سب عجیب اور قسم قسم کے حادثات، اور یہ ساری لمبی چوڑی گفتگو، اور یہ سب کے سب مشاہدات ایک ہی رات میں یا ایک رات سے بھی کم وقت میں کس طرح سے انجام پا گئے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے، سفر معراج ہرگز ایک عام سفر نہیں تھا، کہ اسے عام معیاروں سے پرکھا جائے نہ تو اصل سفر معمولی تھا اور نہ ہی آپ کی سواری معمولی اور عام تھی، نہ آپ کے مشاہدات عام اور معمولی تھے اور نہ ہی آپ کی گفتگو، اور نہ ہی وہ پیمانے جو اس میں استعمال ہوئے، ہمارے کرہ خاکی کے محدود اور چھوٹے پیمانوں کے مانند تھے، اور نہ ہی وہ تشبیہات جو اس میں بیان ہوئی ہیں ان مناظر کی عظمت کو بیان

---

[1] روایات معراج کے سلسلہ میں مزید اطلاع کے لئے بحار الانوار کی جلد 18 از ص 282 تا ص 410 رجوع فرمائیں

کرسکتی ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشاہدہ کیے، تمام چیزیں خارق العادت صورت میں، اور اس مکان وزمان سے خارج ہونے کے پیمانوں میں، جن سے ہم آشنا نہیں، واقع ہوئیں۔

اس بنا پر کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہ امور ہمارے کرہ زمین کے زمانی پیمانوں کے ساتھ ایک رات یا ایک رات سے بھی کم وقت میں واقع ہوئے ہوں [1]

معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

شیعہ اور سنی علمائے اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ یہ واقعہ عالم بیداری میں صورت پذیر ہوا، سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی مذکورہ آیات کا ظاہری مفہوم بھی اس امر کا شاہد ہے کہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا۔

تواریخ اسلامی بھی اس امر پر شاہد وصادق ہیں، تاریخ کہتی ہے: جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ معراج کا ذکر کیا تو مشرکین نے شدت سے اس کا انکار کردیا اور اسے آپ کے خلاف ایک بہانہ بنالیا۔

یہ بات گواہی دیتی ہے کہ رسول اللہؐ ہرگز خواب یا مکاشفہ روحانی کے مدعی نہ تھے ورنہ مخالفین اس قدر شوروغوغا نہ کرتے۔

یہ جو حسن بصری سے روایت ہے کہ: ''یہ واقعہ خواب میں پیش آیا''۔

اور اسی طرح جو حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ: ''خدا کی قسم بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے جدا نہیں ہوا صرف آپ کی روح آسمان پر گئی'' ایسی روایات ظاہراً سیاسی پہلو رکھتی ہیں۔

معراج کا مقصد

---

[1] تفسیر نمونہ ج 13 ص 97 تا 99

گزشتہ مباحث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معراج کا مقصد یہ نہیں کہ رسول اکرم ﷺ دیدار خدا کے لئے آسمانوں پر جائیں، جیسا کہ سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مغربی دانشور بھی نا آگاہی کی بناء پر دوسروں کے سامنے اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہیں ان میں سے ایک مسٹر "گیورگیو" بھی ہیں وہ بھی کتاب "محمد وہ پیغمبر ہیں جنہیں پھر سے پہچاننا چاہیے" [1] میں کہتے ہیں:

"محمد اپنے سفر معراج میں ایسی جگہ پہنچے کہ انہیں خدا کے قلم کی آواز سنائی دی، انہوں نے سمجھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حساب کتاب میں مشغول ہے البتہ وہ اللہ کے قلم کی آواز تو سنتے تھے مگر انہیں اللہ دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں"۔

یہ عبارت نشاندہی کرتی ہے کہ قلم لکڑی کا تھا، ایسا کہ کاغذ پر لکھتے وقت لرزتا تھا اور آواز پیدا کرتا تھا، اسی طرح کی اور بہت سارے خرافات اس میں موجود ہیں۔ جبکہ مقصد معراج یہ تھا کہ اللہ کے عظیم پیغمبر کائنات میں بالخصوص عالم بالا میں موجود عظمت الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں اور انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لئے ایک نیا ادراک اور ایک نئی بصیرت حاصل کریں۔

یہ ہدف واضح طور پر سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی آیت 18 میں بیان ہوا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے مقصد معراج پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "خدا ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی زمانہ گزرتا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باسیوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آکر آپ انہیں لوگوں سے بیان کریں"۔

---

[1] مذکورہ کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے "محمد پیغمبری کہ از نو باید شناخت" ص 125 دیکھئے

معراج اور سائنس

گزشتہ زمانے میں بعض فلاسفہ بطلیموس کی طرح یہ نظریہ رکھتے تھے کہ نو آسمان پیاز کے چھلکے کی طرح تہہ بہ تہہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں واقعہ معراج کو قبول کرنے میں ان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہی نظریہ تھا ان کے خیال میں اس طرح تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آسمان شگافتہ ہو گئے اور پھر آپس میں مل گئے۔ [1]

لیکن ''بطلیموسی'' نظریہ ختم ہو گیا تو آسمانوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ ختم ہو گیا البتہ علم ہیئت میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معراج کے سلسلے میں نئے سوالات ابھرے ہیں مثلاً:

1) ایسے فضائی سفر میں پہلی بار رکاوٹ کشش ثقل ہے کہ جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لئے کم از کم چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے۔

2) دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

3) تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اس حصہ میں سورج کی جلا دینے والی تپش ہے جبکہ جس حصہ پر سورج کی مستقیما روشنی پڑ رہی ہے اور اسی طرح اس حصے میں جان لیوا سردی ہے جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی ہے۔

4) اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ جو فضائے زمین کے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز **cosmic rays** الٹرا وائلٹ ریز **ultra violet rays** اور ایکس ریز **x**

---

[1] بعض قدیم فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ آسمانوں میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اصطلاح میں وہ کہتے تھے کہ افلاک میں۔۔۔''خرق'' (پھٹنا) اور ''التیام'' (ملنا) ممکن نہیں۔

rays یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے آرگانزم otganism کے لئے نقصان دہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں (زمین پر رہنے والوں کے لئے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تپش ختم ہو جاتی ہے)

5) ایک اور مشکل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اگرچہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باسی بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل ہے۔

6) آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دور حاضر کے سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہوگا کہ اس کی رفتار سے زیادہ ہو۔

ان سوالات کے پیش نظر چند چیزوں پر توجہ

ان امور کے جواب میں ان نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

1۔ہم جانتے ہیں کہ فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کے باوجود آخر کار انسان علم کی قوت سے اس پر دسترس حاصل کر چکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہو چکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے۔

2۔اس میں شک نہیں کہ مسئلہ معراج عمومی اور معمولی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ اللہ کی لامتناہی قدرت وطاقت کے ذریعے صورت پذیر ہوا اور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معجزہ عقلاً محال نہیں ہونا چاہئے اور جب معجزہ بھی عقلاً ممکن ہے تو باقی معاملات اللہ کی قدرت سے حل ہو جاتے ہیں۔

جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنالے جو زمینی

مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کرلے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کرسکیں اور ایسے لباس تیار کرلے کہ جو اسے انتہائی زیادہ گرمی اور سردی سے محفوظ رکھ سکیں اور مشق کے ذریعے بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کرلے، یعنی جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعے یہ کام کرسکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعہ یہ کام نہیں کرسکتا۔

ہمیں یقین ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس سفر کے لئے انتہائی تیز رفتار سواری دی تھی اور اس سفر میں درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں اپنی مدد کا لباس پہنایا تھا، ہاں یہ سواری کس قسم کی تھی اور اس کا نام کیا تھا براق؟ رفرف؟ یا کوئی اور؟ یہ مسئلہ قدرت کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تیز ترین رفتار کے بارے میں مذکورہ نظریہ آج کے سائنسدانوں کے درمیان متزلزل ہو چکا ہے اگرچہ آئن سٹائن اپنے مشہور نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

آج کے سائنسداں کہتے ہیں کہ امواج جاذبہ rdvs of at f flem زمانے کی احتیاج کے بغیر آن واحد میں دنیا کی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عالم کے پھیلاؤ سے مربوط حرکات میں ایسے منظومے موجود ہیں کہ جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے مرکز جہان سے دور ہو جاتے ہیں (ہم جانتے ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے اور ستارے اور نظام ہائے شمسی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں) (غور کیجئے گا) مختصر یہ کہ اس سفر کے لئے جو بھی مشکلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی عقلی طور پر اس راہ میں حائل نہیں ہے اور ایسی کوئی بنیاد نہیں کہ واقعہ معراج کو محال عقلی سمجھا جائے اس راستے میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے جو وسائل درکار ہیں وہ موجود ہوں تو ایسا ہو سکتا ہے۔

بہرحال واقعہ معراج نہ تو عقلی دلائل کے حوالے سے ناممکن ہے اور نہ دور حاضر کے سائنسی معیاروں کے لحاظ سے، البتہ اس کے غیر معمولی اور معجزہ ہونے کو سب قبول کرتے ہیں لہذا جب قطعی اور یقینی نقلی دلیل سے ثابت ہو جائے تو اسے قبول کر لینا چاہئے۔

شب معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کی باتیں

پیغمبر نے شب معراج پروردگار سبحان سے اس طرح سوال کیا:
پروردگارا: کونسا عمل افضل ہے؟
خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

"کوئی چیز میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے، اور جو کچھ میں نے تقسیم کر کے دیا ہے اس پر راضی ہونے سے بہتر نہیں ہے، اے محمدؐ جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہیں میری محبت ان کے شامل حال ہوگی اور جو لوگ میری خاطر ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور میری خاطر دوستی کے تعلقات رکھتے ہیں انہیں دوست رکھتا ہوں علاوہ برایں میری محبت ان لوگوں کے لئے جو مجھ پر توکل کریں فرض اور لازم ہے اور میری محبت کے لئے کوئی حد اور کنارہ اور اس کی انتہا نہیں ہے"۔

اس طرح سے محبت کی باتیں شروع ہوتی ہیں ایسی محبت جس کی کوئی انتہا نہیں، جو کشادہ اور اصولی طور پر عالم ہستی میں اسی محور محبت پر گردش کر رہا ہے۔

ایک اور دوسرے حصہ میں یہ آیا ہے۔

"اے احمد بچوں کی طرح نہ ہونا جو سبز و زرد اور زرق و برق کو دوست رکھتے ہیں اور جب انہیں کوئی عمدہ اور شیریں غذا دے دی جاتی ہے تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز کو بھول جاتے ہیں"۔

پیغمبر نے اس موقع پر عرض کیا: پروردگارا: مجھے کسی ایسے عمل کی ہدایت فرما جو تیری بارگاہ میں قرب کا باعث ہو۔

فرمایا: رات کو دن اور دن کو رات قرار دے۔

عرض کیا: کس طرح؟

فرمایا: اس طرح کے تیرا سونا نماز ہو اور ہرگز اپنے شکم کو مکمل طور پر سیر نہ کرنا۔

ایک اور حصہ میں آیا ہے:

''اے احمد میری محبت فقیروں اور محروموں سے محبت ہے، ان کے قریب ہو جاؤ اور ان کی مجلس کے قریب بیٹھو کہ میں تیرے نزدیک ہوں اور دنیا پرست اور ثروت مندوں کو اپنے سے دور رکھو اور ان کی مجالس سے بچتے رہو''۔

اہل دنیا و آخرت

ایک اور حصہ میں آیا ہے:

''اے احمد دنیا کے زرق برق اور دنیا پرستوں کو مبغوض شمار کر اور آخرت کو محبوب رکھ''

عرض کرتے ہیں:

پروردگارا: اہل دنیا اور اہل آخرت کون ہیں؟

فرمایا: ''اہل دنیا تو وہ لوگ ہیں جو زیادہ کھاتے ہیں زیادہ ہنستے ہیں زیادہ سوتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں اور تھوڑا خوش ہوتے ہیں نہ ہی تو برائیوں کے مقابلہ میں کسی سے عذر چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی کسی عذر چاہنے والے سے اس کا عذر قبول کرتے ہیں اطاعت خدا میں سست ہیں اور گناہ کرنے میں دلیر ہیں، لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے ہیں حالانکہ ان کی اجل قریب آپہنچی ہے مگر وہ ہرگز اپنے اعمال کا حساب نہیں کرتے ان سے لوگوں کو بہت کم نفع ہوتا ہے، باتیں زیادہ کرتے ہیں احساس ذمہ داری نہیں رکھتے اور کھانے پینے سے ہی غرض رکھتے ہیں۔

اہل دنیا نہ تو نعمت میں خدا کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور نہ ہی مصائب میں صبر کرتے

ہیں۔زیادہ خدمات بھی ان کی نظر میں تھوڑی ہیں (اور خود ان کی اپنی خدمات تھوڑی بھی زیادہ ہیں) اپنے اس کام کے انجام پانے پر جو انہوں نے انجام نہیں دیا ہے تعریف کرتے ہیں اور ایسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں جو ان کا حق نہیں ہے۔ ہمیشہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی بات کرتے ہیں اور لوگوں کے عیوب تو بیان کرتے رہتے ہیں لیکن انؐ کی نیکیوں کو چھپاتے ہیں"۔

عرض کیا: پروردگارا: کیا دنیا پرست اسؐ کے علاوہ بھی کوئی عیب رکھتے ہیں؟

فرمایا: "اے احمد ان کا عیب یہ ہے کہ جہل اور حماقت ان میں بہت زیادہ ہے جس استاد سے انہوں علم سیکھا ہے وہ اس سے تواضع نہیں کرتے اور اپنے آپ کو عاقل کل سمجھتے ہیں حالانکہ وہ صاحبان علم کے نزدیک نادان اور احمق ہیں"۔

اہل بہشت کے صفات

خداوند عالم اس کے بعد اہل آخرت اور بہشتیوں کے اوصاف کو یوں بیان کرتا ہے:

"وہ ایسے لوگ ہیں جو باحیا ہیں ان کی جہالت کم ہے، ان کے منافع زیادہ ہیں،لوگ ان سے راحت وآرام میں ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے ہاتھوں تکلیف میں ہوتے ہیں اور ان کی باتیں سنجیدہ ہوتی ہیں"۔

وہ ہمیشہ اپنے اعمال کا حساب کرتے رہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ خود کو زحمت میں ڈالتے رہتے ہیں ان کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار ہوتے ہیں ان کی آنکھ گریاں ہوتی ہے اور ان کا دل ہمیشہ یاد خدا میں مصروف رہتا ہے جس وقت لوگ غافلوں کے زمرہ میں لکھے جارہے ہوں وہ اس وقت ذکر کرنے والوں میں لکھے جاتے ہیں۔

نعمتوں کے آغاز میں حمد خدا بجالاتے ہیں اور ختم ہونے پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی دعائیں بارگاہ خدا میں قبول ہوتی ہیں اور ان کی حاجتیں پوری کی جاتی ہیں اور فرشتے ان

کے وجود سے مسرور اور خوش رہتے ہیں (غافل) لوگ ان کے نزدیک مردہ ہیں اور خدا اُن کے نزدیک حی و قیوم اور کریم ہے (ان کی ہمت اتنی بلند ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کے اوپر نظر نہیں رکھتے)

لوگ تو اپنی عمر میں صرف ایک ہی دفعہ مرتے ہیں لیکن وہ جہاد بالنفس اور ہوا و ہوس کی مخالفت کی وجہ سے ہر روز ستر مرتبہ مرتے ہیں (اور نئی زندگی پاتے ہیں)

جس وقت عبادت کے لئے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک فولادی بند اور بنیان مرصوص کے مانند ہوتے ہیں اور ان کے دل میں مخلوقات کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے کہ میں انہیں ایک پاکیزہ زندگی بخشوں گا اور عمر کے اختتام پر میں خود ان کی روح کو قبض کروں گا اور ان کی پرواز کے لئے آسمان کے دروازوں کو کھول دوں گا تمام حجابوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دوں گا اور حکم دوں گا کہ بہشت خود اپنے کو ان کے لئے آراستہ کرے" اے احمد عبادت کے دس حصہ ہیں جن میں سے نو حصے طلب رزق حلال میں ہیں جب تیرا کھانا اور پینا حلال ہوگا تو تیری حفظ و حمایت میں ہوگا"۔

بہترین اور جاویدانی زندگی

ایک اور حصہ میں آیا ہے: "اے احمد کیا تو جانتا ہے کہ کونسی زندگی زیادہ گوارا اور زیادہ دوام رکھتی ہے"؟

عرض کیا: خداوندا: نہیں۔

فرمایا: "گوارا زندگی وہ ہوتی ہے جس کا صاحب ایک لمحہ کے لئے بھی میری یاد سے غافل نہ رہے، میری نعمت کو فراموش نہ کرے، میرے حق سے بے خبر نہ رہے اور رات دن میری رضا کو طلب کرے۔

لیکن باقی رہنے والی زندگی وہ ہے جس میں اپنی نجات کے لئے عمل کرے، دنیا اس کی نظر میں حقیر ہو اور آخرت بڑی اور بزرگ ہو، میری رضا کو اپنی رضا پر مقدم کرے، اور ہمیشہ میری خوشنودی کو طلب کرے، میرے حق کو بڑا سمجھے اور اپنی نسبت میری آگاہی کی طرف توجہ رکھے۔

ہر گناہ اور معصیت پر مجھے یاد کر لیا کرے، اور اپنے دل کو اس چیز سے جو مجھے پسند نہیں ہے پاک رکھے، شیطانی وسوسوں کو مبغوض رکھے، اور ابلیس کو اپنے دل پر مسلط نہ کرے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو میں ایک خاص قسم کی محبت کو اس کے دل میں ڈال دوں گا اس طرح سے کہ اس کا دل میرے اختیار میں ہوگا، اس کی فرصت اور مشغولیت اس کا ہم وغم اور اس کی بات ان نعمتوں کے بارے میں ہوگی جو میں اہل محبت کو بخشتا ہوں۔ میں اس کی آنکھ اور دل کے کان کھول دیتا ہوں تا کہ وہ اپنے دل کے کان سے غیب کے حقائق کو سنے اور اپنے دل سے میرے جلال وعظمت کو دیکھے"۔

اور آخر میں یہ نورانی حدیث ان بیدار کرنے والے جملوں پر ختم ہو جاتی ہے: اے احمد اگر کوئی بندہ تمام اہل آسمان اور تمام اہل زمین کے برابر نماز ادا کرے، اور تمام اہل آسمان وزمین کے برابر روزہ رکھے، فرشتوں کی طرح کھانا نہ کھائے اور کوئی فاخرہ لباس بدن پر نہ پہنے (اور انتہائی زہد اور پارسائی کی زندگی بسر کرے) لیکن اس کے دل میں ذرہ برابر بھی دنیا پرستی یا ریاست طلبی یا زینت دنیا کا عشق ہو تو وہ میرے جاودانی گھر میں میرے جوار میں نہیں ہوگا اور میں اپنی محبت کو اس کے دل سے نکال دوں گا، میرا سلام ورحمت تجھ پر ہو، والحمد للہ رب العالمین۔

یہ عرشی باتیں۔۔۔ جو انسانی روح کو آسمانوں کی طرف بلند کرتی ہیں، اور آستانہ عشق وشہود کی طرف کھینچتی ہیں۔ حدیث قدسی کا صرف ایک حصہ ہے۔

مزید براں ہمیں اطمینان ہے کہ پیغمبر نے اپنے ارشادات میں جو کچھ بیان فرمایا ہے ان کے علاوہ بھی، اس شب عشق وشوق اور جذبہ ووصال کی شب میں، ایسی باتیں، اسرار ورموز اور اشارے آپ کے اور آپ کے محبوب کے درمیان ہوتے ہیں جن کو نہ تو کان سننے کی طاقت

رکھتے ہیں اور نہ عام افکار میں ان کے درک کی صلاحیت ہے، اور اسی بنا پر وہ ہمیشہ پیغمبر کے دل وجان کے اندر ہی مکتوم اور پوشیدہ رہے، اور آپ کے خواص کے علاوہ کوئی بھی ان سے آگاہ نہیں ہوا۔

ہجرت پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [1]

مختلف قبائل قریش اور اشراف مکہ کا ایک گروہ جمع ہوا تا کہ وہ "دارالندوہ" میں میٹنگ کریں اور انہیں رسول اللہ کی طرف سے درپیش خطرے پر غور وفکر کریں۔

(کہتے ہیں) اثنائے راہ میں انہیں ایک خوش ظاہر بوڑھا شخص ملا جو دراصل شیطان تھا (یا کوئی انسان جو شیطانی روح وفکر کا حامل تھا)۔

انہوں نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟

کہنے لگا: اہل نجد کا ایک بڑا بوڑھا ہوں، مجھے تمہارے ارادے کی اطلاع ملی تو میں نے چاہا کہ تمہاری میٹنگ میں شرکت کروں اور اپنا نظریہ اور خیر خواہی کی رائے پیش کرنے میں دریغ نہ کروں۔

کہنے لگے: بہت اچھا اندر آجایئے۔

اس طرح وہ بھی "دارالندوہ" میں داخل ہو گیا۔

حاضرین میں سے ایک نے ان کی طرف رخ کیا اور (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہا: اس شخص کے بارے میں کوئی سوچ بچار کرو، کیونکہ بخدا ڈر ہے کہ وہ تم پر کامیاب ہو جائے (اور تمہارے دین اور تمہاری عظمت کو خاک میں ملا دے گا)

ایک نے تجویز پیش کی: اسے قید کر دو یہاں تک کہ زندان ہی میں مر جائے۔

---

[1] سورہ انفال آیت 30 کے ذیل میں واقعہ ہجرت بیان ہوا ہے۔

بوڑھے نجدی نے اس تجویز پر اعتراض کیا اور کہا: اس میں خطرہ یہ ہے کہ اس کے طرفدار ٹوٹ پڑیں گے اور کسی مناسب وقت اسے قید خانے سے چھڑا کر اس سرزمین سے باہر لے جائیں لہٰذا کوئی اور بنیادی بات کرو۔

ایک اور شخص نے کہا: اسے اپنے شہر سے نکال دو تاکہ تمہیں اس سے چھٹکارا مل جائے کیونکہ جب وہ تمہارے درمیان سے چلا جائے گا تو پھر جو کچھ بھی کرتا پھرے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور پھر وہ دوسروں ہی سے سروکار رکھے گا۔

اس بوڑھے نجدی نے کہا: واللہ یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے، کیا تم اس کی شیریں بیانی، قدرت زبان اور لوگوں کے دلوں میں اس کے نفوذ نہیں دیکھتے؟ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمام دنیائے عرب کے پاس جائے گا اور وہ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور پھر وہ ایک انبوہ کثیر کے ساتھ تمہاری طرف پلٹے گا اور تمہیں تمہارے شہروں سے نکال باہر کرے گا اور بڑوں کو قتل کر دے گا۔

مجمع نے کہا: بخدا یہ سچ کہہ رہا ہے کوئی اور تجویز سوچو۔

ابوجہل کی رائے

ابوجہل ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، اس نے گفتگو شروع کی اور کہا: میرا ایک نظریہ ہے اور اس کے علاوہ میں کسی رائے کو صحیح نہیں سمجھتا۔

حاضرین کہنے لگے: وہ کیا ہے؟

کہنے لگا: ہم ہر قبیلے سے ایک بہادر شمشیر زن کا انتخاب کریں اور ان میں سے ہر ایک ہاتھ میں ایک تیز تلوار دے دیں اور پھر وہ سب مل کر موقع پاتے ہی اس پر حملہ کریں جب وہ اس صورت میں قتل ہو گا تو اس کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور میں نہیں سمجھتا کہ بنی ہاشم تمام

قبائل قریش سے لڑ سکیں گے لہٰذا مجبوراً اس صورت میں خون بہا پر راضی ہو جائیں گے اور یوں ہم بھی اس کے آزار سے نجات پالیں گے۔

بوڑھے نجدی نے (خوش ہو کر) کہا: بخدا: صحیح رائے یہی ہے جو اس جواں مرد نے پیش کی ہے میرا بھی اس کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں۔

اس طرح یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوگئی اور وہ یہی مصمم ارادہ لے کر وہاں سے اٹھے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جان بیچ ڈالی

جبرائیل نازل ہوئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ملا کہ وہ رات کو اپنے بستر پر نہ سوئیں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو غار ثور کی طرف روانہ ہو گئے اور حکم دے گئے کہ علی آپ کے بستر پر سو جائیں (تاکہ جو لوگ دروازے کی دراز سے بستر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نظر رکھے ہوئے ہیں انہیں بستر پر سویا ہوا سمجھیں اور آپ کو خطرے کے علاقہ سے دور نکل جانے کی مہلت مل جائے)۔

اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی کہتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قرضوں کی ادائیگی اور موجود امانتوں کی واپسی کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ مقرر کیا اور جس رات آپ غار ثور کی طرف جانا چاہتے تھے اس رات مشرکین آپ پر حملہ کرنے کے لئے آپ کے گھر کا چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے، آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ آپ کے بستر پر لیٹ جائیں، اپنی مخصوص سبز رنگ کی چادر انہیں اوڑھنے کو دی، اس وقت خداوند عالم نے جبرائیل اور میکائیل پر وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ اور اخوت قائم کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ مقرر کیا ہے تم میں سے کون ہے جو ایثار کرتے ہوئے دوسرے کی زندگی کو اپنی حیات پر ترجیح دے ان میں سے کوئی بھی اس کے

لئے تیار نہ ہوا تو ان پر وحی ہوئی کہ اس وقت علی میرے پیغمبر کے بستر پر سویا ہوا ہے اور وہ تیار ہے کہ اپنی جان ان پر قربان کردے، زمین پر جاؤ اور اس کے محافظ ونگہبان بن جاؤ، جب جبرائیل، حضرت علی علیہ السلام کے سرہانے آئے اور میکائیل پاؤں کی طرف بیٹھے تو جبرائیل کہہ رہے تھے: سبحان اللہ، صد آفرین آپ پر اے علی علیہ السلام کہ خدا آپ کے ذریعے فرشتوں پر فخر ومباہات کررہا ہے، اس موقع پر آیت نازل ہوئی "کچھ لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے" اور اسی بناء پر وہ تاریخی رات "لیلۃ المبیت" (شب ہجرت) کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ابن عباس کہتے ہیں: جب پیغمبر ﷺ مشرکین سے چھپ کر ابوبکر کے ساتھ غار کی طرف جارہے تھے یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی جو اس وقت بستر رسول ﷺ پر سوئے ہوئے تھے۔

ابوجعفر اسکافی کہتے ہیں: جیسے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ، جلد 3 ص 270 پر لکھا ہے:

پیغمبر ﷺ کے بستر پر حضرت علی علیہ السلام کے سونے کا واقعہ تواتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار غیر مسلموں اور کم ذہن لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔ [1]

جب صبح ہوئی تو مشرکین گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے جستجو کی تو حضرت علی علیہ السلام کو پیغمبر ﷺ کی جگہ پر دیکھا۔ اس طرح سے خدا نے ان کی سازش کو نقش برآب کردیا۔

وہ پکارے: محمد کہاں ہے؟

---

[1] الغدیر، جلد 2 ص 45 پر ہے کہ غزالی نے احیاء العلوم ج 3 ص 238 پر، صفوری نے نزہۃ المجالس ج 2، ص 209 پر، ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ، میں سبط ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص ص 21 پر، امام احمد نے مسند ج 1 ص 348 پر، تاریخ طبری جلد 2 ص 99 پر، سیرۃ ابن ہشام ج 2، ص 291 پر، سیرۃ حلبی ج 1 ص 29 پر، تاریخ یعقوبی ج 2 ص 29 پر لیلۃ المبیت کے واقعہ کو نقل کیا ہے۔

آپ نے جواب دیا: میں نہیں جانتا۔

وہ آپ کے پاؤں کے نشانوں پر چل پڑے یہاں تک کہ غار کے پاس پہنچ گئے لیکن (انہوں نے تعجب سے دیکھا کہ مکڑی نے غار کے سامنے جالا تن رکھا ہے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر وہ اس غار میں ہوتے تو غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا، اس طرح وہ واپس چلے گئے)

پیغمبر ﷺ تین دن تک غار کے اندر رہے (اور جب دشمن مکہ کے تمام بیابانوں میں آپ کو تلاش کر چکے اور تھک ہار کر مایوس پلٹ گئے تو آپ مدینہ کی طرف چل پڑے)۔

قبلہ کی تبدیلی

بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں اور چند ماہ تک مدینہ میں پیغمبر اسلام ﷺ حکم خدا سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد قبلہ بدل گیا اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مکہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

مدینہ میں کتنے ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی رہی؟ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے، یہ مدت سات ماہ سے لے کر سترہ ماہ تک بیان کی گئی ہے لیکن یہ جتنا عرصہ بھی تھا اس دوران یہودی مسلمانوں کو طعنہ زنی کرتے رہے کیونکہ بیت المقدس دراصل یہودیوں کا قبلہ تھا وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی قبلہ نہیں بلکہ ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہم حق پر ہیں۔

یہ باتیں پیغمبر اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے لئے ناگوار تھیں ایک طرف وہ فرمان الٰہی کے مطیع تھے اور دوسری طرف یہودیوں کے طعنے ختم نہ ہوتے تھے، اسی لئے پیغمبر اکرم ﷺ آسمان کی طرف دیکھتے تھے گویا وحی الٰہی کے منتظر تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خانہ کعبہ سے خاص لگاؤ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خصوصیت سے چاہتے تھے کہ قبلہ، کعبہ کی طرف تبدیل ہو جائے اور آپ انتظار میں رہتے تھے کہ خدا کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی حکم نازل ہو، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے آثار سے عشق تھا، علاوہ ازایں کعبہ توحید کا قدیم ترین مرکز تھا، آپؐ جانتے تھے کہ بیت المقدس تو وقتی قبلہ ہے لیکن آپ کی خواہش تھی کہ حقیقی و آخری قبلہ جلد معین ہو جائے۔

آپ چونکہ حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم تھے، پس آپ یہ تقاضا زبان تک نہ لاتے صرف منتظر نگاہیں آسمان کی طرف لگائے ہوئے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو کعبہ سے کس قدر عشق اور لگاؤ تھا۔

اس انتظار میں ایک عرصہ گزر گیا یہاں تک کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم صادر ہوا ایک روز مسجد ''بنی سالم'' میں پیغمبر نماز ظہر پڑھا رہے تھے دو رکعتیں پڑھ چکے تھے کہ جبرائیل کو حکم ہوا کہ پیغمبر کا بازو تھام کر ان کا رخ انور کعبہ کی طرف پھیر دیں۔

مسلمانوں نے بھی فوراً اپنی صفوں کا رخ بدل لیا، یہاں تک کہ ایک روایت میں منقول ہے کہ عورتوں نے اپنی جگہ مردوں کو دی اور مردوں نے اپنی جگہ عورتوں کو دیدی، (توجہ رہے کہ بیت المقدس شمالی سمت میں تھا، اور خانہ کعبہ جنوبی سمت میں تھا۔)

اس واقعے سے یہودی بہت پریشان ہوئے اور اپنے پرانے طریقہ کے مطابق، ڈھٹائی، بہانہ سازی اور طعنہ بازی کا مظاہرہ کرنے لگے پہلے تو کہتے تھے کہ ہم مسلمانوں سے بہتر ہیں کیونکہ ان کا کوئی اپنا قبلہ نہیں، یہ ہمارے پیروکار ہیں لیکن جب خدا کی طرف سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا تو انہوں نے پھر زبان اعتراض دراز کی چنانچہ قرآن کہتا ہے۔

''بہت جلد کم عقل لوگ کہیں گے ان (مسلمانوں) کو کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا

جس پر وہ پہلے تھے"۔ [1]

مسلمانوں نے اس سے کیوں اعراض کیا ہے جو گذشتہ زمانہ میں انبیائے ماسلف کا قبلہ رہا ہے، اگر پہلا قبلہ صحیح تھا تو اس تبدیلی کا کیا مقصد، اور اگر دوسرا صحیح ہے تو پھر تیرہ سال اور پندرہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے کیوں نماز پڑھتے رہے ہیں۔؟

چنانچہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا:

"ان سے کہہ دو عالم کے مشرق و مغرب اللہ کے لئے ہیں وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے"۔ [2]

تبدیلی قبلہ کا راز

بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی ان سب کے لئے اعتراض کا موجب بنی جن کا گمان تھا کہ ہر حکم کو مستقل رہنا چاہئے تھا اگر ہمارے لئے ضروری تھا کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھیں تو پہلے دن یہ حکم کیوں نہ دیا گیا اور اگر بیت المقدس مقدم ہے جو گذشتہ انبیاء کا بھی قبلہ شمار ہوتا ہے تو پھر اسے کیوں بدلا گیا۔؟

دشمنوں کے ہاتھ بھی طعنہ زنی کا موقع آ گیا، شاید وہ کہتے تھے کہ پہلے تو انبیاء ماسبق کے قبلہ کی طرف نماز پڑھتا تھا لیکن کامیابیوں کے بعد اس پر قبیلہ پرستی نے غلبہ کر لیا ہے لہذا اپنی قوم اور قبیلے کے قبلہ کی طرف پلٹ گیا ہے یا کہتے تھے کہ اس نے دھوکا دینے اور یہود و نصاریٰ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے۔ ے پہلے بیت المقدس کو قبول کر لیا اور جب یہ بات کارگر نہ ہو سکی تو اب کعبہ کی طرف رخ کر لیا ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت 142

[2] سورہ بقرہ آیت 142

واضح ہے کہ ایسے وسوسے اور وہ بھی ایسے معاشرے میں جہاں ابھی نور علم نہ پھیلا ہو اور جہاں شرک و بت پرستی کی رسمیں موجود ہوں کیسا تذبذب واضطراب پیدا کردیتے ہیں اسی لئے قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ "یہ مومنین اور مشرکین میں امتیاز پیدا کرنے والی ایک عظیم آزمائش تھی"۔ [1]

ممکن ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کے اہم اسباب میں سے درج ذیل مسئلہ بھی ہو خانہ کعبہ اس وقت مشرکین کے بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا لہٰذا حکم دیا گیا کہ مسلمان وقتی طور پر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیا کریں تا کہ اس طرح مشرکین سے اپنی صفیں الگ کرسکیں۔

لیکن جب مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلامی حکومت وملت کی تشکیل ہوگئی اور مسلمانوں کی صفیں دوسروں سے مکمل طور پر ممتاز ہوگئیں تو اب یہ کیفیت برقرار رکھنا ضروری نہ رہا، لہٰذا اس وقت کعبہ کی طرف رخ کرلیا گیا جو قدیم ترین مرکز توحید اور انبیاء کا بہت پرانا مرکز تھا۔

ایسے میں ظاہر ہے کہ جو کعبہ کو اپنا خاندانی معنوی اور روحانی سرمایہ سمجھتے تھے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ان کے لئے مشکل تھا اور اسی طرح بیت المقدس کے بعد کعبہ کی طرف پلٹنا، لہٰذا اس میں مسلمانوں کی سخت آزمائش تھی تا کہ شرک کے جتنے آثار ان میں باقی رہ گئے تھے اس کٹھالی میں پڑ کر جل جائیں اور ان کے گذشتہ شرک آلود رشتے ناتے ٹوٹ جائیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اصولی طور پر تو خدا کے لئے مکان نہیں ہے قبلہ تو صرف وحدت اور صفوں میں اتحاد کا ایک رمز ہے اور اس کی تبدیلی کسی چیز کو دگرگوں نہیں کرسکتی، اہم ترین امر تو خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور تعصب اور ہٹ دھرمی کے بتوں کو توڑنا ہے۔

---

[1] سورہ بقرہ آیت 143

جنگ بدر [1]

جنگ بدر کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ مکہ والوں کا ایک اہم تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جارہا تھا اس قافلے کو مدینہ کی طرف سے گزرنا تھا اہل مکہ کا سردار ابوسفیان قافلہ کا سالار تھا اس کے پاس ہزار دینار کا مال تجارت تھا پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے اصحاب کو اس عظیم قافلے کی طرف تیزی سے کوچ کا حکم دیا کہ جس کے پاس دشمن کا ایک بڑا سرمایہ تھا تاکہ اس سرمائے کو ضبط کر کے دشمن کی اقتصادی قوت کو سخت ضرب لگائی جائے تاکہ اس کا نقصان دشمن کی فوج کو پہنچے۔

پیغمبر اور ان کے اصحاب ایسا کرنے کا حق رکھتے تھے کیونکہ مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے آئے تو اہل مکہ نے ان کے بہت سے اموال پر قبضہ کر لیا تھا جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لہذا وہ حق رکھتے تھے کہ اس نقصان کی تلافی کریں۔ اس سے قطع نظر بھی اہل مکہ نے گذشتہ تیرہ برس میں پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں سے جو سلوک روا رکھا اس سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی وہ مسلمانوں کو ضرب لگانے اور نقصان پہنچانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوائیں گے یہاں تک کہ وہ خود پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کرنے پر تل گئے تھے ایسا دشمن پیغمبر اکرم ﷺ کے ہجرت مدینہ کی وجہ سے بے کار نہیں بیٹھ سکتا تھا واضح تھا کہ وہ قاطع ترین ضرب لگانے کے لئے اپنی قوت مجتمع کرتا پس عقل و منطق کا تقاضا تھا کہ پیش بندی کے طور پر ان کے تجارتی قافلے کو گھیر کر اس کے اتنے بڑے سرمائے کو ضبط کر لیا جاتا تاکہ اس پر ضرب پڑے اور اپنی فوجی اور اقتصادی بنیاد مضبوط کی جاتی ایسے اقدامات آج بھی اور گذشتہ ادوار میں بھی عام دنیا میں فوجی طریقہ کار کا حصہ رہے ہیں، جو لوگ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے

---

[1] واقعہ جنگ بدر سورہ انفال آیات 5 تا 18 کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

قافلے کی طرف پیغمبر کی پیش قدمی کو ایک طرح کی غارت گری کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں یا تو وہ حالات سے آگاہ نہیں اور اسلام کے تاریخی مسائل کی بنیادوں سے بے خبر ہیں اور یا ان کے کچھ مخصوص مقاصد ہیں جن کے تحت وہ واقعات وحقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں بہر حال ایک طرف ابوسفیان کو مدینہ میں اس کے ذریعے اس امر کی اطلاع مل گئی اور دوسری طرف اس نے اہل مکہ کو صورت حال کی اطلاع کے لئے ایک تیز رفتار قاصد روانہ کر دیا کیونکہ شام کی طرف جاتے ہوئے بھی اسے اس تجارتی قافلہ کی راہ میں رکاوٹ کا اندیشہ تھا۔

قاصد، ابوسفیان کی نصیحت کے مطابق اس حالت میں مکہ میں داخل ہوا کہ اس نے اپنے اونٹ کی ناک کو چیر دیا تھا اس کے کان کاٹ دیئے تھے، خون ہیجان انگیز طریقہ سے اونٹ سے بہہ رہا تھا، قاصد نے اپنی قمیص کو دونوں طرف سے پھاڑ دیا تھا اونٹ کی پشت کی طرف منہ کرکے بیٹھا ہوا تھا تاکہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، مکہ میں داخل ہوتے ہی اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا:

اے کامیاب وکامران لوگو اپنے قافلے کی خبر لو، اپنے کارواں کی مدد کرو۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ تم وقت پر پہنچ سکو، محمد اور تمہارے دین سے نکل جانے والے افراد قافلے پر حملے کے لئے نکل چکے ہیں۔

اس موقع پر پیغمبر ﷺ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا ایک عجیب وغریب خواب تھا مکہ میں زبان زد خاص وعام تھا اور لوگوں کے ہیجان میں اضافہ کر رہا تھا۔ خواب کا ماجرا یہ تھا کہ عاتکہ نے تین روز قبل خواب میں دیکھا کہ:

ایک شخص پکار رہا ہے کہ لوگو اپنی قتل گاہ کی طرف جلدی چلو، اس کے بعد وہ منادی کوہ ابوقبیس کی چوٹی پر چڑھ گیا اس نے پتھر کی ایک بڑی چٹان کو حرکت دی تو وہ چٹان ریزہ ریزہ ہوگئی اور اس کا ایک ایک ٹکڑا قریش کے ایک ایک گھر میں جا پڑا اور مکہ کے درے سے خون کا سیلاب جاری ہوگیا۔

عاتکہ وحشت زدہ ہوکر خواب سے بیدار ہوئی اور اپنے بھائی عباس کو سنایا۔ اس طرح خواب لوگوں تک پہنچا تو وہ وحشت و پریشانی میں ڈوب گئے۔ ابوجہل نے خواب سنا تو بولا: یہ عورت دوسرا پیغمبر ہے جو اولادِ عبدالمطلب میں ظاہر ہوا ہے لات وعزیٰ کی قسم ہم تین دن کی مہلت دیتے ہیں اگر اتنے عرصے میں اس خواب کی تعبیر ظاہر نہ ہوئی تو ہم آپس میں ایک تحریر لکھ کر اس پر دستخط کریں گے کہ بنی ہاشم قبائل عرب میں سے سب سے زیادہ جھوٹے ہیں تیسرا دن ہوا تو ابوسفیان کا قاصد آ پہنچا، اس کی پکار نے تمام اہل مکہ کو ہلا کر رکھ دیا۔

اور چونکہ تمام اہل مکہ کا اس قافلے میں حصہ تھا سب فوراً جمع ہو گئے ابوجہل کی کمان میں ایک لشکر تیار ہوا، اس میں 950 جنگجو تھے جن میں سے بعض انکے بڑے اور مشہور سردار اور بہادر تھے 700 اونٹ تھے اور 100 گھوڑے تھے لشکر مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسری طرف چونکہ ابوسفیان مسلمانوں سے بچ کر نکلنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے راستہ بدل دیا اور مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

313 وفادار ساتھی

پیغمبر اسلام ﷺ 313 افراد کے ساتھ جن میں تقریباً تمام مجاہدین اسلام تھے سرزمین بدر کے پاس پہنچ گئے تھے یہ مقام مکہ اور مدینہ کے راستے میں ہے یہاں آپ کو قریش کے لشکر کی روانگی کی خبر ملی اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ کیا ابوسفیان کے قافلہ کا تعاقب کیا جائے اور قافلہ کے مال پر قبضہ کیا جائے یا لشکر کے مقابلے کے لئے تیار ہوا جائے؟ ایک گروہ نے دشمن کے لشکر کا مقابلہ کرنے کو ترجیح دی جب کہ دوسرے گروہ نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور قافلہ کے تعاقب کو ترجیح دی، ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم مدینہ سے مکہ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے ارادہ سے نہیں نکلے تھے اور ہم نے اس لشکر کے مقابلے کے لئے جنگی تیاری نہیں کی تھی جب

کہ وہ ہماری طرف پوری تیاری سے آرہا ہے۔

اس اختلاف رائے اور تردد میں اس وقت اضافہ ہوگیا جب انہیں معلوم تھا کہ دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً تین گنا ہے اور ان کا ساز وسامان بھی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، ان تمام باتوں کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ نے پہلے گروہ کے نظریے کو پسند فرمایا اور حکم دیا کہ دشمن کی فوج پر حملہ کی تیاری کی جائے۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو دشمن کو یقین نہ آیا کہ مسلمان اس قدر کم تعداد اور ساز وسامان کے ساتھ میدان میں آئے ہوں گے، ان کا خیال تھا کہ سپاہ اسلام کا اہم حصہ کسی مقام پر چھپا ہوا ہے تاکہ وہ غفلت میں کسی وقت ان پر حملہ کردے لہٰذا انہوں نے ایک شخص کو تحقیقات کے لئے بھیجا، انہیں جلدی معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی جمعیت یہی ہے جسے وہ دیکھ رہے ہیں۔

دوسری طرف جیسا کہ ہم نے کہا ہے مسلمانوں کا ایک گروہ وحشت وخوف میں غرق تھا اس کا اصرار تھا کہ اتنی بڑی فوج جس سے مسلمانوں کا کوئی موازنہ نہیں، خلاف مصلحت ہے، لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے وعدہ سے انہیں جوش دلایا اور انہیں جنگ پر اُبھارا، آپ نے فرمایا: کہ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں کامیابی حاصل ہوگی قریش کے قافلہ پر یا لشکر قریش پر اور خدا کے وعدہ کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

خدا کی قسم ابوجہل اور کئی سرداران قریش کے لوگوں کی قتل گاہ کو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ بدر کے کنوئیں کے قریب پڑاؤ ڈالیں۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے خواب میں اس جنگ کا منظر دیکھا تھا، آپ نے دیکھا کہ دشمن کی ایک قلیل سی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں آئی ہے، یہ دراصل کامیابی کی ایک بشارت تھی آپ نے بعینہ یہ خواب مسلمانوں کے سامنے بیان کردیا، یہ بات مسلمانوں کے میدان بدر

کی طرف پیش روی کے لئے ان کے جذبہ اور عزم کی تقویت کا باعث بنی۔

البتہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خواب صحیح دیکھا تھا کیونکہ دشمن کی قوت اور تعداد اگرچہ ظاہراً بہت زیادہ تھی لیکن باطناً کم، ضعیف اور ناتواں تھی، ہم جانتے ہیں کہ خواب عام طور پر اشارے اور تعبیر کا پہلو رکھتے ہیں، اور ایک صحیح خواب میں کسی مسئلے کا باطنی چہرہ آشکار ہوتا ہے۔

قریش کا ایک ہزار کا لشکر

اس ہنگامے میں ابوسفیان اپنا قافلہ خطرے کے علاقے سے نکال لے گیا۔ اصل راستے سے ہٹ کر دریائے احمر کے ساحل کی طرف سے وہ تیزی سے مکہ پہنچ گیا۔ اس کے ایک قاصد کے ذریعے لشکر کو پیغام بھیجا: خدا نے تمہارا قافلہ بچا لیا ہے میرا خیال ہے کہ ان حالات میں محمد کا مقابلہ کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس کے اتنے دشمن ہیں جو اس کا حساب چکا لیں گے۔

لشکر کے کمانڈر ابوجہل نے اس تجویز کو قبول نہ کیا، اس نے اپنے بتوں لات اور عزیٰ کی قسم کھائی کہ نہ صرف ان کا مقابلہ کریں گے بلکہ مدینہ کے اندر تک ان کا تعاقب کریں گے یا انہیں قید کر لیں گے اور مکہ میں لے آئیں گے تا کہ اس کامیابی کا شہرہ تمام قبائل عرب کے کانوں تک پہنچ جائے۔ آخر کار لشکر قریش بھی مقام بدر تک آپہنچا، انہوں نے اپنے غلام کو پانی لانے کے لئے کنویں کی طرف بھیجے، اصحاب پیغمبر نے انہیں پکڑ لیا اور ان سے حالات معلوم کرنے کے لئے انہیں خدمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے آئے حضرت نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم قریش کے غلام ہیں، فرمایا: لشکر کی تعداد کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہمیں اس کا پتہ نہیں، فرمایا: ہر روز کتنے اونٹ کھانے کے لئے نحر کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نو سے دس تک، فرمایا: ان کی تعداد نو سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے (ایک اونٹ ایک سو فوجی جوانوں کی خوراک ہے)۔

ماحول پر ہیبت اور وحشت ناک تھا لشکر قریش کے پاس فراواں جنگی ساز و سامان تھا۔

یہاں تک کہ حوصلہ بڑھانے کے لئے وہ گانے بجانے والی عورتوں کو بھی ساتھ لائے تھے۔ اپنے سامنے ایسے حریف کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں وہ میدان جنگ میں قدم رکھے گا۔

مسلمانو! فرشتے تمہاری مدد کریں گے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے کہ ممکن ہے آپ کے اصحاب خوف و دہشت کی وجہ سے رات میں آرام سے سو نہ سکیں اور پھر کل دن کو تھکے ہوئے جسم اور روح کے ساتھ دشمن کے مقابل ہوں لہٰذا خدا کے وعدے کے مطابق ان سے فرمایا: تمہاری تعداد کم ہو تو اس کا غم نہ کر، آسمانی فرشتوں کی ایک عظیم جماعت تمہاری مدد کے لئے آئے گی، آپ نے انہیں خدائی وعدے کے مطابق اگلے روز فتح کی پوری تسلی دے کر مطمئن کر دیا اور وہ رات آرام سے سو گئے۔

دوسری مشکل جس سے مجاہدین کو پریشانی تھی وہ میدان بدر کی کیفیت تھی، ان کی طرف زمین نرم تھی اور اس میں پاؤں دھنس جاتے تھے اسی رات یہ ہوا کہ خوب بارش ہوئی، اس کے پانی سے مجاہدین نے وضو کیا، غسل کیا اور تازہ دم ہو گئے ان کے نیچے کی زمین بھی اس سے سخت ہو گئی، تعجب کی بات یہ ہے کہ دشمن کی طرف اتنی زیادہ بارش ہوئی کہ وہ پریشان ہو گئے۔

دشمن کے لشکر گاہ سے مسلمان جاسوسوں کی طرف سے ایک نئی خبر موصول ہوئی اور جلد ہی مسلمانوں میں پھیل گئی، خبر یہ تھی کہ فوج قریش اپنے ان تمام وسائل کے باوجود خوفزدہ ہے گویا وحشت کا ایک لشکر خدا نے ان کے دلوں کی سرزمین پر اتار دیا تھا، اگلے روز چھوٹا سا اسلامی لشکر بڑے دلولے کے ساتھ دشمن کے سامنے صف آراء ہوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے انہیں صلح کی تجویز پیش کی تا کہ عذر اور بہانہ باقی نہ رہے، آپ نے ایک نمائندے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم وہ پہلا گروہ بن جاؤ کہ جس پر ہم حملہ آور ہوں، بعض سرداران قریش چاہتے تھے

یہ صلح کا ہاتھ جوان کی طرف بڑھایا گیا ہے اسے تھام لیں اور صلح کر لیں، لیکن پھر ابو جہل مانع ہوا۔

ستر قتل ستر اسیر

آخر کار جنگ شروع ہوئی، اس زمانے کے طریقے کے مطابق پہلے ایک کے مقابلے میں ایک نکلا، ادھر لشکر اسلام میں رسول اللہ ﷺ کے چچا حمزہ اور حضرت علی علیہ السلام جو جوان ترین افراد تھے میدان میں نکلے، مجاہدین اسلام میں سے چند اور بہادر بھی اس جنگ میں شریک ہوئے، ان جوانوں نے اپنے حریفوں کے پیکر پر سخت ضربیں لگائیں اور کاری وار کئے اور ان کے قدم اکھاڑ دیئے، دشمن کا جذبہ اور کمزور پڑ گیا، یہ دیکھا تو ابو جہل نے عمومی حملے کا حکم دے دیا۔

ابو جہل پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے جو اہل مدینہ میں سے ہیں انہیں قتل کر دو، مہاجرین مکہ کو اسیر کر لو مقصد یہ تھا کہ ایک طرح کے پروپیگنڈا کے لئے انہیں مکہ لے جائیں۔

یہ لمحات بڑے حساس تھے، رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جمعیت کی کثرت پر نظر نہ کریں اور صرف اپنے مدمقابل پر نگاہ رکھیں دانتوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر پیسیں، باتیں کم کریں، خدا سے مدد طلب کریں، حکم پیغمبر سے کہیں رتی بھر سرتابی نہ کریں اور مکمل کامیابی کی امید رکھیں، رسول اللہ ﷺ نے دست دعا آسمان کی طرف بلند کئے اور عرض کیا: "پالنے والے اگر یہ لوگ قتل ہو گئے تو پھر تیری عبادت کوئی نہیں کرے گا"۔

دشمن کے لشکر کی سمت میں سخت ہوا چل رہی تھی اور مسلمان ہوا کی طرف پشت کر کے ان پر حملے کر رہے تھے۔ ان کی استقامت، پامردی اور دلاوری نے قریش کا ناطقہ بند کر دیا ابو جہل سمیت دشمن کے ستر آدمی قتل ہو گئے ان کی لاشیں خاک وخون میں غلطاں پڑی تھیں ستر

فراد مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو گئے مسلمانوں کے بہت کم افراد شہید ہوئے۔

اس طرح مسلمانوں کی پہلی مسلح جنگ طاقتور دشمن کے خلاف غیر متوقع کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، ان میں 77 مہاجر تھے اور دو سو چھتیس (236) انصار، مہاجرین کا پرچم حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا، اور انصار کا پرچم بردار ''سعد بن عبادہ'' تھے، اس عظیم معرکہ کے لئے ان کے پاس صرف 70 اونٹ دو گھوڑے، 6 زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں، دوسری طرف دشمن کی فوج ہزار افراد سے متجاوز تھی، اس کے پاس کافی و وافی اسلحہ تھا اور ایک سو گھوڑے تھے، اس جنگ میں 22 مسلمان شہید ہوئے ان میں چودہ مہاجر اور 8 انصار تھے، دشمن کے ستر (70) افراد مارے گئے اور ستر ہی قیدی ہوئے، اس طرح مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یوں مکمل کامرانی کے ساتھ وہ مدینہ کی طرف پلٹ گئے۔

واقعا یہ عجیب وغریب بات تھی کہ تواریخ کے مطابق مسلمانوں کے چھوٹے سے لشکر کے مقابلہ میں قریش کی طاقتور فوج نفسیاتی طور پر اس قدر شکست خوردہ ہو چکی تھی کہ ان میں سے ایک گروہ مسلمانوں سے جنگ کرنے سے ڈرتا تھا، بعض اوقات وہ دل میں سوچتے کہ یہ عام انسان نہیں ہیں، بعض کہتے ہیں کہ یہ موت کو اپنے اونٹوں پر لاد کر مدینہ سے تمہارے لئے سوغات لائے ہیں۔

''سعد بن معاذ انصاری'' نمائندہ کے طور پر خدمت پیغمبر میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے: میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی نبوت کی گواہی دی ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں خدا کی طرف سے ہے، آپ جو بھی حکم دینا چاہیں دیجئے اور ہمارے مال میں سے جو کچھ آپ چاہیں لے لیں، خدا کی قسم اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ اس دریا (دریائے احمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو وہاں سے قریب تھا) میں کود پڑو تو ہم کود پڑیں گے ہماری یہ آرزو ہے کہ خدا ہمیں توفیق دے کہ ایسی خدمت کریں جو

آپ کی آنکھ کی روشنی کا باعث ہو۔

روز بدر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: زمین سے مٹی اور سنگریزوں کی ایک مٹھی بھر کے مجھے دے دو۔

حضرت علی علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور رسول خدا ﷺ نے اسے مشرکین کی طرف پھینک دیا اور فرمایا: ''شاہت الوجوہ'' (تمہارے منہ قبیح اور سیاہ ہو جائیں)

لکھا ہے کہ معجزانہ طور پر گرد وغبار اور سنگریزے دشمن کی آنکھوں میں جا پڑے اور سب وحشت زدہ ہو گئے۔

مجاہدین کی تشویق

ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے روز مجاہدین اسلام کی تشویق کے لئے کچھ انعامات مقرر کیے مثلاً فرمایا کہ جو فلاں دشمن کو قید کر کے میرے پاس لائے گا اُسے یہ انعام دوں گا ان میں پہلے ہی روح ایمان و جہاد موجود تھی اوپر سے یہ تشویق بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان سپاہی بڑے افتخار سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے اور اپنے مقصد کی طرف لپکے بوڑھے سن رسیدہ افراد جھنڈوں تلے موجود رہے جب جنگ ختم ہوئی تو نوجوان اپنے پر افتخار انعامات کے لئے بارگاہ پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف بڑھے، بوڑھے ان سے کہنے لگے کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے کیونکہ ہم تمہارے لئے پناہ اور سہارے کا کام کر رہے تھے اور تمہارے لئے جوش وخروش کا باعث تھے اگر تمہارا معاملہ سخت ہو جاتا ہے تو تمہیں پیچھے ہٹنا پڑتا تو یقیناً تم ہماری طرف آتے اس موقع پر دو انصاریوں میں تو تو میں میں بھی ہو گئی اور انہوں نے جنگی غنائم کے بارے میں بحث کی۔

اس اثناء میں سورہ انفال کی پہلی آیت نازل ہوئی جس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا کہ غنائم کا تعلق پیغمبر ﷺ سے ہے وہ جیسے چاہیں انہیں تقسیم فرمائیں، پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی

مساوی طور پر سب سپاہیوں میں غنائم تقسیم کر دیے اور برادران دینی میں صلح و مصالحت کا حکم دیا۔

جنگ کا خاتمہ اور اسیروں کا واقعہ

جنگ بدر کے خاتمہ پر جب جنگی قیدی بنا لیے گئے اور پیغمبر اکرم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ قیدیوں میں سے دو خطرناک افراد عقبہ اور نضر کو قتل کر دیا جائے تو اس پر انصار گھبرا گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ حکم تمام قیدیوں کے متعلق جاری ہو جائے اور وہ فدیہ لینے سے محروم ہو جائیں۔ (لہٰذا انہوں نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کیا: ہم نے ستر آدمیوں کو قتل کیا ہے اور ستر ہی کو قیدی بنایا ہے اور یہ آپ کے قبیلے میں سے آپ ہی کے قیدی ہیں، یہ ہمیں بخش دیجئے تا کہ ہم ان کی آزادی کے بدلے فدیہ لے سکیں۔

(رسول اللہ اس کے لیے وحی آسمانی کے منتظر تھے) اس موقع پر وحی الٰہی نازل ہوئی اور قیدیوں کی آزادی کے بدلے فدیہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔

اسیروں کی آزادی کے لئے زیادہ سے زیادہ چار ہزار درہم اور کم سے کم ایک ہزار درہم معین کی گئی، یہ بات قریش کے کانوں تک پہونچی تو انھوں نے ایک ایک کے بدلے معین شدہ رقم بھیج کر اسیروں کو آزاد کرا لیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا داماد ابوالعاص بھی ان قیدیوں میں تھا، رسول ﷺ کی بیٹی یعنی زینب جو ابولعاص کی بیوی تھی نے وہ گلو بند جو جناب خدیجہ نے ان کی شادی کے وقت انہیں دیا تھا فدیہ کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، جب پیغمبر اکرم ﷺ کی نگاہ گلو بند پر پڑی تو جناب خدیجہ جیسی فدا کار اور مجاہدہ خاتون کی یادیں ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو گئیں، آپؐ نے فرمایا: خدا کی رحمت ہو خدیجہ پر، یہ وہ گلو بند ہے جو اس نے میری بیٹی زینب کو جہیز میں دیا تھا (اور بعض دوسری روایات کے مطابق جناب خدیجہ کے

احترام میں آپؐ نے گلوبند قبول کرنے سے احتراز کیا اور حقوق مسلمین کو پیش نظر کرتے ہوئے اس میں ان کی موافقت حاصل کی)۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ نے ابوالعاص کو اس شرط پر آزاد کردیا کہ وہ زینب کو (جو اسلام سے پہلے ابوالعاص کی زوجیت میں تھیں) مدینہ پیغمبر ﷺ کے پاس بھیج دے، اس نے بھی اس شرط کو قبول کرلیا اور بعد میں اسے پورا بھی کیا۔

آنحضرت ﷺ کے چچا عباس کا اسلام قبول کرنا

انصار کے کچھ آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی کہ آپ کے چچا عباس جو قیدیوں میں تھے ان سے آپؐ کے احترام میں فدیہ نہ لیا جائے لیکن پیغمبر ﷺ نے فرمایا:

''خدا کی قسم اس کے ایک درھم سے بھی صرف نظر نہ کرو'' (اگر فدیہ لینا خدائی قانون ہے تو اسے سب پر جاری ہونا چاہئے، یہاں تک کہ میرے چچا پر بھی اس کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔)

پیغمبر اکرم ﷺ عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اپنی طرف سے اور اپنے بھتیجے (عقیل بن ابی طالب) کی طرف سے آپ کو فدیہ ادا کرنا چاہئے۔

عباس (جو مال سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے) کہنے لگے: اے محمد ﷺ کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے ایسا فقیر اور محتاج کردو کہ میں اہل قریش کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلاؤں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس مال میں سے فدیہ ادا کریں جو آپؐ نے اپنی بیوی ام الفضل کے پاس رکھا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اگر میں میدان جنگ میں مارا جاؤں تو اس مال کو اپنے اور اپنی اولاد کے مصارف کے لئے سمجھنا۔

عباس یہ بات سن کر بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے: آپ کو یہ بات کس نے بتائی (

حالانکہ یہ تو بالکل محرمانہ تھی)؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جبرائیل نے، خدا کی طرف سے۔

عباس بولے: اس کی قسم کہ جس کی محمد ﷺ قسم کھاتا ہے کہ میرے اور میری بیوی کے علاوہ اس راز سے کوئی آگاہ نہ تھا۔

اس کے بعد وہ پکار اٹھے:- اشهد انك رسول الله۔

(یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں)

اور یوں وہ مسلمان ہو گئے۔

آزادی کے بعد بدر کے تمام قیدی مکہ لوٹ گئے لیکن عباس، عقیل اور نوفل مدینہ ہی میں رہ گئے کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

عباس کے اسلام لانے کے بارے میں بعض تواریخ میں ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ مکہ کی طرف پلٹ گئے تھے اور خط کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو سازش سے باخبر کیا کرتے تھے، پھر سے پہلے فتح مکہ کے سال مدینہ کی طرف ہجرت کر آئے۔

جنگ احد کا پیش خیمہ

جب کفار مکہ جنگ بدر میں شکست خوردہ ہوئے اور ستر (70) قیدی چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ گئے تو ابوسفیان نے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ اپنی عورتوں کو مقتولین بدر پر گریہ وزاری نہ کرنے دیں کیونکہ آنسو غم واندوہ کو دور کر دیتے ہیں اور اس طرح محمد کی دشمنی اور عداوت ان کے دلوں سے ختم ہو جائے گی، ابوسفیان نے خود یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک جنگ بدر کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لے اس وقت تک وہ اپنی بیوی سے ہمبستری نہیں کرے گا، بہر حال قریش ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اکساتے تھے اور انتقام کی صدا شہر مکہ میں بلند

ہو رہی تھی۔ [1]

ہجرت کے تیسرے سال قریش ہزار سوار اور دو ہزار پیدل کے ساتھ بہت سامان جنگ لے کر آپ سے جنگ کرنے کے لئے مکہ سے نکلے اور میدان جنگ میں ثابت قدمی سے لڑنے کے لئے اپنے بڑے بڑے بت اور اپنی عورتوں کو بھی ہمراہ لے آئے۔

جناب عباس کی بروقت اطلاع

حضرت رسول خدا ﷺ کے چچا حضرت عباس جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور قریش کے درمیان ان کے ہم مشرب وہم مذہب تھے لیکن اپنے بھتیجے سے فطری محبت کی بنا پر جب انھوں نے دیکھا کہ قریش کا ایک طاقتور لشکر پیغمبر ﷺ سے جنگ کرنے کے لئے مکہ سے نکلا ہے تو فوراً ایک خط لکھا اور قبیلہ بنی غفار کے ایک آدمی کے ہاتھ مدینہ بھیجا، عباس کا قاصد بڑی تیزی سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا، جب آپ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے سعد بن اُبی کو عباس کا پیغام پہنچایا اور حتی الامکان اس واقعہ کو پردہ راز میں رکھنے کی کوشش کی۔

پیغمبر کا مسلمانوں سے مشورہ جس دن عباس کا قاصد آپ کو موصول ہوا آپ نے چند مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مکہ ومدینہ کے راستہ پر جائیں اور لشکر کفار کے کوائف معلوم کریں، آپ کے دونمائندے ان کے حالات معلوم کر کے بہت جلدی واپس آئے اور قریش کی قوت وطاقت سے آنحضرت ﷺ کو مطلع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ طاقتور لشکر خود ابوسفیان کی کمان میں ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے چند روز کے بعد تمام اصحاب اور اہل مدینہ کو بلایا اور ان در پیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میٹنگ کی، اس میں عباس کے خط کو بھی پیش کیا گیا اور اس کے بعد مقام جنگ کے بارے میں رائے لی گئی اس میٹنگ میں ایک گروہ نے رائے دی کہ جنگ دشمن

---

[1] جنگ احد کا واقعہ سورہ آل عمران آیت 120 کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

سے مدینہ کی تنگ گلیوں میں کی جائے کیونکہ اس صورت میں کمزور مرد، عورتیں بلکہ کنیزیں بھی مدد گار ثابت ہوسکیں گی۔

عبداللہ بن ابی نے تائید اکہا یا رسول اللہ ﷺ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں ہوں اور دشمن ہم پر کامیاب ہو گیا ہو۔

اس رائے کو آپ بھی اس وقت کی مدینہ کی پوزیشن کے مطابق بنظر تحسین دیکھتے تھے کیونکہ آپ بھی مدینہ ہی میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن نوجوانوں اور جنگجوؤں کا ایک گروہ اس کا مخالف تھا چنانچہ سعد بن معاذ اور قبیلہ اوس کے چند افراد نے کھڑے ہو کر کہا اے رسول خدا ﷺ گذشتہ زمانے میں عربوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ ہماری طرف نظر کرے جبکہ ہم مشرک اور بت پرست تھے اب جبکہ ہمارے درمیان آپ کی ذات والا صفات موجود ہے کس طرح وہ ہمیں دبا سکتے ہیں اس لئے شہر سے باہر جنگ کرنی چاہئے اگر ہم میں سے کوئی مارا گیا تو وہ جام شہادت نوش کرے گا اور اگر کوئی بچ گیا تو اسے جہاد کا اعزاز و افتخار نصیب ہوگا اس قسم کی باتوں اور جوش شجاعت نے مدینہ سے باہر جنگ کے حامیوں کی تعداد کو بڑھا دیا یہاں تک کہ عبداللہ بن اُبی کی پیش کش سردخانہ میں جا پڑی خود پیغمبر ﷺ نے بھی اس مشورے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے طرف داروں کی رائے کو قبول فرمالیا اور ایک صحابی کے ساتھ مقام جنگ کا انتخاب کرنے کے لئے شہر سے باہر تشریف لے گئے آپ نے کوہ احد کا دامن لشکر گاہ کے لئے منتخب کیا کیونکہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام زیادہ مناسب تھا۔

مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں

جمعہ کے دن آپ نے یہ مشورہ لیا اور نماز جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے آپ نے حمد و ثناء کے بعد مسلمانوں کو لشکر قریش کی آمد کی اطلاع دی اور فرمایا:

''تہہ دل سے جنگ کے لئے آمادہ ہو جاؤ اور پورے جذبہ سے دشمن سے لڑو تو خداوند قدوس تمہیں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار کرے گا اور اسی دن آپ ایک ہزار افراد کے ساتھ لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوئے آپ خود لشکر کی کمان کر رہے تھے مدینہ سے نکلنے سے قبل آپ نے حکم دیا کہ لشکر کے تین علم بنائے جائیں جن میں ایک مہاجرین اور دو انصار کے ہوں''۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے مدینہ اور احد کے درمیانی فاصلے کو پا پیادہ طے کیا اور سارے راستے لشکر کی دیکھ بھال کرتے رہے خود لشکر کی صفوں کو منظم ومرتب رکھا تا کہ وہ ایک ہی سیدھی صف میں حرکت کریں۔

ان میں سے کچھ ایسے افراد کو دیکھا جو پہلی دفعہ آپ کو نظر پڑے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ابی کے ساتھی کچھ یہودی ہیں اور اس مناسبت سے مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے ہیں آپ نے فرمایا کہ مشرکین سے جنگ کرنے میں مشرکین سے مدد نہیں لی جاسکتی مگر یہ کہ یہ لوگ اسلام قبول کرلیں یہودیوں نے اس شرط کو قبول نہ کیا اور سب مدینہ کی طرف پلٹ آئے یوں ایک ہزار میں سے تین سو افراد کم ہو گئے۔

لیکن مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ عبداللہ بن اُبی کی رائے کو رد کیا گیا تھا اس لئے وہ اثنائے راہ میں تین سو سے زیادہ افراد کو لے کر مدینہ کی طرف پلٹ آیا بہر صورت پیغمبر اکرم ﷺ لشکر کی ضروری چھان بین (یہودیوں یا ابن ابی کے ساتھیوں کے نکالنے) کے بعد سات سو افراد کو ہمراہ لے کر کوہ احد کے دامن میں پہنچ گئے، اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کی صفوں کو آراستہ کیا۔

عبداللہ بن جبیر کو پچاس ماہر تیر اندازوں کے ساتھ پہاڑ کے درہ پر تعینات کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ کسی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں اور فوج کے پچھلے حصے کی حفاظت کریں اور اس حد تک تاکید کی کہ اگر ہم دشمن کا مکہ تک پیچھا کریں یا ہم شکست کھا جائیں اور دشمن ہمیں مدینہ تک جانے پر مجبور کردے پھر بھی تم اپنا مورچہ نہ چھوڑنا، دوسری طرف سے ابوسفیان نے خالد بن ولید

کو منتخب سپاہیوں کے ساتھ اس درہ کی نگرانی پر مقرر کیا اور انہیں ہر حالت میں وہیں رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب اسلامی لشکر اس درہ سے ہٹ جائے تو فوراً لشکر اسلام پر پیچھے سے حملہ کر دو۔

آغاز جنگ

دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے اور یہ دونوں لشکر اپنے نوجوانوں کو ایک خاص انداز سے اکسا رہے تھے، ابوسفیان کعب کے بتوں کے نام لے کر اور خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے جنگی جوانوں کی توجہ مبذول کرا کے ان کو ذوق وشوق دلاتا تھا۔

جب کہ پیغمبر اسلام ﷺ خدا کے اسم مبارک اور انعامات اعلیٰ کے حوالے سے مسلمانوں کو جنگ کی ترغیب دیتے تھے اچانک مسلمانوں کی صدائے اللہ اکبر اللہ اکبر سے میدان اور دامن کوہ کی فضا گونج اٹھی جب کہ میدان کی دوسری طرف قریش کی لڑکیاں نے دف اور سارنگی پر اشعار گا گا کر قریش کے جنگ جو افراد کے احساسات کو ابھارتی تھیں۔

جنگ کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں نے ایک شدید حملہ سے لشکر قریش کے پرخچے اڑا دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لشکر اسلام نے ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا خالد بن ولید نے جب قریش کی یقینی شکست دیکھی تو اس نے چاہا کہ درہ کے راستے نکل کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کرے لیکن تیر اندازوں نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا قریش کے قدم اکھڑتے دیکھ کر تازہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے دشمن کو شکست خوردہ سمجھ کر مال غنیمت جمع کرنے کے لئے اچانک اپنی پوزیشن چھوڑ دی، ان کی دیکھا دیکھی درہ پر تعینات تیر اندازوں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا، ان کے کمانڈر عبداللہ بن جبیر نے انہیں آنحضرت ﷺ کا حکم یاد دلایا مگر سوائے چند (تقریباً دس افراد) کے کوئی اس اہم جگہ پر نہ ٹھہرا۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد بن ولید نے درہ خالی دیکھ کر بڑی

تیزی سے عبداللہ بن جبیر پر حملہ کیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا، اس کے بعد انہوں نے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اچانک مسلمانوں نے ہر طرف چمک دار تلواروں کی تیز دھاروں کو اپنے سروں پر دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے اور اپنے آپ کو منظم نہ رکھ سکے قریش کے بھگوڑوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ بھی پلٹ آئے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اسی موقع پر لشکر اسلام کے بہادر افسر سید الشہداء حضرت حمزہ نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا، سوائے چند شمع رسالت کے پروانوں کے اور بقیہ مسلمانوں نے وحشت زدہ ہو کر میدان کو دشمن کے حوالے کر دیا۔

اس خطرناک جنگ میں جس نے سب سے زیادہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اور پیغمبر اکرم ﷺ پر ہونے والے دشمن کے ہر حملے کا دفاع کیا وہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

حضرت علی علیہ السلام بڑی جرأت اور بڑے حوصلہ سے جنگ کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی تلوار ٹوٹ گئی، اور پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی تلوار آپ کو عنایت فرمائی جو ذوالفقار کے نام سے مشہور ہے بالآخر آپ ایک مورچہ میں ٹھہر گئے اور حضرت علی علیہ السلام مسلسل آپ کا دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کے جسم پر ساٹھ کاری زخم آئے، اور اسی موقع پر قاصد وحی نے پیغمبر اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے محمد یہ ہے مواسات و معاونت کا حق، آپؐ نے فرمایا (ایسا کیوں نہ ہو کہ) علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں، تو جبرائیل نے اضافہ کیا: میں تم دونوں سے ہوں۔

امام صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے قاصد وحی کو آسمان میں یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ: "**لاسیف الاذوالفقار ولا فتی الا علی**" (ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علی کے سوا کوئی جواں مرد نہیں)

اس اثناء میں یہ آواز بلند ہوئی کہ محمد قتل ہو گئے۔

یہ آواز فضائے عالم میں گونج اٹھی اس آواز سے جتنا بت پرستوں کے جذبات پر مثبت اثر پیدا ہوا اتنا ہی مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہوگیا چنانچہ ایک گروہ کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بڑی تیزی سے میدان جنگ سے نکل گئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے سوچا کہ پیغمبر شہید ہو گئے ہیں لہٰذا اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے اور بت پرستوں کے سرداروں سے امان طلب کرلی جائے لیکن ان کے مقابلہ میں فداکاروں اور جانثاروں کی بھی ایک قلیل جماعت تھی جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ابودجانہ اور طلحہ جیسے بہادر لوگ موجود تھے جو باقی لوگوں کو پامردی اور استقامت کی دعوت دے رہے تھے ان میں سے انس بن نضر لوگوں کے درمیان آیا اور کہنے لگا: اے لوگو! اگر محمد شہید ہو گئے ہیں تو محمد کا خدا تو قتل نہیں ہوا چلو اور جنگ کرو، اسی نیک اور مقدس ہدف کے حصول کے لئے درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ، یہ گفتگو تمام کرتے ہی انھوں نے دشمن پر حملہ کردیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے، تاہم جلد معلوم ہوگیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت ہیں اور اطلاع ایک شایعہ تھی۔

کون پکارا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل ہو گئے؟

''ابن قمعہ'' نے اسلامی سپاہی مصعب کو پیغمبر سمجھ کر اس پر کاری ضرب لگائی اور با آواز بلند کہا: لات وعزی کی قسم محمد قتل ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ افواہ چاہے مسلمانوں نے اڑائی یا دشمن نے لیکن مسلمانوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی اس لئے کہ جب آواز بلند ہوئی تو دشمن میدان چھوڑ کر مکہ کی طرف چل پڑے ورنہ قریش کا فاتح لشکر جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے دلوں میں کینہ رکھتا تھا اور انتقام لینے کی نیت سے آیا تھا کبھی میدان نہ چھوڑتا، قریش کے پانچ ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے میدان جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد ایک رات بھی صبح تک وہاں نہ گذاری اور اسی

وقت مکہ کی طرف چل پڑے۔

پیغمبر ﷺ کی شہادت کی خبر نے بعض مسلمانوں میں اضطراب و پریشانی پیدا کردی، جو مسلمان اب تک میدان کارزار میں موجود تھے، انھوں نے اس خیال سے کہ دوسرے مسلمان پراکندہ نہ ہوں آنحضرت ﷺ کو پہاڑ کے اوپر لے گئے تا کہ مسلمانوں کو پتہ چل جائے کہ آپ بقید حیات ہیں، یہ دیکھ کر بھگوڑے واپس آگئے اور آنحضرت کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے، آپ نے ان کو ملامت و سرزنش کی کہ تم نے ان خطرناک حالات میں کیوں فرار کیا، مسلمان شرمندہ تھے انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: یا رسول خدا ہم نے آپ کی شہادت کی خبر سنی تو خوف کی شدت سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مفسر عظیم مرحوم طبرسی، ابوالقاسم بلخی سے نقل کرتے ہیں کہ جنگ احد کے دن (پیغمبر اکرم ﷺ کے علاوہ) سوائے تیرہ افراد کے تمام بھاگ گئے تھے، اور ان تیرہ میں سے آٹھ انصار اور پانچ مہاجر تھے، جن میں سے حضرت علی علیہ السلام اور طلحہ کے علاوہ باقی ناموں میں اختلاف ہے، البتہ دونوں کے بارے میں تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ انھوں نے فرار نہیں کیا۔

یوں مسلمانوں کو جنگ احد میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہو گئے لیکن مسلمانوں کو اس شکست سے بڑا درس ملا جو بعد کی جنگوں میں ان کی کامیابی و کامرانی کا باعث بنا۔

جنگ کا خطرناک مرحلہ

جنگ احد کے اختتام پر مشرکین کا فتحیاب لشکر بڑی تیزی کے ساتھ مکہ پلٹ گیا لیکن راستے میں انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انہوں نے اپنی کامیابی کو ناقص کیوں چھوڑ دیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مدینہ کی طرف پلٹ جائیں اور اسے غارت و تاراج کر دیں اور اگر محمد زندہ ہوں تو انہیں ختم

کردیں تاکہ ہمیشہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی فکر ختم ہو جائے، اور اسی بنا پر انہیں واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا اور درحقیقت جنگ احد کا یہ وہ خطرناک مرحلہ تھا کیونکہ کافی مسلمان شہید اور زخمی ہو چکے تھے اور فطری طور پر وہ ازسرنو جنگ کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ جبکہ اس کے برعکس اس مرتبہ دشمن پورے جذبہ کے ساتھ جنگ کرسکتا تھا۔

یہ اطلاع پیغمبر اکرم ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فوراً حکم دیا کہ جنگ احد میں شریک ہونے والا لشکر دوسری جنگ کے لئے تیار ہو جائے، آپ نے یہ حکم خصوصیت سے دیا کہ جنگ احد کے زخمی بھی لشکر میں شامل ہوں، (حضرت علی علیہ السلام نے جن کے بدن پر دشمنوں نے 60 زخم لگائے تھے، لیکن آپ پھر دوبارہ دشمنوں کے مقابلہ میں آگئے) ایک صحابی کہتے ہیں:

میں بھی زخمیوں میں سے تھا لیکن میرے بھائی کے زخم مجھ سے زیادہ شدید تھے، ہم نے ارادہ کرلیا کہ جو بھی حالت ہو ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہونچیں گے، میری حالت چونکہ میرے بھائی سے کچھ بہتر تھی، جہاں میرا بھائی نہ چل پاتا میں اسے اپنے کندھے پر اٹھالیتا، بڑی تکلیف سے ہم لشکر تک جا پہنچے، پیغمبر اکرم ﷺ اور لشکر اسلام "حمراء الاسد" کے مقام پر پہنچ گئے اور وہاں پر پڑاؤ ڈالا یہ جگہ مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

یہ خبر جب لشکر قریش تک پہنچی خصوصاً جب انھوں نے مقابلہ کے لئے ایسی آمادگی دیکھی کہ زخمی بھی میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے اور ساتھ ہی انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ مدینہ سے تازہ دم فوج ان سے آملی ہے۔

اس موقع پر ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے دلوں کو اور کمزور کر دیا اور ان میں مقابلہ کی ہمت نہ رہی، واقعہ یہ ہوا کہ ایک مشرک جس کا نام "معبد خزاعی" تھا مدینہ سے مکہ کی طرف جارہا تھا اس نے پیغمبر اکرم ﷺ اور ان کے اصحاب کی کیفیت دیکھی تو انتہائی متاثر ہوا، اس کے انسانی جذبات میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے پیغمبر اکرم ﷺ سے عرض کیا: آپ کی یہ حالت وکیفیت ہمارے لئے بہت ہی ناگوار ہے آپ آرام کرتے تو ہمارے لئے بہتر ہوتا، یہ کہہ

کر دو وہاں سے چل پڑا اور "روحاء" کے مقام پر ابوسفیان کے لشکر سے ملا، ابوسفیان نے اس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا: میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا عظیم لشکر لئے ہوئے تمہارا تعاقب کر رہے ہیں ایسا لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا او رتیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے انہیں قتل کیا زخمی کیا اور منتشر کر کے رکھ دیا تھا، معبد خزاعی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ تم نے پایا کیا ہے، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عظیم اور کثیر لشکر اس وقت تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ابوسفیان اور اسکے ساتھیوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹ جائیں اور مکہ کی طرف پلٹ جائیں اور اس مقصد کے لئے کہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کریں اور انہیں پیچھے ہٹ جانے کا کافی موقع مل جائے، انہوں نے قبیلہ عبد القیس کی ایک جماعت سے خواہش کی کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں تک یہ خبر پہنچا دیں کہ ابوسفیان اور قریش کے بت پرست باقی ماندہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ختم کرنے کے لئے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی طرف آ رہے ہیں، یہ جماعت گندم خریدنے کے لئے مدینہ جا رہی تھی جب یہ اطلاع پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں تک پہنچی تو انہوں نے کہا: "حسبنا اللہ ونعم الوکیل" (خدا ہمارے لئے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی اور مدافع ہے)۔

انہوں نے بہت انتظار کیا لیکن دشمن کے لشکر کی کوئی خبر نہ ہوئی، لہٰذا تین روز توقف کے بعد، وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔

کھوکھلی باتیں

جنگ بدر میں بعض مسلمانوں کی پر افتخار شہادت کے بعد بعض مسلمان جب باہم مل

بیٹھتے تو ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے اور کہتے کاش یہ اعزاز میدان بدر میں ہمیں بھی نصیب ہو جاتا، یقیناً ان میں کچھ لوگ سچے بھی تھے لیکن ان میں ایک جھوٹا گروہ بھی تھا جس نے اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی، بہر حال زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جنگ احد کا وحشت ناک معرکہ درپیش ہوا تو ان سچے مجاہدین نے بہادری سے جنگ کی اور جام شہادت نوش کیا اور اپنی آرزو کو پالیا لیکن جھوٹوں کے گروہ نے جب لشکر اسلام میں شکست کے آثار دیکھے تو وہ قتل ہونے کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ قرآن انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "تم ایسے لوگ تھے کہ جو دلوں میں آرزو اور تمنائے شہادت کے دعویدار تھے، پھر جب تم نے اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو کیوں بھاگ کھڑے ہوئے"۔ [1]

حضرت علی علیہ السلام کے زخم

امام باقر علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے: حضرت علی علیہ السلام کو احد کے دن اکسٹھ زخم لگے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ام سلیم" اور "ام عطیہ" کو حکم دیا کہ وہ دونوں حضرت علی علیہ السلام کے زخموں کا علاج کریں، تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ وہ حالت پریشانی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کرنے لگے: کہ حضرت علی علیہ السلام کے بدن کی کیفیت یہ ہے کہ ہم جب ایک زخم باندھتے ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے اور ان کے بدن کے زخم اس قدر زیادہ اور خطرناک ہیں کہ ہم ان کی زندگی کے بارے میں پریشان ہیں تو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ دیگر مسلمان حضرت علی علیہ السلام کی عیادت کے لئے ان کے گھر آئے جب کہ ان کے بدن پر زخم ہی زخم تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دست مبارک ان کے جسم سے مس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو شخص راہ خدا میں اس حالت کو دیکھ لے وہ اپنی ہی ذمہ داری کے آخری درجہ کو پہنچ چکا ہے اور جن جن

---

[1] سورہ آل عمران آیت 163

زخموں پر آپؐ ہاتھ رکھتے تھے وہ فوراً مل جاتے تھے تو اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: الحمدا للہ کہ ان حالات میں جنگ سے نہیں بھاگا اور دشمن کو پشت نہیں دکھائی خدا نے ان کی کوشش کی قدردانی کی۔

ہم نے شکست کیوں کھائی؟

کافی شہید دے کر اور بہت نقصان اٹھا کر جب مسلمان مدینہ کی طرف پلٹ آئے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا خدا نے ہم سے فتح و کامیابی کا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر اس جنگ میں ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اسی سے قرآن میں انہیں جواب دیا گیا اور شکست کے اسباب کی نشاندہی کی گئی۔ [1]

قرآن کہتا ہے کہ کامیابی کے بارے میں خدا کا وعدہ درست تھا اور اس کی وجہ ہی سے تم ابتداء جنگ میں کامیاب ہوئے اور حکم خدا سے تم نے دشمن کو تتر بتر کر دیا کامیابی کا یہ وعدہ اس وقت تک تھا جب تک تم استقامت اور پائیداری اور فرمان پیغمبری صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی سے دست بردار نہیں ہوئے اور شکست کا دروازہ اس وقت کھلا جب سستی اور نافرمانی نے تمہیں آگھیرا، یعنی اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کامیابی کا وعدہ بلاشرط تھا تو تمہاری بڑی غلط فہمی ہے بلکہ کامیابی کے تمام وعدے فرمان خدا کی پیروی کے ساتھ مشروط ہیں۔

عمومی معافی کا حکم

جو لوگ واقعہ احد کے دوران جنگ سے فرار ہو گئے تھے وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ندامت و پشیمانی کے عالم میں معافی کی درخواست کی تو خدائے تعالیٰ

---

[1] سورہ آل عمران آیت 152

نے پیغمبر اکرم ﷺ سے انہیں عام معافی دینے کے لئے فرمایا لہٰذا حکم الٰہی نازل ہوتے ہی آپ نے فراخ دلی سے توبہ کرنے والے خطا کاروں کو معاف کر دیا۔

قرآن میں پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک بہت بڑی اخلاقی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم پروردگار کے لطف و کرم کے سبب ان پر مہربان ہو گئے اور اگر تم ان کے لئے سنگدل، سخت مزاج اور تند خو ہوتے اور عملاً ان پر لطف و عنایت نہ کرتے تو وہ تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔ اس کے بعد حکم دیا گیا کہ "ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمایئے اور انہیں اپنے دامن عفو میں جگہ دیجئے"۔ [1]

یعنی اس جنگ میں انہوں نے جو بے وفائیاں آپ سے کی ہیں اور جو تکالیف اس جنگ میں آپ کو پہنچائی ہیں، ان کے لئے ان کی مغفرت طلب کیجئے اور میں خود ان کے لئے تم سے سفارش کرتا ہوں کہ انہوں نے میری جو مخالفتیں کی ہیں، مجھ سے ان کی مغفرت طلب کرو دوسرے لفظوں میں جو تم سے مربوط ہے اسے تم معاف کر دو اور جو مجھ سے ربط رکھتا ہے اسے میں بخش دیتا ہوں، آنحضرت ﷺ نے فرمان خدا پر عمل کرتے ہوئے ان تمام خطا کاروں کو عام معافی دے دی۔

پیغمبر اکرم ﷺ شہداء سے مخاطب

---

[1] سورہ آل عمران آیت 159
واضح رہے کہ عفو و درگزر کرنے کے لئے یہ ایک اہم اور بہت مناسب موقع تھا اور اگر آپ ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے بکھر جانے کے لئے فضا ہموار تھی وہ لوگ جو اتنی بری شکست کا سامنا کر چکے تھے اور بہت سے مقتول و مجروح پیش کر چکے تھے (اگرچہ یہ سب کچھ ان کی اپنی غلطی سے ہوا تاہم) ایسے لوگوں کو محبت، دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی تاکہ ان کے دل اور جسم کے زخم پر مرہم لگ سکے اور وہ ان سے جانبر ہو کر آئندہ کے معرکوں کے لئے تیار ہو سکیں۔

ابن مسعود پیغمبر اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں: خدا نے شہداء بدر و احد کی ارواح کو خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تمہاری کیا آرزو ہے تو انہوں نے کہا: پروردگارا ہم اس سے زیادہ کیا آرزو کر سکتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کی نعمتوں میں غرق ہیں اور تیرے عرش کے سائے میں رہتے ہیں، ہمارا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور پھر سے تیری راہ میں شہید ہوں، اس پر خدا نے فرمایا: میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا۔

انہوں نے عرض کیا: جب ایسا ہی ہے تو ہماری تمنا ہے کہ ہمارے پیغمبر کو ہمارا اسلام کو پہنچا دے، ہماری حالت ہمارے پسماندگان کو بتادے اور انہیں ہماری حالت کی بشارت دے تاکہ ہمارے بارے میں انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

حنظلہ غسیل الملائکہ

''حنظلہ بن ابی عیاش'' جس رات شادی کرنا چاہتے تھے اس سے اگلے دن جنگ احد برپا ہوئی پیغمبر اکرم ﷺ اپنے اصحاب سے جنگ کے بارے میں مشورہ کر رہے تھے کہ وہ آپ کے پاس آئے اور عرض کی اگر رسول اللہ ﷺ اجازت دے دیں تو یہ رات میں بیوی کے ساتھ گزار لوں، آنحضرت ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔

صبح کے وقت انہیں جہاد میں شرکت کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ غسل بھی نہ کر سکے اسی حالت میں معرکہ کارزار میں شریک ہو گئے اور بالآخر جام شہادت نوش کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان حنظلہ کو غسل دے رہے ہیں۔

اسی لئے حنظلہ کو ''غسیل الملائکہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

قبیلہ بنی نضیر کی سازش

مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے رہتے تھے، بنی نظیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً اہل حجاز نہ تھے لیکن چونکہ اپنی مذہبی کتب میں انہوں نے پڑھا تھا کہ ایک پیغمبر مدینہ میں ظہور کرے گا لہٰذا انہوں نے اس سرزمین کی طرف کوچ کیا اور وہ اس عظیم پیغمبر ﷺ کے انتظار میں تھے۔

جس وقت رسول خدا نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ نے ان کے ساتھ عدم تعرض کا عہد باندھا لیکن ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے یہ عہد توڑا۔

دوسری عہد شکنیوں کے علاوہ یہ کہ جنگ احد (جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی) کعب ابن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ مکہ پہنچا وہ اور اس کے ساتھی سب قریش کے پاس اور ان سے عہد کیا کہ سب مل کر محمد ﷺ کے خلاف جنگ کریں اس کے بعد ابوسفیان چالیس مکی افراد کے ساتھ اور کعب بن اشرف ان چالیس یہودیوں کے ساتھ مسجد الحرام میں وارد ہوئے اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس اپنے عہد و پیمان کو مستحکم کیا یہ خبر بذریعہ وحی پیغمبر اسلام ﷺ کو مل گئی۔

دوسرے یہ کہ ایک روز پیغمبر اسلام ﷺ اپنے چند بزرگ اصحاب کے ساتھ قبیلہ بنی نضیر کے پاس آئے یہ لوگ مدینہ کے قریب رہتے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے صحابہ کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ آپ اس طرح بنی نظیر کے حالات قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غفلت کا شکار ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ یہودیوں کے قلعہ کے باہر تھے آپؐ نے کعب بن اشرف سے اس سلسلہ میں بات کی اسی دوران یہودیوں کے درمیان سازش ہونے لگی وہ ایک دوسرے سے کہنے

لگے کہ ایسا عمدہ موقع اس شخص کے سلسلہ میں دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اب جب کہ یہ تمہاری دیوار کے پاس بیٹھا ہے ایک آدمی چھت پر جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس پر پھینک دے اور ہمیں اس سے نجات دلادے ایک یہودی، جس کا نام عمر بن جحاش تھا، اس نے آمادگی ظاہر کی وہ چھت پر چلا گیا رسول خدا ﷺ بذریعہ وحی باخبر ہو گئے اور وہاں سے اٹھ کر مدینہ آگئے آپ نے اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں کی ان کا خیال تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ لوٹ کر مدینہ جائیں گے ان کو معلوم ہوا کہ آپ مدینہ پہنچ گئے ہیں چنانچہ وہ بھی مدینہ پلٹ آئے یہ وہ منزل تھی کہ جہاں پیغمبر اسلام ﷺ پر یہودیوں کی پیمان شکنی واضح و ثابت ہو گئی تھی آپ نے مسلمانوں کو جنگ کے لئے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی نظیر کے ایک شاعر نے پیغمبر اسلام ﷺ کی ہجو میں کچھ اشعار کہے اور آپ کے بارے میں بدگوئی بھی کی ان کی پیمان شکنی کی یہ ایک اور دلیل تھی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اس وجہ سے کہ ان پر پہلے سے ایک کاری ضرب لگائیں، محمد بن مسلمہ کو جو کعب بن اشرف رئیس یہود سے آشنائی رکھتا تھا، حکم دیا کہ وہ کعب کو قتل کر دے اس نے کعب کو قتل کر دیا، کعب بن اشرف کے قتل ہو جانے نے یہودیوں کو متزلزل کر دیا، اس کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ہر مسلمان اس عہد شکن قوم سے جنگ کرنے کے لئے چل پڑے۔ جس وقت وہ اس صورت حال سے باخبر ہوئے تو انہوں نے اپنے مضبوط و مستحکم قلعوں میں پناہ لے لی اور دروازے بند کر لئے، پیغمبر اسلام ﷺ نے حکم دیا کہ وہ چند کھجوروں کے درخت جو قلعوں کے قریب ہیں، کاٹ دیے جائیں یا جلا دیے جائیں۔

یہ کام غالباً اس مقصد کے پیش نظر ہوا کہ یہودی اپنے مال و اسباب سے بہت محبت رکھتے تھے وہ اس نقصان کی وجہ سے قلعوں سے باہر نکل کر آمنے سامنے جنگ کریں گے مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ کاٹے جانے والے کھجوروں کے یہ درخت

مسلمانوں کی تیز نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈالتے تھے لہٰذا انہیں کاٹ دیا جانا چاہیے تھا بہر حال اس پر یہودیوں نے فریاد کی انہوں نے کہا: "اے محمدؐ آپ تو ہمیشہ اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے یہ کیا سلسلہ ہے" تو اس وقت وحی نازل ہوئی [1] اور انہیں جواب دیا کہ یہ ایک مخصوص حکم الٰہی تھا۔

محاصرہ نے کچھ دن طول کھینچا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے خوں ریزی سے پرہیز کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ مدینہ کو خیر باد کہہ دیں اور کہیں دوسری جگہ چلے جائیں انہوں نے اس بات کو قبول کرلیا کچھ سامان اپنا لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا ایک جماعت "اذرعات" شام کی طرف اور ایک مختصری تعداد خیبر کی طرف چلی گئی ایک گروہ "حیرہ" کی طرف چلا گیا ان کے چھوڑے ہوئے اموال، زمینیں، باغات اور گھر مسلمانوں کے ہاتھ لگے، چلتے وقت جتنا ان سے ہوسکا انہوں نے اپنے گھر توڑ پھوڑ دیے یہ واقعہ جنگ احد کے چھ ماہ بعد اور ایک گروہ کی نظر کے مطابق جنگ بدر کے چھ ماہ بعد ہوا۔ [2]

جنگ احزاب

تاریخ اسلام کے اہم حادثوں میں سے ایک جنگ احزاب بھی ہے یہ ایک ایسی جنگ جو تاریخ اسلام میں ایک اہم تاریخی سوز ثابت ہوئی اور اسلام و کفر کے درمیان طاقت کے موازنہ کے پلڑے کو مسلمانوں کے حق میں جھکا دیا اور اس کی کامیابی آئندہ کی عظیم کامیابیوں کے لئے کلیدی حیثیت اختیار کرگئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں دشمنوں کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد وہ کوئی خاص قابل ذکر کارنامہ انجام دینے کے قابل نہ رہ سکے۔

---

[1] سورہ حشر آیت 5

[2] یہ واقعہ سورہ حشر کی ابتدائی آیات میں بیان ہوا ہے۔

"یہ جنگ احزاب" جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تمام اسلام دشمن طاقتوں اور ان مختلف گروہوں کی طرف سے ہر طرح کا مقابلہ تھا کہ اس دین کی پیش رفت سے ان لوگوں کے ناجائز مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے۔ جنگ کی آگ کی چنگاری "بنی نضیر" یہودیوں کے اس گروہ کی طرف سے بھڑکی جو مکہ میں آئے اور قبیلہ "قریش" کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے پر اکسایا اور ان سے وعدہ کیا کہ آخری دم تک ان کا ساتھ دیں گے پھر قبیلہ "غطفان" کے پاس گئے اور انہیں بھی کارزار کے لئے آمادہ کیا۔

ان قبائل نے اپنے ہم پیمان اور حلیفوں مثلاً قبیلہ "بنی اسد" اور "بنی سلیم" کو بھی دعوت دی اور چونکہ یہ سب قبائل خطرہ محسوس کئے ہوئے تھے، لہٰذا اسلام کا کام ہمیشہ کے لئے تمام کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تاکہ وہ اس طرح سے پیغمبر کو شہید، مسلمانوں کو سرکوب، مدینہ کو غارت اور اسلام کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیں۔

کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں

جنگ احزاب کفر کی آخری کوشش، ان کے ترکش کا آخری تیر اور شرک کی قوت کا آخری مظاہرہ تھا اسی بنا پر جب دشمن کا سب سے بڑا پہلوان عمرو بن عبدود عالم اسلام کے دلیر مجاہد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مقابلہ میں آیا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: "سارے کا سارا ایمان سارے کے سارے (کفر اور) شرک کے مقابلہ میں آگیا ہے"۔

کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فتح کفر کی ایمان پر یا ایمان کی کفر پر مکمل کامیابی تھی دوسرے لفظوں میں یہ فیصلہ کن معرکہ تھا جو اسلام اور کفر کے مستقبل کا تعین کر رہا تھا اسی بناء پر دشمن کی اس عظیم جنگ اور کارزار میں کمر ٹوٹ گئی اور اس کے بعد ہمیشہ مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔

دشمن کا ستارہ اقبال غروب ہو گیا اور اس کی طاقت کے ستون ٹوٹ گئے اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسول گرامی ﷺ نے جنگ احزاب کے خاتمہ پر فرمایا:

''اب ہم ان سے جنگ کریں گے اور ان میں ہم سے جنگ کی سکت نہیں ہے''۔

لشکر کی تعداد

بعض مؤرخین نے لشکر کفار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ لکھی ہے۔ مقریزی اپنی کتاب ''الامتاع'' میں لکھتے ہیں: ''صرف قریش نے چار ہزار جنگ جوؤں، تین سو گھوڑوں اور پندرہ سو اونٹوں کے ساتھ خندق کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا، قبیلہ ''بنی سلیم'' سات سو افراد کے ساتھ ''مرالظہران'' کے علاقہ میں ان سے آملا، قبیلہ ''بنی فرازہ'' ہزار افراد کے ساتھ، ''بنی اشجع'' اور ''بنی مرہ'' کے قبائل میں سے ہر ایک چار چار سو افراد کے ساتھ پہنچ گیا۔ اور دوسرے قبائل نے بھی اپنے آدمی بھیجے جن کی مجموعی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ بنتی ہے''

جبکہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی انہوں نے (مدینہ کے قریب) ''سلع'' نامی پہاڑی کے دامن کو جو ایک بلند جگہ تھی وہاں پر لشکر کفار نے مسلمانوں کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور ایک روایت کے مطابق بیس دن دوسری روایت کے مطابق پچیس دن اور بعض روایات کے مطابق ایک ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔

باوجودیکہ دشمن مسلمانوں کی نسبت مختلف پہلوؤں سے برتری رکھتا تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، آخر کار ناکام ہو کر واپس پلٹ گیا۔

خندق کی کھدائی

خندق کے کھودنے کا سلسلہ حضرت سلمان فارسی ؓ کے مشورہ سے وقوع پذیر ہوا خندق

کے اس زمانے میں ملک ایران میں دفاع کا مؤثر ذریعہ تھا اور جزیرۃ العرب میں اس وقت تک اس کی مثال نہیں تھی اور عرب میں اس کا شمار نئی ایجادات میں ہوتا تھا اطراف مدینہ میں اس کا کھود نا فوجی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل تھا یہ خندق دشمن کے حوصلوں کو پست کرنے اور مسلمانوں کے لئے روحانی تقویت کا بھی ایک مؤثر ذریعہ تھی۔

خندق کے کوائف اور جزئیات کے بارے میں صحیح طور پر معلومات تک رسائی تو نہیں ہے البتہ مؤرخین نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ اس کا عرض اتنا تھا کہ دشمن کے سوار جست لگا کر بھی اس کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس کی گہرائی یقیناً اتنی تھی کہ اگر کوئی شخص اس میں داخل ہو جاتا ہے تو آسانی کے ساتھ دوسری طرف باہر نہیں نکل سکتا تھا، علاوہ ازیں مسلمان تیر اندازوں کا خندق والے علاقے پر اتنا تسلط تھا کہ اگر کوئی شخص خندق کو عبور کرنے کا ارداہ کرتا تھا تو ان کے لئے ممکن تھا کہ اسے خندق کے اندر ہی تیر کا نشانہ بنا لیتے۔

رہی اس کی لمبائی تو مشہور روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس، دس افراد کو چالیس ہاتھ (تقریباً 20 میٹر) خندق کھودنے پر مامور کیا تھا، اور مشہور قول کے پیش نظر لشکر اسلام کی تعداد تین ہزار تھی تو مجموعی طور پر اس کی لمبائی اندازاً بارہ ہزار ہاتھ (چھ ہزار میٹر) ہوگی۔

اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ اس زمانے میں نہایت ہی ابتدائی وسائل کے ساتھ اس قسم کی خندق کھودنا بہت ہی طاقت فرسا کام تھا خصوصاً جب کہ مسلمان خوراک اور دوسرے وسائل کے لحاظ سے بھی سخت تنگی میں تھے۔

یقیناً خندق کھودی بھی نہایت کم مدت میں گئی یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ لشکر اسلام پوری ہوشیاری کے ساتھ دشمن کے حملہ آور ہونے سے پہلے ضروری پیش بندی کر چکا تھا اور وہ بھی اس طرح سے کہ لشکر کفر کے مدینہ پہنچنے سے تین دن پہلے خندق کی کھدائی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

عمرو بن عبدود سے حضرت علی علیہ السلام کی تاریخی جنگ

اس جنگ کا ایک اہم واقعہ حضرت علی علیہ السلام کا دشمن کے لشکر کے نامی گرامی پہلوان عمرو بن عبدود کے ساتھ مقابلہ تھا تاریخ میں آیا ہے کہ لشکر احزاب نے جن دلاوران عرب میں سے بہت طاقتور افراد کو اس جنگ میں اپنی امداد کے لئے دعوت دے رکھی تھی، ان میں سے پانچ افراد زیادہ مشہور تھے، عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ، نوفل اور ضرار یہ لوگ دوران محاصرہ ایک دن دست بدست لڑائی کے لئے تیار ہوئے، لباس جنگ بدن پر سجایا اور خندق کے ایک کم چوڑے حصے سے، جو مجاہدین اسلام کے تیروں کی پہنچ سے کسی قدر دور تھا، اپنے گھوڑوں کے ساتھ دوسری طرف جست لگائی اور لشکر اسلام کے سامنے آکھڑے ہوئے ان میں سے عمرو بن عبدود زیادہ مشہور اور نامور تھا اس کی "کوئی ہے بہادر" کی آواز میدان احزاب میں گونجی اور چونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس کے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہوا لہٰذا وہ زیادہ گستاخ ہوگیا اور مسلمانوں کے عقاید اور نظریات کا مذاق اڑانے لگا اور کہنے لگا:

"تم تو یہ کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں ہیں اور ہمارے مقتول جہنم میں تو کیا تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے میں بہشت میں بھیجوں یا وہ مجھے جہنم کی طرف روانہ کرے؟"

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کے شر کو مسلمانوں کے سر سے کم کردے لیکن حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سوا کوئی بھی اس کے ساتھ جنگ کے لئے آمادہ نہ ہوا تو آنحضرت نے علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے فرمایا: یہ عمرو بن عبدود ہے "حضرت علی علیہ السلام نے عرض کی حضور! میں بالکل تیار ہوں خواہ عمرو ہی کیوں نہ ہو"، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: "میرے قریب آؤ" چنانچہ علی علیہ السلام آپ کے قریب گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سر پر عمامہ باندھا اور اپنی مخصوص تلوار ذوالفقار انہیں عطا فرمائی اور ان الفاظ میں انہیں دعا دی: "خدایا! علی کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں اور بائیں سے اور اوپر

اور نیچے سے حفاظت فرما"۔

حضرت علی علیہ السلام بڑی تیزی سے عمرو کے مقابلہ کے لئے میدان میں پہنچ گئے۔

یہی وہ موقع تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا: "کل ایمان کل کفر کے مقابلہ میں جارہا ہے"۔

ضربت علی علیہ السلام ثقلین کی عبادت پر بھاری

امیر المومنین علی علیہ السلام نے پہلے تو اسے اسلام کی دعوت دی جسے اس نے قبول نہ کیا پھر میدان چھوڑ کر چلے جانے کو کہا اس پر بھی اس نے انکار کیا اور اپنے لئے باعث ننگ وعار سمجھا آپ کی تیسری پیشکش یہ تھی کہ گھوڑے سے اتر آئے اور پیادہ ہو کر دست بدست لڑائی کرے۔

عمرو آگ بگولہ ہو گیا اور کہا کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عرب میں سے کوئی بھی شخص مجھے ایسی تجویز دے گا گھوڑے سے اتر آیا اور علی علیہ السلام پر اپنی تلوار کا وار کیا لیکن امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنی مخصوص مہارت سے اس وار کو اپنی سپر کے ذریعے روکا، مگر تلوار نے سپر کو کاٹ کر آپ کے سر مبارک کو زخمی کر دیا اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا عمرو بن عبدود سے فرمایا: تو عرب کا زبردست پہلوان ہے، جب کہ میں تجھ سے تن تنہا لڑ رہا ہوں لیکن تو نے اپنے پیچھے کن لوگوں کو جمع کر رکھا ہے اس پر عمرو نے جیسے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے عمرو کی پنڈلی پر تلوار کا وار کیا، جس سے وہ سرو قد زمین پر لوٹنے لگا شدید گرد وغبار نے میدان کی فضا کو گھیر رکھا تھا کچھ منافقین یہ سوچ رہے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام، عمرو کے ہاتھوں شہید ہو گئے ہیں لیکن جب انھوں نے تکبیر کی آواز سنی تو علی کی کامیابی ان پر واضح ہو گئی اچانک لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے سر مبارک سے خون بہہ رہا تھا اور لشکر گاہ اسلام کی طرف

خراماں خراماں واپس آ رہے تھے جبکہ فتح کی مسکراہٹ آپ کے لبوں پر کھیل رہی تھی اور عمرو کا پیکر بے سر میدان کے کنارے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

عرب کے مشہور پہلوان کے مارے جانے سے لشکر احزاب اور ان کی آرزوؤں پر ضرب کاری لگی ان کے حوصلے پست اور دل انتہائی کمزور ہو گئے اس ضرب نے ان کی فتح کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے اس کامیابی کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا:

"اگر تمہارے آج کے عمل کو ساری امت محمد کے اعمال سے موازنہ کریں تو وہ ان پر بھاری ہوگا، کیونکہ عمرو کے مارے جانے سے مشرکین کا کوئی ایسا گھر باقی نہیں رہا جس میں ذلت وخواری داخل نہ ہوئی ہو اور مسلمانوں کا کوئی بھی گھر ایسا نہیں ہے جس میں عمرو کے قتل ہو جانے کی وجہ سے عزت داخل نہ ہوئی ہو"۔

اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم نیشاپوری نے اس گفتگو کو نقل کیا ہے البتہ مختلف الفاظ کے ساتھ اور وہ یہ ہے:

لمبارزة علی بن ابیطالب لعمرو بن عبدود یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامة۔

"یعنی علی بن ابی طالب کی خندق کے دن عمرو بن عبدود سے جنگ میری امت کے قیامت تک کے اعمال سے افضل ہے"

آپ کے اس ارشاد کا فلسفہ واضح ہے، کیونکہ اس دن اسلام اور قرآن ظاہراً نابودی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ان کے لئے زبردست بحرانی لحات تھے، جس شخص نے پیغمبر اکرم ﷺ کی فداکاری کے بعد اس میدان میں سب سے زیادہ ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا، اسلام کو خطرے سے محفوظ رکھا، قیامت تک اس کے دوام کی ضمانت دی، اس کی فداکاری

سے اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور پھر اسلام عالمین پر پھیل گیا لہٰذا سب لوگوں کی عبادتیں اسکی مرہون منت قرار پا گئیں۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے کسی آدمی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تا کہ وہ عمرو بن عبدود کے لاشہ کو دس ہزار درہم میں خرید لائے (شاید ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان عمرو کے بدن کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو سنگدل ظالموں نے حمزہؓ کے بدن کے ساتھ جنگ اُحد میں کیا تھا) لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کا لاشہ تمہاری ملکیت ہے ہم مردوں کی قیمت نہیں لیا کرتے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جس وقت عمرو کی بہن اپنے بھائی کے لاشہ پر پہنچی اور اس کی قیمتی زرہ کو دیکھا کہ جو حضرت علی علیہ السلام نے اس کے بدن سے نہیں اتاری تو اس نے کہا:

''میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس کا قاتل کریم اور بزرگوار شخص ہی تھا''

نعیم بن مسعود کی داستان اور دشمن کے لشکر میں پھوٹ

نعیم جو تازہ مسلمان تھے اور ان کے قبیلہ ''غطفان'' کو لشکر اسلام کی خبر نہیں تھی، وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ آپؐ مجھے جو حکم بھی دیں گے، میں حتمی کامیابی کے لئے اس پر کار بند رہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تمہارے جیسا شخص ہمارے درمیان اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تم دشمن کے لشکر کے درمیان پھوٹ ڈال سکتے ہو تو ڈالو۔ کیونکہ جنگ پوشیدہ تدابیر کا مجموعہ ہے''۔

نعیم بن مسعود نے ایک عمدہ تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ وہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس گیا، جن سے زمانہ جاہلیت میں ان کی دوستی تھی ان سے کہا اے بنی قریظہ تم جانتے ہو کہ مجھے

تمہارے ساتھ محبت ہے۔

انھوں نے کہا آپ سچ کہتے ہیں: ہم آپ پر اس بارے میں ہرگز کوئی الزام نہیں لگاتے۔

نعیم بن مسعود نے کہا: قبیلہ قریش اور غطفان تمہاری طرح نہیں ہیں، یہ تمہارا اپنا شہر ہے، تمہارا مال اولاد اور عورتیں یہاں پر ہیں اور تم ہرگز یہ نہیں کر سکتے کہ یہاں سے کوچ کر جاؤ۔

قریش اور قبیلہ غطفان محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے ساتھ جنگ کرنے کے لے آئے ہوئے ہیں اور تم نے ان کی حمایت کی ہے جبکہ ان کا شہر کہیں اور ہے اور ان کے مال او رعورتیں بھی دوسری جگہ پر ہیں، اگر انہیں موقع ملے تو لوٹ مار اور غارت گری کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے، اگر کوئی مشکل پیش آجائے تو اپنے شہر کو لوٹ جائیں گے، لیکن تم کو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اسی شہر میں رہنا ہے اور یقیناً تم اکیلے ان سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تم اس وقت تک اسلحہ نہ اٹھاؤ جب تک قریش سے کوئی معاہدہ نہ کر لو اور وہ اس طرح کہ وہ چند سرداروں اور بزرگوں کو تمہارے پاس گروی رکھ دیں تا کہ وہ جنگ میں کوتاہی نہ کریں۔

بنی قریظہ کے یہودیوں نے اس نظریہ کو بہت سراہا۔

پھر نعیم مخفی طور پر قریش کے پاس گیا اور ابوسفیان اور قریش کے چند سرداروں سے کہا کہ تم اپنے ساتھ میری دوستی کی کیفیت سے اچھی طرح آگاہ ہو، ایک بات میرے کانوں تک پہنچی ہے، جسے تم تک پہنچانا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں تا کہ خیر خواہی کا حق ادا کر سکوں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔

انھوں نے کہا کہ تم بالکل مطمئن رہو۔

نعیم کہنے لگے: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہودی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارے طرز عمل سے اپنی برائت کا فیصلہ کر چکے ہیں، یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قاصد بھیجا ہے او رکہلوایا ہے کہ ہم اپنے کئے پر پشیمان ہیں اور کیا یہ کافی ہو گا کہ ہم قبیلہ قریش اور غطفان کے

چند سردار آپ کے لئے یرغمال بنالیں اور ان کو بندھے ہاتھوں آپ کے سپرد کردیں تا کہ آپ ان کی گردن اڑادیں، اس کے بعد ہم آپ کے ساتھ مل کر ان کی بیخ کنی کریں گے؟ محمد ﷺ نے بھی ان کی پیش کش کو قبول کرلیا ہے، اس بناء پر اگر یہودی تمہارے پاس کسی کو بھیجیں اور گروی رکھنے کا مطالبہ کریں تو ایک آدمی بھی ان کے سپرد نہ کرنا کیونکہ خطرہ یقینی ہے۔

پھر وہ اپنے قبیلہ غطفان کے پاس آئے اور کہا: تم میرے اصل اور نسب کو اچھی طرح جانتے ہو۔

میں تمہارا عاشق اور فریفتہ ہوں اور میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہیں میرے خلوص نیت میں تھوڑا سا بھی شک اور شبہ ہو۔

انھوں نے کہا: تم سچ کہتے ہو، یقیناً ایسا ہی ہے۔

نعیم نے کہا: میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن ایسا ہو کہ گویا تم نے مجھ سے بات نہیں سنی۔

انھوں نے کہا: مطمئن رہو یقیناً ایسا ہی ہوگا، وہ بات کیا ہے؟

نعیم نے وہی بات جو قریش سے کہی تھی یہودیوں کے پشیمان ہونے اور یرغمال بنانے کے ارادے کے بارے میں حرف بحرف ان سے بھی کہہ دیا اور انہیں اس کام کے انجام سے ڈرایا۔

اتفاق سے وہ (ماہ شوال سن 5 ہجری کے) جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی رات تھی۔ ابوسفیان اور غطفان کے سرداروں نے ایک گروہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا: ہمارے جانور یہاں تلف ہو رہے ہیں اور یہاں ہمارے لئے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ کل صبح ہمیں حملہ شروع کرنا چاہیے تا کہ کام کو کسی نتیجے تک پہنچا ئیں۔

یہودیوں نے جواب میں کہا: کل ہفتہ کا دن ہے اور ہم اس دن کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے، علاوہ ازیں ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ اگر جنگ نے تم پر دباؤ ڈالا تو تم اپنے شہروں کی

طرف پلٹ جاؤ گے اور ہمیں یہاں تنہا چھوڑ دو گے۔ ہمارے تعاون اور ساتھ دینے کی شرط یہ ہے کہ ایک گروہ گروی کے طور پر ہمارے حوالے کردو، جب یہ خبر قبیلہ قریش اور غطفان تک پہنچی تو انھوں نے کہا: خدا کی قسم نعیم بن مسعود سچ کہتا تھا، دال میں کالا ضرور ہے۔

لہٰذا انھوں نے اپنے قاصد یہودیوں کے پاس بھیجے اور کہا: بخدا ہم تو ایک آدمی بھی تمہارے سپرد نہیں کریں گے اور اگر جنگ میں شریک ہو تو ٹھیک ہے شروع کرو۔

بنی قریظہ جب اس سے باخبر ہوئے تو انھوں نے کہا: واقعاً نعیم بن مسعود نے حق بات کہی تھی یہ جنگ نہیں کرنا چاہتے بلکہ کوئی چکر چلا رہے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ لوٹ مار کر کے اپنے شہروں کو لوٹ جائیں اور ہمیں محمد ﷺ کے مقابلہ میں اکیلا چھوڑ جائیں پھر انہوں نے پیغام بھیجا کہ اصل بات وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں، بخدا جب تک کچھ افراد گروی کے طور پر ہمارے سپرد نہیں کرو گے، ہم بھی جنگ نہیں کریں گے، قریش اور غطفان نے بھی اپنی بات پر اصرار کیا، لہٰذا ان کے درمیان بھی اختلاف پڑ گیا۔ اور یہ وہی موقع تھا کہ رات کو اس قدر زبردست سرد طوفانی ہوا چلی کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے اور دیگیں چولہوں سے زمین پر آ پڑیں۔

یہ سب عوامل مل ملا کر اس بات کا سبب بن گئے کہ دشمن کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا اور فرار کو قرار پر ترجیح دینی پڑی۔ یہاں تک کہ میدان میں ان کا ایک آدمی بھی نہ رہا۔

حذیفہ کا واقعہ

بہت سی تواریخ میں آیا ہے، کہ حذیفہ یمانی کہتے ہیں کہ ہم جنگ خندق میں بھوک و تھکن، وحشت اور اضطراب سے اس قدر دو چار تھے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، ایک رات (لشکر احزاب میں اختلاف پڑ جانے کے بعد) پیغمبر ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو چھپ چھپا کر دشمن کی لشکرگاہ میں جائے اور ان کے حالات معلوم کر لائے تاکہ وہ جیت میں

میرا رفیق اور ساتھی ہو۔

حذیفہ کہتے ہیں: خدا کی قسم کوئی شخص بھی شدت وحشت، تھکن اور بھوک کے مارے اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔

جس وقت آنحضرت ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو مجھے آواز دی، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا جاؤ اور میرے پاس ان لوگوں کی خبر لے آؤ۔ لیکن وہاں کوئی اور کام انجام نہ دینا یہاں تک کہ میرے پاس آجاؤ۔

میں ایسی حالت میں وہاں پہنچا جب کہ سخت آندھی چل رہی تھی اور طوفان برپا تھا اور خدا کا یہ لشکر انہیں تہس نہس کر رہا تھا۔ خیمے تیز آندھی کے سبب ہوا میں اڑ رہے تھے۔ آگ بیابان میں پھیل چکی تھی۔ کھانے کے برتن الٹ پلٹ گئے تھے اچانک میں نے ابوسفیان کا سایہ محسوس کیا کہ وہ اس تاریکی میں بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے قریش تم میں سے ہر ایک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے کو اچھی طرح سے پہچان لے تاکہ یہاں کوئی بیگانہ نہ ہو، میں نے پہل کر کے فوراً ہی اپنے پاس بیٹھنے والے شخص سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا، فلاں ہوں، میں نے کہا بہت اچھا۔

پھر ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، ہمارے اونٹ گھوڑے ضائع ہو چکے ہیں اور بنی قریظہ نے اپنا پیمان توڑ ڈالا ہے اور اس طوفان نے ہمارے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔

پھر وہ بڑی تیزی سے اپنے اونٹ کی طرف بڑھا اور سوار ہونے کے لئے اسے زمین سے اٹھایا، اور اس قدر جلدی میں تھا کہ اونٹ کے پاؤں میں بندھی ہوئی رسی کھولنا بھول گیا، لہٰذا اونٹ تین پاؤں پر کھڑا ہو گیا، میں نے سوچا ایک ہی تیر سے اسکا کام تمام کر دوں، ابھی تیر چلہ کمان میں جوڑا ہی تھا کہ فوراً آنحضرت ﷺ کا فرمان یاد آ گیا کہ جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کچھ کاروائی کے بغیر واپس آجانا، تمہارا کام صرف وہاں کے حالات ہمارے پاس لانا ہے، لہٰذا

میں واپس پلٹ گیا اور جا کر تمام حالات عرض کئے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا:

''خداوندا تو کتاب کو نازل کرنے والا اور سریع الحساب ہے، تو خود ہی احزاب کو نیست و نابود فرما خدایا انہیں تباہ کردے اور ان کے پاؤں نہ جمنے دے''۔

جنگ احزاب قرآن کی روشنی میں

قرآن اس کا ماجرا تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو، اپنے اوپر خدا کی عظیم نعمت کو یاد کرو، اس موقع پر جب کہ عظیم لشکر تمہاری طرف آئے''۔ [1]

''لیکن ہم نے ان پر آندھی اور طوفان بھیجے اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ رہے تھے اور اس ذریعہ سے ہم نے ان کی سرکوبی کی اور انہیں تتر بتر کردیا''۔ [2]

''نہ دکھنے والے لشکر'' سے مراد جو رسالت مآب ﷺ کی نصرت کے لئے آئے تھے، وہی فرشتے تھے جن کا مومنین کی جنگ بدر میں مدد کرنا بھی صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے لیکن جیسا (کہ سورہ انفال کی آیہ ۹ کے ذیل میں) ہم بیان کرچکے ہیں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ نظر نہ آنے والا فرشتوں کا خدائی لشکر باقاعدہ طور پر میدان میں داخل ہوا اور وہ جنگ میں بھی مصروف ہوا ہو بلکہ ایسے قرائن موجود ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ وہ صرف مومنین کے حوصلے بلند کرنے اور ان کا دل بڑھانے کے لئے نازل ہوئے تھے۔

بعد والی آیت جو جنگ احزاب کی بحرانی کیفیت، دشمنوں کی عظیم طاقت اور بہت سے

---

[1] سورہ احزاب آیت ۹

[2] سورہ احزاب آیت ۹

مسلمانوں کی شدید پریشانی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یوں کہتی ہے "اس وقت کو یاد کرو جب وہ تمہارے شہر کے اوپر اور نیچے سے داخل ہو گئے، اور مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا) اور اس وقت کو جب آنکھیں شدت وحشت سے پتھرا گئی تھیں اور جاں بلب ہو گئے تھے اور خدا کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے تھے"۔ [1]

اس کیفیت سے مسلمانوں کی ایک جماعت کے لئے غلط قسم کے گمان پیدا ہو گئے تھے کیونکہ وہ ابھی تک ایمانی قوت کے لحاظ سے کمال کے مرحلہ تک نہیں پہنچ پائے تھے یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ وہ شدت سے متزلزل ہوئے۔

شاید ان میں سے کچھ لوگ گمان کرتے تھے کہ آخر کار ہم شکست کھا جائیں گے اور اس قوت وطاقت کے ساتھ دشمن کا لشکر کامیاب ہو جائے گا، اسلام کے زندگی کے آخری دن آپہنچے ہیں اور پیغمبر ﷺ کا کامیابی کا وعدہ بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

البتہ یہ افکار اور نظریات ایک عقیدہ کی صورت میں نہیں بلکہ ایک وسوسہ کی شکل میں بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو گئے تھے بالکل ویسے ہی جیسے جنگ احد کے سلسلہ میں قرآن مجید ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "یعنی تم میں سے ایک گروہ جنگ کے ان بحرانی لمحات میں صرف اپنی جان کی فکر میں تھا اور دور جاہلیت کے گمانوں کی مانند خدا کے بارے میں بدگمانی کر رہے تھے"۔

یہی وہ منزل تھی کہ خدائی امتحان کا تنور سخت گرم ہوا جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے کہ "وہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ سخت دہل گئے تھے"۔ [2]

فطری امر ہے کہ جب انسان فکری طوفانوں میں گھر جاتا ہے تو اس کا جسم بھی ان طوفانوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، بلکہ وہ بھی اضطراب اور تزلزل کے سمندر میں ڈوبنے لگتا ہے، ہم

---

[1] سورہ احزاب آیت 10

[2] سورہ احزاب آیت 11

نے اکثر دیکھا ہے کہ جب لوگ ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں تو وہ جہاں بھی بیٹھتے ہیں اکثر بے چین رہتے ہیں، ہاتھ ملتے کانپتے رہتے ہیں اور اپنے اضطراب اور پریشانیوں کو اپنی حرکات سے ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

اس شدید پریشانی کے شواہد میں سے ایک یہ بھی تھا جسے مؤرخین نے بھی نقل کیا ہے کہ عرب کے پانچ مشہور جنگجو پہلوان جن کا سردار عمرو بن عبدود تھا، جنگ کا لباس پہن کر اور مخصوص غرور اور تکبر کے ساتھ میدان میں آئے اور **ھل من مبارز** (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) کی آواز لگانے لگے، خاص کر عمرو بن عبدود رجز پڑھ کر جنت اور آخرت کا مذاق اڑا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ "کیا تم یہ نہیں کہتے ہو کہ تمہارے مقتول جنت میں جائیں گے؟ تو کیا تم میں سے کوئی بھی جنت کے دیدار کا شوقین نہیں ہے؟" لیکن اس کے ان نعروں کے برخلاف لشکر اسلام پر بری طرح کی خاموشی طاری تھی اور کوئی بھی مقابلہ کی جرائت نہیں رکھتا تھا سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جو مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو عظیم کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ اس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔

جی ہاں جس طرح فولاد کو گرم بھٹی میں ڈالتے ہیں تا کہ وہ نکھر جائے اسی طرح اوائل کے مسلمان بھی جنگ احزاب جیسے معرکوں کی بھٹی میں سے گزریں تا کہ کندن بن کر نکلیں اور حوادثات کے مقابل میں جرأت اور پامردی کا مظاہرہ کر سکیں۔

منافقین اور ضعیف الایمان جنگ احزاب میں

ہم کہہ چکے ہیں کہ امتحان کی بھٹی جنگ احزاب میں گرم ہوئی اور سب کے سب اس عظیم امتحان میں گھر گئے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے بحرانی دور میں جو لوگ عام حالات میں ظاہراً ایک ہی صف میں قرار پاتے ہیں، کئی صفوں میں بٹ جاتے ہیں، یہاں پر بھی مسلمان مختلف

گروہوں میں بٹ گئے تھے، ایک جماعت سچے مومنین کی تھی، ایک گروہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے منافقین کا تھا اور ایک گروہ اپنے گھر بار، زندگی اور بھاگ کھڑے ہونے کی فکر میں تھا، اور کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ دوسرے لوگوں کو جہاد سے روکیں۔ اور ایک گروہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ منافقین کے ساتھ اپنے رشتہ کو محکم کریں۔

خلاصہ یہ کہ ہر شخص نے اپنے باطنی اسرار اس عجیب "عرصہ محشر" اور "یوم البروز" میں آشکار کر دیئے۔

میں نے ایران، روم اور مصر کے محلوں کو دیکھا ہے

خندق کھودنے کے دوران میں جب ہر ایک مسلمان خندق کے ایک حصہ کے کھودنے میں مصروف تھا تو ایک مرتبہ پتھر کے ایک سخت اور بڑے ٹکڑے سے ان کا سامنا ہوا کہ جس پر کوئی ہتھوڑا کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا، حضرت رسالت مآب ﷺ کو خبر دی گئی تو آنحضرت ﷺ بنفس نفیس خندق میں تشریف لے گئے اور اس پتھر کے پاس کھڑے ہو کر اور ہتھوڑا لے کر پہلی مرتبہ ہی اس کے دل پر ایسی مضبوط چوٹ لگائی کہ اس کا کچھ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس سے ایک چمک نکلی جس پر آپؐ نے فتح و کامرانی کی تکبیر بلند کی۔ آپؐ کے ساتھ دوسرے مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے ایک اور سخت چوٹ لگائی تو اس کا کچھ حصہ اور ٹوٹا اور اس سے بھی چمک نکلی۔ اس پر بھی سرورِ کونین ﷺ نے تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی آپؐ کے ساتھ تکبیر کہی آخر کار آپؐ نے تیسری چوٹ لگائی جس سے بجلی کوندی اور باقی ماندہ پتھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، حضور اکرم ﷺ نے پھر تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا، اس موقع پر جناب سلمان فارسی نے اس ماجرا کے بارے میں دریافت کیا تو سرکار رسالت مآب ﷺ نے

فرمایا: "پہلی چمک میں میں نے "حیرہ" کی سرزمین اور ایران کے بادشاہوں کے قصر ومحلات دیکھے ہیں اور جبرائیل نے مجھے بشارت دی ہے کہ میری امت ان پر کامیابی حاصل کرے گی، دوسری چمک میں "شام اور روم" کے سرخ رنگ کے محلات نمایاں ہوئے اور جبرائیل نے پھر بشارت دی کہ میری امت ان پر فتح یاب ہوگی، تیسری چمک میں مجھے "صنعاء یمن" کے قصر ومحلات دکھائی دیئے ور جبرائیل نے نوید دی کہ میری امت ان پر بھی کامیابی حاصل کرے گی، اے مسلمانو تمہیں خوشخبری ہو"۔

منافقین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: کیسی عجیب وغریب باتیں کر رہے ہیں اور کیا ہی باطل اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہے؟ مدینہ سے حیرہ اور مدائن کسری کو تو دیکھ کر تمہیں ان کے فتح ہونے کی خبر دیتا ہے حالانکہ اس وقت تم چند عربوں کے چنگل میں گرفتار ہو (اور خود دفاعی پوزیشن اختیار کئے ہوئے ہو) تم تو "بیت الخلاء" (خوف کی جگہ) تک نہیں جا سکتے (کیا ہی خیال خام اور گمان باطل ہے)۔

الٰہی وحی نازل ہوئی اور کہا:

"یہ منافق اور دل کے مریض کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول نے سوائے دھوکہ و فریب کے ہمیں کوئی وعدہ نہیں دیا، (وہ پروردگار کی بے انتہا قدرت سے بے خبر ہیں"۔) [1]

اس وقت اس قسم کی بشارت اور خوشخبری سوائے آگاہ اور باخبر مومنین کی نظر کے علاوہ (باقی لوگوں کے لئے) دھوکا اور فریب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن پیغمبر ﷺ کی ملکوتی آنکھیں ان آتشیں چنگاریوں کے درمیان سے جو کدالوں اور ہتھوڑوں کے خندق کھودنے کے لئے زمین پر لگنے سے نکلتی تھیں، ایران روم اور یمن کے بادشاہوں کے قصر ومحلات کے دروازوں کے کھلنے کو دیکھ سکتے تھے اور آئندہ کے اسرار ورموز سے پردے بھی اٹھا سکتے تھے۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 12

منافقانہ عذر

جنگ احزاب کے واقعہ کے سلسلے میں قرآن مجید منافقین اور دل کے بیمار لوگوں میں سے ایک خطرناک گروہ کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے جو دوسروں کی نسبت زیادہ خبیث او ر آلودہ گناہ ہیں، چنانچہ کہتا ہے: ''اور اس وقت کو بھی یاد کرو، جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا: اے یثرب (مدینہ) کے رہنے والو یہاں تمہارے رہنے کی جگہ نہیں ہے، اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاؤ''۔ [1]

خلاصہ یہ کہ دشمنوں کے اس انبوہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہو سکتا، اپنے آپ کو معرکہ کار زار سے نکال کرلے جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاکت کے اور بیوی بچوں کو قید کے حوالے نہ کرو۔ اس طرح سے وہ چاہتے تھے کہ ایک طرف سے تو وہ انصار کے گروہ کو لشکر اسلام سے جدا کرلیں اور دوسری طرف ''انہیں منافقین کا ٹولہ جن کے گھر مدینہ میں تھے، نبی اکرم ﷺ سے اجازت مانگ رہے تھے کہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنی اس واپسی کے لئے حیلے بہانے پیش کررہے تھے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے گھروں کے درودیوار ٹھیک نہیں ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا، اس طرح سے وہ میدان کو خالی چھوڑ کر فرار کرنا چاہتے تھے''۔ [2]

منافقین اس قسم کا عذر پیش کرکے یہ چاہتے تھے کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر اپنے گھروں میں جاکر پناہ لیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ قبیلہ ''بنی حارثہ'' نے کسی شخص کو حضور رسالت پناہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصار میں سے کسی کا گھر بھی ہمارے

---

[1] سورہ احزاب آیت 12

[2] سورہ احزاب آیت 13

گھروں کی طرح نہیں اور ہمارے اور قبیلہ "غطفان" کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو مدینہ کی مشرقی جانب سے حملہ آور ہو رہے ہیں، لہٰذا اجازت دیجئے تا کہ ہم اپنے گھروں کو پلٹ جائیں اور اپنے بیوی بچوں کا دفاع کریں تو سرکار رسالت ﷺ نے انہیں اجازت عطا فرما دی۔

جب یہ بات انصار کے سردار "سعد بن معاذ" کے گوش گذار ہوئی تو انھوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں عرض کیا "سرکار انہیں اجازت نہ دیجئے، بخدا آج تک جب بھی کوئی مشکل درپیش آئی تو ان لوگوں نے یہی بہانہ تراشا، یہ جھوٹ بولتے ہیں"۔ [1]

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ واپس آجائیں۔ [2]

قرآن میں خداوند عالم اس گروہ کے ایمان کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اسلام کے اظہار میں اس قدر ضعیف اور ناتواں ہیں کہ اگر دشمن مدینہ کے اطراف و جوانب سے اس شہر میں داخل ہو جائیں اور مدینہ کو فوجی کنٹرول میں لے کر انہیں پیش کش کریں کہ کفر و شرک کی طرف پلٹ جائیں تو جلدی سے اس کو قبول کرلیں گے اور اس راہ کے انتخاب

---

[1] سورہ احزاب آیت 14

[2] "یثرب" مدینہ کا قدیمی نام ہے، جناب رسالت مآب ﷺ کے اس شہر کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے تک اس کا نام "یثرب" رہا پھر آہستہ آہستہ اس کا نام "مدینۃ الرسول" (پیغمبر کا شہر) پڑ گیا جس کا مخفف "مدینہ" ہے۔ اس شہر کے کئی ایک نام اور بھی ہیں۔ سید مرتضی نے ان دو ناموں (مدینہ اور یثرب) کے علاوہ اس شہر کے گیارہ اور نام بھی ذکر کیے ہیں، منجملہ ان کے "طیبہ" "طابہ" "سکینہ" "محبوبہ" "مرحومہ" اور "قاصمہ" ہیں۔ (اور بعض لوگ اس شہر کی زمین کو "یثرب" کا نام دیتے ہیں)

چند ایک روایات میں آیا ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ "اس شہر کو یثرب نہ کہا کرو شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ یثرب اصل میں "ثرب" (بروزن حرب) کے مادہ سے ملامت کرنے کے معنی میں ہے اور آپؐ اس قسم کے نام کو اس بابرکت شہر کے لئے پسند نہیں فرماتے تھے"۔

بہر حال منافقین نے اہل مدینہ کو "یا اہل یثرب" کے عنوان سے جو خطاب کیا ہے وہ بلاوجہ نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو اس نام سے نفرت ہے، یا چاہتے تھے کہ اسلام اور "مدینۃ الرسول" کے نام کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کریں۔ یا لوگوں کو زمانہ جاہلیت کی یاد تازہ کرائیں۔

کرنے میں ذرا سا بھی توقف نہیں کریں گے"۔ [1]

ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قدرت ضعیف، کمزور اور غیر مستقل مزاج ہوں کہ نہ تو دشمن سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں اور نہ ہی راہ خدا میں شہادت قبول کرنے کے لئے، ایسے لوگ بہت جلد ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اپنی راہ فوراً بدل دیتے ہیں۔

پھر قرآن اس منافق ٹولے کو عدالت کے کٹہرے میں لا کر کہتا ہے: "انھوں نے پہلے سے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھا ہوا تھا کہ دشمن کی طرف پشت نہیں کریں گے اور اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہوئے توحید، اسلام اور پیغمبر کے لئے دفاع میں کھڑے ہوں گے، کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا سے کئے گئے عہد و پیمان کے بارے میں سوال کیا جائے گا"۔ [2]

جب خدا نے منافقین کی نیت کو فاش کر دیا کہ ان کا مقصد گھروں کی حفاظت کرنا نہیں، بلکہ میدان جنگ سے فرار کرنا ہے تو انہیں دو دلیلوں کے ساتھ جواب دیتا ہے۔

پہلے تو پیغمبر ﷺ سے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے کہ اگر موت یا قتل ہونے سے فرار کرتے ہو تو یہ فرار تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچائے گا اور تم دنیاوی زندگی کے چند دن سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا پاؤ گے"۔ [3]

دوسرا یہ کہ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا سارا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے اور تم اس کی قدرت ومشیت کے دائرہ اختیار سے ہرگز بھاگ نہیں سکتے۔

"اے پیغمبر ﷺ ان سے کہہ دیجئے: کون شخص خدا کے ارادہ کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کر سکتا ہے، اگر وہ تمہارے لئے مصیبت یا رحمت چاہتا ہے"۔ [4]

---

[1] سورہ احزاب آیت 14

[2] سورہ احزاب آیت 15

[3] سورہ احزاب آیت 16

[4] سورہ احزاب آیت 17

روکنے والا ٹولہ

اس کے بعد قرآن مجید منافقین کے اس گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جنگ احزاب کے میدان سے خود کنارہ کش ہوا اور دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی دعوت دیتا ہو فرماتا ہے: "خدا تم میں سے اس گروہ کو جانتا ہے جو کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو جنگ سے منحرف کر دیں، اور اسی طرح سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ ہماری طرف آؤ اور اس خطرناک جنگ سے دستبردار ہو جاؤ"۔

وہی لوگ جو اہل جنگ نہیں ہیں اور سوائے کم مقدار کے اور وہ بھی بطور جبر واکراہ یاد کھاوے کے؛ جنگ کے لئے نہیں جاتے۔ [1]

ہم ایک روایت میں پڑھتے ہیں کہ ایک صحابی رسول کسی ضرورت کے تحت میدان "احزاب" سے شہر میں آیا ہوا تھا اس نے اپنے بھائی کو دیکھا کہ اس نے اپنے سامنے روٹی، بھنا ہوا گوشت اور شراب رکھے ہوئے تھے، تو صحابی نے کہا تم تو یہاں عیش وعشرت میں مشغول ہو اور رسول خدا نیزوں اور تلواروں کے درمیان مصروف پیکار ہیں اس نے جواب میں کہا، اے بے وقوف: تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور مزے اڑاؤ اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس کی محمدؐ کھاتا ہے وہ اس میدان سے ہرگز پلٹ کر واپس نہیں آئے گا اور یہ عظیم لشکر جو جمع ہو چکا ہے اسے اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ سن کر وہ صحابی کہنے لگے: تو بکتا ہے، خدا کی قسم میں ابھی رسول اللہ کے پاس جا کر تمہاری اس گفتگو سے باخبر کرتا ہوں، چنانچہ انھوں نے بارگاہ رسالت میں پہنچ کر تمام ماجرا بیان کیا۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 18

وہ ہرگز ایمان نہیں لائے

قرآن فرماتا ہے: "ان تمام رکاوٹوں کا باعث یہ ہے کہ وہ تمہاری بابت تمام چیزوں میں بخیل ہیں"۔ [1]

نہ صرف میدان جنگ میں جان قربان کرنے میں بلکہ وسائل جنگ مہیا کرنے کے لئے مالی امداد اور خندق کھودنے کے لئے جسمانی امداد حتیٰ کہ فکری امداد مہیا کرنے میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں، ایسا بخل جو حرص کے ساتھ ہوتا ہے اور ایسا حرص جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ان کے بخل اور ہر قسم کے ایثار سے دریغ کرنے کے بیان کے بعد ان کے ان دوسرے اوصاف کو جو ہر عہد اور ہر دور کے تمام منافقین کے لئے تقریباً عمومیت کا درجہ رکھتے ہیں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "جس وقت خوفناک اور بحرانی لمحات آتے ہیں تو وہ اس قدر بزدل اور ڈرپوک ہیں کہ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ ان کی آنکھوں میں ڈھیلے بے اختیار گردش کر رہے ہیں، اس شخص کی طرح جو جاں کنی میں مبتلا ہو"۔ [2]

چونکہ وہ صحیح ایمان کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی زندگی میں ان کا کوئی مستحکم سہارا ہے، جس وقت کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ لوگ بالکل اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں جیسے ان کی روح قبض ہی ہو جائے گی۔

پھر مزید کہتا ہے: "لیکن یہی لوگ جس وقت طوفان رک جاتا ہے اور حالات معمول پر آجاتے ہیں تو تمہارے پاس یہ توقع لے کر آتے ہیں کہ گویا جنگ کے اصلی فاتح یہی ہیں اور قرض خواہوں کی طرح پکار پکار کر سخت اور درشت الفاظ کے ساتھ مال غنیمت سے اپنے حصہ کا مطالبہ

[1] سورہ احزاب آیت 19

[2] سورہ احزاب آیت 19

کرتے ہیں اور اس میں سخت گیر، بخیل اور حریص ہیں"۔ [1]

آخر میں ان کی آخری صفت کی طرف جو در حقیقت میں ان کی تمام بدبختیوں کی جڑ اور بنیاد ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "وہ ہرگز ایمان نہیں لائے۔ اور اسی بنا پر خدا نے ان کے اعمال نیست و نابود کر دیئے ہیں کیونکہ ان کے اعمال خدا کے لئے نہیں ہیں اور ان میں اخلاص نہیں پایا جاتا۔" [2]

"وہ اس قدر وحشت زدہ ہو چکے ہیں کہ احزاب اور دشمن کے لشکروں کے پراگندہ ہو جانے کے بعد بھی یہ تصور کرتے ہیں کہ ابھی وہ نہیں گئے"۔ [3]

وحشت ناک اور بھیانک تصور نے ان کی فکر پر سایہ کر رکھا ہے گویا کفر کی افواج پے در پے ان کی آنکھوں کے سامنے قطار در قطار چلی جا رہی ہیں، ننگی تلواریں اور نیزے تانے ان پر حملہ کر رہی ہیں۔

یہ بزدل جھگڑالو، ڈرپوک منافق اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں، جب کسی گھوڑے کے ہنہنانے یا کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز سنتے ہیں تو مارے خوف کے لرزنے لگتے ہیں کہ شاید احزاب کے لشکر واپس آ رہے ہیں۔

اس کے بعد کہتا ہے: "اگر احزاب دوبارہ پلٹ کر آ جائے تو وہ اس بات پر تیار ہیں کہ بیابان کا رخ کر لیں اور بادیہ نشین بدوؤں کے درمیان منتشر ہو کر پنہاں ہو جائیں ہاں، ہاں وہ چلے جائیں اور وہاں جا کر رہیں اور ہمیشہ تمہاری خبروں کے جویا رہیں"۔ [4]

ہر مسافر سے تمہاری ہر ہر پل کی خبر کے جویا رہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں احزاب ان کی جگہ

---

[1] سورہ احزاب آیت 19

[2] سورہ احزاب آیت 19

[3] سورہ احزاب آیت 20

[4] سورہ احزاب آیت 20

کے قریب آجائیں اور ان کا سایہ ان کے گھر کی دیواروں پر آ پڑے اور تم پر یہ احسان جتلائیں کہ وہ ہمیشہ تمہاری حالت اور کیفیت کے بارے میں فکر مند تھے۔

اور آخری جملہ میں کہتا ہے:

''بالفرض وہ فرار بھی نہ کرتے اور تمہارے درمیان ہی رہتے، پھر بھی سوائے تھوڑی سی جنگ کے وہ کچھ نہ کر پاتے''۔ [1]

نہ ان کے جانے سے تم پریشان ہونا اور نہ ہی ان کے موجود رہنے سے خوشی منانا، کیونکہ نہ تو ان کی قدر و قیمت ہے اور نہ ہی کوئی خاص حیثیت، بلکہ ان کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہے۔

ان کی یہی تھوڑی سی جنگ بھی خدا کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کی سرزنش اور ملامت کے خوف اور ظاہرداری یا ریاکاری کے لئے ہے کیونکہ اگر خدا کے لئے ہوتی تو اس کی کوئی حد و انتہا نہ ہوتی اور جب تک جان میں جان ہوتی وہ اس میدان میں ڈٹے رہتے۔

جنگ احزاب میں سچے مومنین کا کردار

اب تک مختلف گروہوں اور ان کے جنگ احزاب میں کارناموں کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جن میں ضعیف الایمان مسلمان، منافق، کفر و نفاق کے سرغنہ اور جہاد سے روکنے والے شامل ہیں۔

قرآن مجید اس گفتگو کے آخر میں ''سچے مومنین'' ان کے بلند حوصلوں، پامردیوں، جراتوں اور اس عظیم جہاد میں ان کی دیگر خصوصیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

اس بحث کی تمہید کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے شروع کرتا ہے جو مسلمانوں کے

---

[1] سورہ احزاب آیت 20

پیشوا، سردار اور اسوہ کامل تھے، خدا کہتا ہے: ''تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور (میدان احزاب میں) ان کا کردار ایک اچھا نمونہ اور اسوہ ہے، ان لوگوں کے لئے جو رحمت خدا اور روز قیامت کی امید رکھتے ہیں اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں۔'' [1]

تمہارے لئے بہترین اسوہ اور نمونہ، نہ صرف اس میدان میں بلکہ ساری زندگی پیغمبر اسلام کی ذات والا صفات ہے آپ کے بلند حوصلے، صبر و استقامت، پائمردی، زیرکی، دانائی، خلوص، خدا کی طرف توجہ، حادثات پر کنٹرول، مشکلات اور مصائب کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا، غرضکہ ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لئے نمونہ کامل اور اسوہ حسنہ ہے۔

وہ ایسا عظیم ناخدا ہے کہ جب اس کی کشتی سخت ترین طوفانوں میں گھر جاتی ہے تو ذرہ برابر بھی کمزوری، گھبراہٹ اور سراسیمگی کا مظاہرہ نہیں کرتا وہ کشتی کا ناخدا بھی ہے اور اس کا قابل اطمینان لنگر اور چراغ ہدایت بھی وہ اس میں بیٹھنے والوں کے لئے آرام وسکون کا باعث بھی ہے اور ان کے لئے راحت جان بھی۔

وہ دوسرے مؤمنین کے ساتھ مل کر کدال ہاتھ میں لیتا ہے اور خندق کھودتا ہے، بیلچے کے ساتھ پتھر اکھاڑ کر خندق سے باہر ڈال آتا ہے اپنے اصحاب کے حوصلے بڑھانے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کے لئے ان سے مزاح بھی کرتا ہے ان کے قلب و روح کو گرمانے کے حربی اور جوش وجذبہ دلانے والے اشعار پڑھ کر انہیں ترغیب بھی دلاتا ہے، ذکر خدا کرنے پر مسلسل اصرار کرتا ہے اور انہیں درخشاں مستقبل اور عظیم فتوحات کی خوشخبری دیتا ہے انہیں منافقوں کی سازشوں سے متنبہ کرتا ہے اور ان سے ہمیشہ خبردار رہنے کا حکم دیتا ہے۔

صحیح حربی طریقوں اور بہترین فوجی چالوں کو انتخاب کرنے سے ایک لحہ بھی غافل نہیں رہتا اس کے باوجود مختلف طریقوں سے دشمن کی صفوں میں شگاف ڈالنے سے بھی نہیں چوکتا۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 21

جی ہاں: وہ مومنین کا بہترین مقتدا ہے اور ان کے لئے اسوہ حسنہ ہے اس میدان میں بھی اور دوسرے تمام میدانوں میں بھی۔

مومنین کے صفات

اس مقام پر مومنین کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے:

جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں سب سے زیادہ پیش قدمی کرتے تھے وہ خدا سے کئے ہوئے اپنے اس عہد و پیمان پر قائم تھے کہ وہ آخری سانس اور آخری قطرہ خون تک فداکاری اور قربانی کے لئے تیار ہیں فرمایا گیا ہے مومنین میں ایسے بھی ہیں جو اس عہد و پیمان پر قائم ہیں جو انھوں نے خدا سے باندھا ہے ان میں سے کچھ نے تو میدان جہاد میں شربت شہادت نوش کرلیا ہے اور بعض انتظار میں ہیں اور انھوں نے اپنے عہد و پیمان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ [1]

اور نہ ہی ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی ہے۔

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ یہ آیت کن افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اہل سنت کے مشہور عالم، حاکم ابوالقاسم حسکانی سند کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

آیہ "رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه" ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے اور بخدا میں ہی وہ شخص ہوں جو (شہادت کا) انتظار کر رہا ہوں (اور قبل از ایں ہم میں حمزہ سید الشہدا علیہ السلام جیسے لوگ شہادت نوش کرچکے ہیں) اور میں نے ہرگز اپنی روش اور اپنے طریقہ کار میں تبدیلی نہیں کی اور اپنے کئے ہوئے عہد و پیمان پر قائم ہوں۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 23

جنگ بنی قریظہ

مدینہ میں یہودیوں کے تین مشہور قبائل رہتے تھے:

بنی قریظہ، بنی النضیر اور بنی قینقاع۔

تینوں گروہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ آپؐ کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے، ان کے لئے جاسوسی نہیں کریں گے، اور مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر امن و آشتی کی زندگی گزاریں گے، لیکن قبیلہ بنی قینقاع نے ہجرت کے دوسرے سال اور قبیلہ بنی نضیر نے ہجرت کے چوتھے سال مختلف حیلوں بہانوں سے اپنا معاہدہ توڑ ڈالا، اور پیغمبر اکرم ﷺ سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے آخر کار ان کی مزاحمت اور مقابلہ کی سکت ختم ہو گئی اور وہ مدینہ سے باہر نکل گئے۔

بنی قینقاع ''اذرعات'' شام کی طرف چلے گئے اور بنی نضیر کے کچھ لوگ تو خیبر کی طرف اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔

اسی بناء پر ہجرت کے پانچویں سال جب کہ جنگ احزاب پیش آئی تو صرف قبیلہ بنی قریظہ مدینہ میں باقی رہ گیا تھا، وہ بھی اس میدان میں اپنے معاہدہ کو توڑ کر مشرکین عرب کے ساتھ مل گئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں تلواریں سونت لیں۔

جب جنگ احزاب ختم ہو گئی اور قریش، بنی غطفان اور دیگر قبائل عرب بھی رسوا کن شکست کے بعد مدینہ سے پلٹ گئے تو اسلامی روایات کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ اپنے گھر لوٹ آئے اور جنگی لباس اتار کر نہانے دھونے میں مشغول ہو گئے تو اس موقع پر جبرائیل حکم خدا سے آپ پر نازل ہوئے اور کہا: کیوں آپ نے ہتھیار اتار دیئے ہیں جبکہ فرشتے ابھی تک آمادہ پیکار ہیں آپ فوراً بنی قریظہ کی طرف جائیں اور ان کا کام تمام کر دیں۔

واقعاً بنی قریظہ کا حساب چکانے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں تھا مسلمان

اپنی کامیابی پر خوش خرم تھے، بنی قریظہ شکست کی شدید وحشت میں گرفتار تھے اور قبائل عرب میں سے ان کے دوست اور حلیف تھکے ماندے اور بہت ہی پست حوصلوں کے ساتھ شکست خوردہ حالت میں اپنے اپنے شہروں اور علاقوں میں جا چکے تھے اور کوئی نہیں تھا جو ان کی حمایت کرے۔

بہرحال منادی نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ندا دی کہ نماز عصر پڑھنے سے پہلے بنی قریظہ کی طرف چل پڑو مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ ہی بنی قریظہ کے محکم و مضبوط قلعوں کو مسلمانوں نے اپنے محاصرے میں لے لیا۔

پچیس دن تک محاصرہ جاری رہا چنانچہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بنی قریظہ کے قلعوں پر حملہ کرنے کے لئے اتنی جلدی کی کہ بعض مسلمان نماز عصر سے غافل ہو گئے کہ مجبوراً بعد میں قضا کی، خداوند عالم نے ان کے دلوں میں سخت رعب و دبدبہ طاری ہو گیا۔

تین تجاویز

''کعب بن اسد'' کا شمار یہودیوں کے سرداروں میں ہوتا تھا اس نے اپنی قوم سے کہا: مجھے یقین ہے کہ محمد ہمیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم جنگ نہ کریں لہٰذا میری تین تجاویز ہیں، ان میں سے کسی ایک کو قبول کرلو، پہلی تجویز تو یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس پر ایمان لے آؤ اور اس کی پیروی اختیار کرلو کیونکہ تم پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے اور اس کی نشانیاں تمہاری کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو اس صورت میں تمہارے مال، جان، اولاد اور عورتیں محفوظ ہو جائیں گی۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ہرگز حکم توریت سے دست بردار نہیں ہوں گے اور نہ ہی اس کا متبادل اختیار کریں گے۔

اس نے کہا: اگر یہ تجویز قبول نہیں کرتے تو پھر آؤ اور اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے

ہاتھوں سے قتل کرڈالو تاکہ ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو کر میدان جنگ میں کود پڑیں اور پھر دیکھیں کہ خدا کیا چاہتا ہے؟ اگر ہم مارے گئے تو اہل وعیال کی جانب سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور اگر کامیاب ہو گئے تو پھر عورتیں بھی بہت بچے بھی بہت۔

وہ کہنے لگے کہ ہم ان بے چاروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کردیں؟ ان کے بعد ہمارے لئے زندگی کی قدرو قیمت کیا رہ جائے گی؟

کعب بن اسد نے کہا: اگر یہ بھی تم نے قبول نہیں کیا تو آج چونکہ ہفتہ کی رات ہے محمد ﷺ اور اس کے ساتھی یہ خیال کریں گے کہ ہم آج رات حملہ نہیں کریں گے انہیں اس غفلت میں ڈال کر ان پر حملہ کردیں شاید کامیابی حاصل ہو جائے۔

وہ کہنے لگے کہ یہ کام بھی ہم نہیں کریں گے کیونکہ ہم کسی بھی صورت میں ہفتہ کا احترام پامال نہیں کریں گے۔

کعب کہنے لگا: پیدائش سے لے کر آج تک تمہارے اندر عقل نہیں آسکی۔

اس کے بعد انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بات کی کہ "ابولبابہ" کو ان کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ ان سے صلاح مشورہ کرلیں۔

ابولبابہ کی خیانت

جس وقت ابولبابہ ان کے پاس آئے تو یہودیوں کی عورتیں اور بچے ان کے سامنے گریہ وزاری کرنے لگے اس بات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہم محمدؐ کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ ابولبابہ نے کہا ہاں اور ساتھ ہی اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا یعنی تم سب کو قتل کردیں گے۔

ابولبابہ کہتے ہیں، جیسے ہی میں وہاں سے چلا تو مجھے اپنی خیانت کا شدید احساس ہوا

پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس نہ گیا بلکہ سیدھا مسجد کی طرف چلا اور اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور کہا اپنی جگہ سے اس وقت تک حرکت نہیں کروں گا جب تک خدا میری توبہ قبول نہ کرلے۔

سات دن تک اس نے نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا اور یونہی بے ہوش پڑا رہا یہاں تک کہ خدا نے اس کی توبہ قبول کرلی، جب یہ خبر بعض مومنین کے ذریعہ اس تک پہنچی تو اس نے قسم کھائی میں خود اپنے کو اس ستون سے نہیں کھولوں گا یہاں تک کہ پیغمبر ﷺ آکر کھولیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ آئے اور اس کو کھولا ابولبابہ نے کہا کہ اوئی توبہ کو کامل ہونے کے لئے اپنا سارا مال راہ خدا میں دیتا ہوں۔ اس وقت پیغمبر ﷺ نے کہا: ایک سوم مال کافی ہے، "آخرکار خدانے اس کا یہ گناہ اس کی صداقت کی بناء پر بخش دیا"۔[1]

لیکن آخرکار بنی قریظہ کے یہودیوں نے مجبور ہوکر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

جناب پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا سعد بن معاذ تمہارے بارے میں جو فیصلہ کردیں کیا وہ تمہیں قبول ہے؟ وہ راضی ہوگئے۔

سعد بن معاذ نے کہا کہ اب وہ موقع آن پہنچا ہے کہ سعد کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو نظر میں رکھے بغیر حکم خدا بیان کرے۔

سعد نے جس وقت یہودیوں سے دوبارہ یہی اقرار لے لیا تو آنکھیں بند کرلیں اور جس طرف پیغمبر ﷺ کھڑے ہوئے تھے ادھر رخ کرکے عرض کیا: آپ بھی میرا فیصلہ قبول کریں گے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ضرور: تو سعد نے کہا: میں کہتا ہوں کہ جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ تھے (بنی قریظہ کے مرد) انہیں قتل کردینا چاہیئے، ان کی عورتیں اور بچے قید اور ان کے اموال تقسیم کردیئے جائیں البتہ ان میں سے ایک گروہ اسلام قبول کرنے کے بعد

[1] سورہ توبہ آیت 102

قتل ہونے سے بچ گیا۔

قرآن اس ماجرا کی طرف مختصر اور بلیغ اشارہ کرتا ہے اور اس ماجرا کا تذکرہ خدا کی ایک عظیم نعمت اور عنایت کے طور پر ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جنہوں نے مشرکین عرب کی حمایت کی تھی، ان کے محکم و مضبوط قلعوں سے نیچے کھینچا"۔ [1]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے قلعے مدینہ کے پاس بلند اور اونچی جگہ پر بنا رکھے تھے اور ان کے بلند برجوں سے اپنا دفاع کرتے تھے "انزل" (نیچے لے آیا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: "خدا نے ان کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا":

آخرکار ان کا مقابلہ یہاں تک پہنچ گیا کہ "تم ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے کو اسیر بنا رہے تھے اور ان کی زمینیں گھر اور مال و متاع تمہارے اختیار میں دے دیا"۔ [2]

یہ چند جملے جنگ بنی قریظہ کے عام نتائج کا خلاصہ ہیں۔ ان خیانت کاروں میں سے کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، کچھ قید ہو گئے اور بہت زیادہ مال غنیمت جس میں ان کی زمینیں، گھر، مکانات اور مال و متاع شامل تھا، مسلمانوں کو ملا۔

صلح حدیبیہ

---

[1] سورہ احزاب آیت 26

[2] سورہ احزاب آیات 26، 27

چھٹی ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے قصد سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، مسلمانوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی اطلاع مل چکی تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام اصحاب کے ساتھ ''مسجد الحرام'' میں وارد ہونے کو خواب میں دیکھا ہے، اور تمام مسلمانوں کو اس سفر میں شرکت کا شوق دلایا، اگرچہ ایک گروہ کنارہ کش ہوگیا، مگر مہاجرین وانصار اور بادیہ نشین اعراب کی ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ جمعیت جو تقریباً ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل تھی، سب کے سب نے لباس احرام پہنا ہوا تھا، اور تلوار کے علاوہ جو مسافروں کا اسلحہ شمار ہوتی تھی، کوئی جنگی ہتھیار ساتھ نہ لیا تھا۔

جب مسلمان ''ذی الحلیفہ'' مدینہ کے نزدیک پہنچے، اور بہت اونٹوں کو قربانی کے لئے لے لیا۔

پیغمبرؐ (اور آپؐ کے اصحاب کا) طرز عمل بتا رہا تھا کہ عبادت کے علاوہ کوئی دوسرا قصد نہیں تھا۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نزدیکی مقام پر پہنچے آپ کو اطلاع ملی کہ قریش نے یہ پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ آپؐ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے، یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مقام ''حدیبیہ'' میں پہنچ گئے (حدیبیہ مکہ سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بستی ہے، جو ایک کنویں یا درخت کی مناسبت سے اس نام سے موسوم تھی) حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ تم سب اسی جگہ پر رک جاؤ، لوگوں نے عرض کی کہ یہاں تو کوئی پانی نہیں ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزانہ طور پر اس کنویں سے جو وہاں تھا، اپنے اصحاب کے لئے پانی فراہم کیا۔

اسی مقام پر قریش اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان سفراء آتے جاتے رہے تاکہ کسی طرح سے مشکل حل ہو جائے، آخر کار ''عروہ ابن مسعود ثقفی'' جو ایک ہوشیار آدمی تھا، قریش کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں جنگ کے ارادے سے نہیں آیا اور میرا مقصد صرف خانہ خدا کی زیارت ہے، ضمناً عروہ نے اس ملاقات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کرنے کا منظر بھی دیکھا، کہ صحابہ آپؐ کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین

پر گرنے نہیں دیتے تھے، جب وہ واپس لوٹا تو اس نے قریش سے کہا: میں قیصر و کسری اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں۔ میں نے کسی سربراہ مملکت کو اس کی قوم کے درمیان اتنا با عظمت نہیں دیکھا، جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو ان کے اصحاب کے درمیان دیکھا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ جائیں گے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، دیکھو تمہارا مقابلہ ایسے ایثار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ تمہارے لئے غور و فکر کا مقام ہے۔

بیعت رضوان

اسی دوران پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر سے فرمایا: کہ وہ مکہ جائیں، اور اشراف قریش کو اس سفر کے مقصد سے آگاہ کریں، عمر نے کہا قریش مجھ سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، لہٰذا مجھے ان سے خطرہ ہے، بہتر یہ ہے کہ عثمان کو اس کام کے لئے بھیجا جائے، عثمان مکہ کی طرف آئے، تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت عمل کا ارادہ کیا اور ایک درخت کے نیچے جو وہاں پر موجود تھا، اپنے اصحاب سے بیعت لی جو "بیعت رضوان" کے نام سے مشہور ہوئی، اور ان کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ آخری سانس تک ڈٹیں رہیں گے، لیکن تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ عثمان صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور ان کے پیچھے پیچھے قریش نے "سہیل بن عمر" کو مصالحت کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، لیکن تاکید کی کہ اس سال کسی طرح بھی آپ کا مکہ میں ورود ممکن نہیں ہے۔

- بہت زیادہ بحث و گفتگو کے بعد صلح کا عہد و پیمان ہوا، جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ سے باز رہیں اور آئندہ سال مکہ میں آئیں، اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ رہیں، اور مسافرت کے عام ہتھیار کے علاوہ اور کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہ لائیں۔ اور متعدد مواد جن کا دارومدار ان مسلمانوں کی جان و مال کی امنیت پر تھا، جو مدینہ سے مکہ

میں وارد ہوں، اور اسی طرح مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال جنگ نہ کرنے اور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے مذہبی فرائض کی انجام دہی بھی شامل کی گئی تھی۔

یہ پیمان حقیقت میں ہر جہت سے ایک عدم تعرض کا عہد و پیمان تھا جس نے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مسلسل اور بار بار کی جنگوں کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

صلح نامہ کی تحریر

"صلح کے عہد و پیمان کا متن" اس طرح تھا کہ پیغمبر ﷺ نے علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ لکھو: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم": سہیل بن عمرو نے، جو مشرکین کا نمائندہ تھا، کہا: میں اس قسم کے جملہ سے آشنا نہیں ہوں، لہٰذا "بسمک اللھم" لکھو: پیغمبر ﷺ نے فرمایا لکھو: "بسمک اللھم"

اس کے بعد فرمایا: لکھو یہ وہ چیز ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو سے مصالحت کی، سہیل نے کہا: ہم اگر آپ کو رسول اللہ ﷺ سمجھتے تو آپ سے جنگ نہ کرتے، صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھئے، پیغمبر ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھو: "یہ وہ چیز ہے جس پر محمد ﷺ بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے صلح کی، کہ دس سال تک دونوں طرف سے جنگ متروک رہے گی تاکہ لوگوں کو امن و امان کی صورت دوبارہ میسر آئے"۔

علاوہ ازیں جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد ﷺ کے پاس آئے (اور مسلمان ہو جائے) اسے واپس کر دیں اور جو شخص ان افراد میں سے جو محمد ﷺ کے پاس ہیں، قریش کی طرف پلٹ جائے تو ان کو واپس لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

تمام لوگ آزاد ہیں جو چاہے محمد ﷺ کے عہد و پیمان میں داخل ہو اور جو چاہے قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہو، طرفین اس بات کے پابند ہیں کہ ایک دوسرے سے خیانت

نہ کریں، اور ایک دوسرے کی جان و مال کو محترم شمار کریں۔

اس کے علاوہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سال واپس چلے جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں، لیکن آئندہ سال ہم تین دن کے لئے مکہ سے باہر چلے جائیں گے اور ان کے اصحاب آجائیں، لیکن تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں، (اور مراسم عمرہ کے انجام دے کر واپس چلے جائیں) اس شرط کے ساتھ کہ سوائے مسافر کے ہتھیار یعنی تلوار کے، وہ بھی غلاف میں کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔

اس پیمان پر مسلمانوں اور مشرکین کے ایک گروہ نے گواہی دی اور اس عہد نامہ کے کاتب علی علیہ السلام ابن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں کچھ اور امور بھی نقل کئے ہیں، منجملہ ان کے یہ کہ:

''اسلام مکہ میں آشکارا ہوگا اور کسی کو کسی مذہب کے انتخاب کرنے پر مجبور نہیں کریں گے، اور مسلمان کو اذیت و آزار نہیں پہنچائیں گے''۔

اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کے وہ اونٹ جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے، اسی جگہ قربان کردیں اور اپنے سروں کو منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، لیکن یہ بات کچھ مسلمانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوئی، کیونکہ عمرہ کے مناسک کی انجام دہی کے بغیر ان کی نظر میں احرام سے باہر نکل آنا ممکن نہیں تھا، لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذاتی طور پر خود پیش قدمی کی او رقربانی کے اونٹوں کو نحر کیا اور احرام سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ یہ احرام اور قربانی کے قانون میں استثناء ہے جو خدا کی طرف سے قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا تو سر تسلیم خم کردیا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم کامل طور سے مان لیا، اور وہیں سے مدینہ کی راہ لی، لیکن غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ان کے دلوں پر بوجھ ڈال رہا تھا، کیونکہ ظاہر میں یہ سارے کا سارا سفر ایک ناکامی اور شکست تھی، لیکن اسی وقت سورہ فتح نازل ہوئی اور پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فتح کی بشارت ملی۔

صلح حدیبیہ کے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی نتائج

ہجرت کے چھٹے سال (صلح حدیبیہ کے وقت) مسلمانوں کی حالت میں اور دو سال بعد کی حالت میں فرق نمایاں تھا، جب وہ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ فتح مکہ کے لئے چلے تا کہ مشرکین کو پیمان شکنی کا دندان شکن جواب دیا جائے، چنانچہ انھوں نے فوجوں کو معمولی سی جھڑپ کے بغیر ہی مکہ کو فتح کر لیا، اس وقت قریش اپنے اندر مقابلہ کرنے کی معمولی سی قدرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک اجمالی موازنہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ "صلح حدیبیہ" کا عکس العمل کس قدر وسیع تھا۔

خلاصہ کے طور پر مسلمانوں نے اس صلح سے چند امتیاز اور اہم کامیابیاں حاصل کیں، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(1) عملی طور پر مکہ کے فریب خوردہ لوگوں کو یہ بتا دیا کہ وہ جنگ و جدال کا ارادہ نہیں رکھتے، اور مکہ کے مقدس شہر اور خانہ خدا کے لئے بہت زیادہ احترام کے قائل ہیں، یہی بات ایک کثیر جماعت کے دلوں کے لئے اسلام کی طرف کشش کا سبب بن گئی۔

(2) قریش نے پہلی مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کی رسوں کو تسلیم کیا، یہی وہ چیز تھی جو جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت کو ثابت کرنے کی دلیل بنی۔

(3) صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان سکون و اطمنان سے ہر جگہ آ جا سکتے تھے اور انکا جان و مال محفوظ ہو گیا تھا، اور عملی طور پر مشرکین کے ساتھ قریبی تعلق اور میل جول پیدا ہوا، ایسے تعلقات جس کے نتیجہ میں مشرکین کو اسلام سے زیادہ سے زیادہ پہچان کے ساتھ ان کی توجہ اسلام کی طرف مائل ہوئی۔

(4) صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے سارے جزیرۃ العرب میں راستہ کھل گیا، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح طلبی کی شرط نے مختلف اقوام کو، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات او

راسلام کے متعلق غلط نظریہ رکھتے تھے، تجدید نظر پر آمادہ کیا، اور تبلیغاتی نقطۂ نظر سے بہت سے وسیع امکانات و وسائل مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

(5) صلح حدیبیہ نے خیبر کو فتح کرنے اور یہودیوں کے اس سرطانی غدہ کو نکال پھینکنے کے لئے، جو بالفعل اور بالقوہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک اہم خطرہ تھا، راستہ ہموار کر دیا۔

(6) اصولی طور پر پیغمبر ﷺ کی ایک ہزار چار سو افراد کی فوج سے ٹکر لینے سے قریش کی وحشت ہوئی جن کے پاس کسی قسم کے اہم جنگی ہتھیار بھی نہیں تھے، اور شرائط صلح کو قبول کر لینا اسلام کے طرفداروں کے دلوں کی تقویت، اور مخالفین کی شکست کے لئے، جنہوں نے مسلمانوں کو ستایا تھا خود ایک اہم عامل تھا۔

(7) واقعہ حدیبیہ کے بعد پیغمبر ﷺ نے بڑے بڑے ملکوں، ایران و روم و حبشہ کے سربراہوں، اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو متعدد خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور یہ چیز اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صلح حدیبیہ نے مسلمانوں میں کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، کہ نہ صرف جزیرہ عرب میں بلکہ اس زمانہ کی بڑی دنیا میں ان کی راہ کو کھول دیا۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ واقعاً صلح حدیبیہ مسلمانوں کے لئے ایک عظیم فتح اور کامیابی تھی، اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید اسے فتح مبین کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ یا عظیم الشان فتح

جس وقت پیغمبر ﷺ حدیبیہ سے واپس لوٹے (اور سورہ فتح نازل ہوئی) تو ایک صحابی نے عرض کیا: "یہ کیا فتح ہے کہ ہمیں خانہ خدا کی زیارت سے بھی روک دیا ہے اور ہماری

قربانی میں بھی رکاوٹ ڈال دی"؟

• پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تو نے بہت بری بات کہی ہے، بلکہ یہ تو ہماری عظیم ترین فتح ہے کہ مشرکین اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تمہیں خشونت آمیز طریقہ سے نکر لئے بغیر اپنی سرزمین سے دور کریں، اور تمہارے سامنے صلح کی پیش کش کریں اور ان تمام تکالیف اور رنج و غم کے باوجود جو تمہاری طرف سے انھوں نے اٹھائے ہیں، ترک تعرض کے لئے تمہاری طرف مائل ہوئے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تکالیف جو انھوں نے بدر و احزاب میں جھیلی تھیں انہیں یاد دلائیں، تو مسلمانوں نے تصدیق کی کہ یہ سب سے بڑی فتح تھی اور انھوں نے لاعلمی کی بناء پر یہ فیصلہ کیا تھا۔

"زہری" جو ایک مشہور تابعی ہے، کہتا ہے: کوئی بھی فتح صلح حدیبیہ سے زیادہ عظیم نہیں تھی، کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ ارتباط اور تعلق پیدا کیا اور اسلام ان کے دلوں میں جاں گزیں ہوا، اور تین ہی سال کے عرصہ میں ایک عظیم گروہ اسلام لے آیا اور مسلمانوں میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا"۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سچا خواب

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لئے مناسک ادا کرنے کے لئے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور اس خواب کو صحابہ کے سامنے بیان کر دیا، وہ سب کے سب شاد و خوش حال ہوئے لیکن چونکہ ایک جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال پوری ہوگی، تو جس وقت قریش نے مکہ میں ان کے دخیل ہونے کا راستہ حدیبیہ میں ان کے آگے بند کر دیا تو وہ شک و تردید میں

مبتلا ہوگئے، کہ کیا پیغمبر ﷺ کا خواب غلط بھی ہوسکتا ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوں؟ پس اس وعدہ کا کیا ہوا؟ اور وہ رحمانی خواب کہاں چلا گیا؟

پیغمبر اکرم ﷺ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال پورا ہوگا؟ اسی بارے میں مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں وحی الٰہی نازل ہوئی اور تاکید کی کہ یہ خواب سچا تھا اور ایسا مسئلہ حتمی و قطعی اور انجام پانے والا ہے۔

ارشاد خداوند عالم ہوتا ہے: خدا نے اپنے پیغمبر کو جو کچھ دکھلایا تھا وہ سچ اور حق تھا۔ [1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر انتہائی امن و امان کے ساتھ اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوں گے، یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوں گے مسجد الحرام میں داخل ہوں گے اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی"۔ [2]

مومنین کے دلوں پر نزول سکینہ

یہاں گذشتہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اتنی عظیم نعمتیں تھیں جو خدا نے فتح مبین و (صلح حدیبیہ) کے سائے میں پیغمبر اکرم ﷺ کو عطا فرمائی تھیں لیکن یہاں پر اس عظیم نعمت کے بارے میں بحث کی جاری ہے جو اس نے تمام مومنین کو مرحمت فرمائی ہے، فرماتا ہے: "وہی تو ہے، جس نے مومنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل کیا، تا کہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کرے"

اور سکون و اطمینان ان کے دلوں پر نازل کیوں نہ ہو" درآنحالیکہ آسمانوں اور زمین

---

[1] سورہ فتح آیت 27

[2] سورہ فتح آیت 27

کے لشکر خدا کے لئے ہیں اور وہ دانا و حکیم ہے"[1]

یہ سکینہ کیا تھا؟

ضروری ہے کہ ہم پھر "صلح حدیبیہ" کی داستان کی طرف لوٹیں اور اپنے آپ کو "صلح حدیبیہ" کی فضا میں اور اس فضاء میں جو صلح کے بعد پیدا ہوئی، تصور کریں تا کہ آیت کے مفہوم کی گہرائی سے آشنا ہو سکیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا تھا (ایک رویائے الہی و رحمانی) کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہو رہے ہیں اور اس کے بعد خانہ خدا کی زیارت کے عزم کے ساتھ چل پڑے زیادہ تر صحابہ یہی خیال کرتے تھے کہ اس خواب اور رویائے صالحہ کی تعبیر اسی سفر میں واقع ہوگی، حالانکہ مقدر میں ایک دوسری چیز تھی یہ ایک بات۔

دوسری طرف مسلمانوں نے احرام باندھا ہوا تھا، لیکن ان کی توقع کے برخلاف خانہ خدا کی زیارت کی سعادت تک نصیب نہ ہوئی اور پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم دے دیا کہ مقام حدیبیہ میں ہی قربانی کے اونٹوں کو نحر کردیں، کیونکہ ان کے آداب و سنن کا بھی اور اسلامی احکام و دستور کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جب تک مناسک عمرہ کو انجام نہ دے لیں احرام سے باہر نہ نکلیں۔

تیسری طرف حدیبیہ کے صلح نامہ میں کچھ ایسے امور تھے جن کے مطالب کو قبول کرنا بہت ہی دشوار تھا، منجملہ ان کے یہ کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور مدینہ میں پناہ لے لے تو مسلمان اسے اس کے گھر والوں کے سپرد کردیں گے، لیکن اس کے برعکس لازم نہیں تھا۔

چوتھی طرف صلح نامہ کی تحریر کے موقع پر قریش اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ لفظ "رسول

---

[1] سورہ فتح آیت ۴

اللہ" "محمد" کے نام کے ساتھ لکھا جائے، اور قریش کے نمائندہ "سہیل" نے اصرار کر کے اسے حذف کرایا، یہاں تک کہ "بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" کے لکھنے کی بھی موافقت نہ کی، اور وہ یہی اصرار کرتا رہا کہ اس کے بجائے "بسمک اللھم" لکھا جائے، جو اہل مکہ کی عادت اور طریقہ کے مطابق تھا واضح رہے، کہ ان امور میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک نا گوار امر تھا۔

چہ جائیکہ وہ سب کے سب مجموعی طور سے وہاں جاتے رہے، اسی لئے ضعیف الایمان، لوگوں کے دل ڈگمگا گئے، یہاں تک کہ جب سورہ فتح نازل ہوئی تو بعض نے تعجب کے ساتھ پوچھا: کونسی فتح؟

یہی وہ موقع ہے جب نصرت الٰہی کو مسلمانوں کے شامل حال ہونا چاہئے تھا اور سکون واطمینان ان کے دلوں میں داخل ہوتا تھا نہ یہ کہ کوئی فتور اور کمزوری ان میں پیدا ہوتی تھی۔

بلکہ -لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم- کے مصداق کی قوت ایمانی میں اضافہ ہونا چاہئے تھا اوپر والی آیت ایسے حالات میں نازل ہوئی۔

ممکن ہے اس سکون میں اعتقادی پہلو ہو اور وہ اعتقاد میں ڈگمگانے سے بچائے، یا اس میں عملی پہلو ہو اس طرح سے کہ وہ انسان کو ثبات قدم، مقاومت اور صبر وشکیبائی بخشے۔

پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی

گذشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر ﷺ ایک ہزار چار سو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے عمرہ کے ارادہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

پیغمبر ﷺ کی طرف سے بادیہ نشین قبائل میں اعلان ہوا کہ وہ بھی سب کے ساتھ چلیں لیکن ضعیف الایمان لوگوں کے ایک گروہ نے اس حکم سے روگردانی کر لی، اور ان کا تجزیہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان اس سفر سے صحیح وسالم بچ کر نکل آئیں، حالانکہ کفار قریش پہلے ہی

ہیجان واشتعال میں تھے، اور انھوں نے احد واحزاب کی جنگیں مدینہ کے قریب مسلمانوں پر تھوپ دی تھیں اب جبکہ یہ چھوٹا سا گروہ بغیر ہتھیاروں کے اپنے پاؤں سے چل کر مکہ کی طرف جارہا ہے، گویا بھڑوں کے چھتہ کے پاس خود ہی پہنچ رہا ہے، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ آئیں گے؟

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اور قابل ملاحظہ امتیازات کے ہمراہ جو انھوں نے صلح حدیبیہ کے عہد و پیمان سے حاصل کئے تھے، صحیح وسالم مدینہ کی طرف پلٹ آئے ہیں اور کسی کے نکسیر تک بھی نہیں چھوٹی، تو انہوں نے اپنی عظیم غلطی کا احساس کیا اور پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ کسی طرح کی عذرخواہی کر کے اپنے فعل کی توجیہ کریں، اور پیغمبر اکرم ﷺ سے استغفار کا تقاضا کریں۔

لیکن وحی نازل ہوئی اور ان کے اعمال سے پردہ اٹھا دیا اور انہیں رسوا کیا۔

اس طرح سے منافقین اور مشرکین کی سرنوشت کا ذکر کرنے کے بعد، یہاں پیچھے رہ جانے والے ضعیف الایمان لوگوں کی کیفیت کا بیان ہورہا ہے تاکہ اس بحث کی کڑیاں مکمل ہو جائیں۔

فرماتا ہے "عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے عذر تراشی کرتے ہوئے کہیں گے: ہمارے مال ومتاع اور وہاں پر بچوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مائل کر لیا تھا، اور ہم اس پر برکت سفر میں آپ کی خدمت میں نہ رہ سکے، رسالتماب ﷺ ہمارے عذر کو قبول کرتے ہوئے ہمارے لئے طلب بخشش کیجئے، وہ اپنی زبان سے ایسی چیز کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے"۔ [1]

وہ تو اپنی توبہ تک میں بھی مخلص نہیں ہیں۔

---

[1] سورہ فتح آیت 11

لیکن ان سے کہہ دیجئے: ''خدا کے مقابلہ میں اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ وہ تمہارا دفاع کر سکے، اور اگر وہ تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو کس میں طاقت ہے، کہ اسے روک سکے''۔ [1]

خدا کے لئے یہ بات کسی طرح بھی مشکل نہیں ہے، کہ تمہیں تمہارے امن وامان کے گھروں میں، بیوی بچوں اور مال ومنال کے پاس، انواع واقسام کی بلاؤں اور مصائب میں گرفتار کر دے، اور اس کے لئے یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دشمنوں کے مرکز میں اور مخالفین کے گڑھ میں تمہیں ہر قسم کے گزند سے محفوظ رکھے، یہ تمہاری قدرت خدا کے بارے میں جہالت اور بے خبری ہے جو تمہاری نظر میں اس قسم کے افکار کو جگہ دیتی ہے۔

''ہاں، خدا ان تمام اعمال سے جنھیں تم انجام دیتے ہو باخبر اور آگاہ ہے''۔ [2]

بلکہ وہ تو تمہارے سینوں کے اندر کے اسرار اور تمہاری نیتوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ عذر اور بہانے واقعیت اور حقیقت نہیں رکھتے اور جو اصل حقیقت اور واقعیت ہے وہ تمہاری شک وتردید، خوف وخطر اور ضعف ایمان ہے، اور یہ عذر تراشیاں خدا سے مخفی نہیں رہتیں، اور یہ ہرگز تمہاری سزا کو نہیں روکیں گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کے لب ولہجہ سے بھی اور تواریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی الٰہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ کی طرف بازگشت کے دوران نازل ہوئی، یعنی اس سے پہلے کہ پیچھے رہ جانے والے آئیں اور عذر تراشی کریں، ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا گیا اور انہیں رسوا کر دیا۔

قرآن اس کے بعد مزید وضاحت کے لئے مکمل طور پر پردے ہٹا کر مزید کہتا ہے: ''بلکہ تم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف

---

[1] سورہ فتح آیت 11

[2] سورہ فتح آیت 11

پلٹ کر نہیں آئیں گے"۔ [1]

ہاں، اس تاریخی سفر میں تمہارے شریک نہ ہونے کا سبب، اموال اور بیوی بچوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کا اصلی عامل وہ سوء ظن تھا جو تم خدا کے بارے میں رکھتے تھے، اور اپنے غلط اندازوں کی وجہ سے یہ سوچتے تھے کہ یہ سفر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ختم ہونے کا سفر ہے اور کیونکہ شیطانی وسوسے تمہارے دلوں میں زینت پا چکے تھے، اور یہ تم نے برا گمان کیا۔ [2] کیونکہ تم یہ سوچ رہے تھے کہ خدا نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، اس سفر میں بھیج کر انہیں دشمن کے چنگل میں دے دیا ہے، اور ان کی حمایت نہیں کرے گا، "اور انجام کار تم ہلاک ہو گئے"۔ [3] اس سے بدتر ہلاکت اور کیا ہوگی کہ تم اس تاریخی سفر میں شرکت، بیعت رضوان، اور دوسرے افتخارات واعزازات سے محروم رہ گئے، اور اس کے پیچھے عظیم رسوائی تھی اور آئندہ کے لئے آخرت کا دردناک عذاب ہے، ہاں تمہارے دل مردہ تھے اس لئے تم اس قسم کی صورت حال میں گرفتار ہوئے۔

اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی

قرآن اسی طرح سے "حدیبیہ" کے عظیم ماجرے کے کچھ دوسرے پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے، اور اس سلسلہ میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

پہلا یہ کہ یہ خیال نہ کرو کہ سرزمین "حدیبیہ" میں تمہارے اور مشرکین مکہ کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو مشرکین جنگ میں بازی لے جاتے، ایسا نہیں ہے، اگر کفار تمہارے ساتھ وہاں جنگ کرتے تو بہت جلدی پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، اور پھر کوئی ولی و یاور نہ پاتے"۔ [4]

[1] سورہ فتح آیت 11

[2] سورہ فتح آیت 11

[3] سورہ فتح آیت 11

[4] سورہ فتح آیت 22

اور یہ بات صرف تم تک ہی منحصر نہیں ہے، "یہ تو ایک سنت الٰہی ہے، جو پہلے بھی یہی تھی اور تم سنت الٰہی میں ہر گز تغیر و تبدیلی نہ پاؤ گے۔ [1]

وہ اہم نکتہ جو قرآن خاص طور پر بیان کر رہا ہے، یہ ہے کہ کہیں قریش بیٹھ کر یہ نہ کہنے لگیں، کہ افسوس ہم نے جنگ کیوں نہ کی اور اس چھوٹے سے گروہ کی سرکوبی کیوں نہ کی، افسوس کہ شکار ہمارے گھر میں آیا، اور اس سے ہم نے غفلت برتی، افسوس، افسوس۔

ہرگز ایسا نہیں ہے اگرچہ مسلمان ان کی نسبت تھوڑے تھے، اور وطن اور امن کی جگہ سے بھی دور تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اگر جنگ چھڑ جاتی تو پھر بھی قوت ایمانی اور نصرت الٰہی کی برکت سے کامیابی انہیں ہی حاصل ہوتی، کیا جنگ "بدر" اور "احزاب" میں ان کی تعداد بہت کم اور دشمن کا ساز و سامان اور لشکر زیادہ نہ تھا؟ ان دونوں مواقع پر دشمن کو کیسے شکست ہو گئی۔"

بہر حال اس حقیقت کا بیان مومنین کے دل کی تقویت اور دشمن کے دل کی کمزوری اور منافقین کے "اگر" اور "مگر" کے ختم ہونے کا سبب بن گئی اور اس نے اس بات کی نشاندہی کردی کہ ظاہری طور پر حالات کے برابر نہ ہونے کے باوجود اگر جنگ چھڑ جائے تو کامیابی مخلص مومنین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا نکتہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ فرماتا ہے "وہی تو ہے جس نے کفار کے ہاتھ کو مکہ میں تم سے باز رکھا اور تمہارے ہاتھ کو ان سے، یہ اس وقت ہوا جبکہ تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی، اور خدا وہ سب کچھ جو تم انجام دے رہے ہو دیکھ رہا ہے"۔ [2]

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے لئے ایک "شان نزول" بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: مشرکین مکہ نے "حدیبیہ" کے واقعہ میں چالیس افراد کو مسلمانوں پر ضرب لگانے

---

[1] سورہ فتح آیت 22

[2] سورہ فتح آیت 24

کے لئے مخفی طور پر حملہ کے لئے تیار کیا، لیکن ان کی یہ سازش مسلمانوں کی ہوشیاری سے نقش بر آب ہوگئی اور مسلمان ان سب کو گرفتار کرکے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں رہا کردیا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے تاکہ قریش کے نمائندہ کے ساتھ صلح کے معاہدہ کو ترتیب دیں، اور علی علیہ السلام لکھنے میں مصروف تھے، تو جوانان مکہ میں سے 30 افراد اسلحہ کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوئے، اور معجزانہ طور پر ان کی یہ سازش بے کار ہوگئی اور وہ سب کے سب گرفتار ہوگئے اور حضرت نے انہیں آزاد کردیا۔

عمرۃ القضاء

''عمرۃ القضاء'' وہی عمرہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ سے ایک سال بعد یعنی ہجرت کے ساتویں سال کے ماہ ذی القعدہ میں اسے (ٹھیک ایک سال بعد جب مشرکین نے آپ کو مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روکا تھا) اپنے اصحاب کے ساتھ انجام دیا اور اس کا یہ نام اس وجہ سے ہے، چونکہ یہ حقیقت میں گزشتہ سال کی قضاء شمار ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: قرارداد حدیبیہ کی شقوں میں سے ایک شق کے مطابق پروگرام یہ تھا کہ مسلمان آئندہ سال مراسم عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت کو آزادانہ طور پر انجام دیں، لیکن تین دن سے زیادہ مکہ میں توقف نہ کریں اور اس مدت میں قریش کے سردار اور مشرکین کے جانے پہچانے افراد شہر سے باہر چلے جائیں گے تاکہ ایک تو احتمالی ٹکراؤ سے بچ جائیں اور کینہ پروری اور تعصب کی وجہ سے جو لوگ مسلمانوں کی عبادت توحیدی کے منظر کو دیکھنے کا یارا اور قدرت نہیں رکھتے، وہ بھی اسے نہ دیکھیں)

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا

اور قربانی کے اونٹ لے کر چل پڑے اور ''ظہران'' کے قریب پہنچ گئے اس موقع پر پیغمبر نے اپنے ایک صحابی کو جس کا نام ''محمد بن مسلمہ'' تھا، عمدہ سواری کے گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ اپنے آگے بھیج دیا، جب مشرکین نے اس پروگرام کو دیکھا تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور انھوں نے یہ گمان کرلیا کہ حضرت ان سے جنگ کرنا اور اپنی دس سالہ صلح کی قرارداد کو توڑنا چاہتے ہیں، لوگوں نے یہ خبر اہل مکہ تک پہنچادی لیکن جب پیغمبر اکرم ﷺ مکہ کے قریب پہنچے تو آپ نے حکم دیا کہ تمام تیر اور نیزے اور دوسرے سارے ہتھیار اس سرزمین میں جس کا نام ''یاجج'' ہے منتقل کردیں، اور آپ خود اور آپ کے صحابہ صرف نیام میں رکھی ہوئی تلواروں کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے۔ اہل مکہ نے جب یہ عمل دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ وعدہ پورا ہوگیا، (گویا پیغمبر ﷺ کا یہ اقدام مشرکین کے لئے ایک تنبیہ تھا، کہ اگر وہ نقض عہد کرنا چاہیں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کریں، تو ان کے مقابلہ کی قدرت رکھتے ہیں)

رؤسائے مکہ، مکہ سے باہر چلے گئے، تاکہ ان مناظر کو جوان کے لئے دل خراش تھے نہ دیکھیں لیکن باقی اہل مکہ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی راستوں میں، چھتوں کے اوپر، اور خانہ خدا کے اطراف میں جمع ہوگئے تھے، تاکہ مسلمانوں اور ان کے مراسم عمرہ کو دیکھیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ خاص رعب اور دبدبہ کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے اور قربانی کے بہت سے اونٹ آپ کے ساتھ تھے، اور آپ نے انتہائی محبت اور ادب کے ساتھ مکہ والوں سے سلوک کیا، اور یہ حکم دیا کہ مسلمان طواف کرتے وقت تیزی کے ساتھ چلیں، اور احرام کو ذرا سا جسم سے ہٹالیں تاکہ ان کے قوی اور طاقتور اور موٹے تازے شانے آشکار ہوں، اور یہ منظر مکہ کے لوگوں کی روح اور فکر میں، مسلمانوں کی قدرت و طاقت کی زندہ دلیل کے طور پر اثر انداز ہو۔

مجموعی طور سے ''عمرۃ القضاء'' عبادت بھی تھا اور قدرت کی نمائش بھی، یہ کہنا چاہئے کہ ''فتح مکہ'' جو بعد والے سال میں حاصل ہوئی، اس کا بیج انہیں دنوں میں بویا گیا، اور اسلام کے مقابلہ میں اہل مکہ کے سر تسلیم خم کرنے کے سلسلے میں مکمل طور پر زمین ہموار کردی۔ یہ وضع و کیفیت

قریش کے سرداروں کے لئے اس قدر ناگوار تھی کہ تین دن گزرنے کے بعد کسی کو پیغمبر کی خدمت میں بھیجا کہ قرارداد کے مطابق جتنا جلدی ہو سکے مکہ کو چھوڑ دیجئے۔ قابل توجہ بات یہ ہے، کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مکہ کی عورتوں میں سے ایک بیوہ عورت کو، جو قریش کے بعض سرداروں کی رشتہ دار تھی، اپنی زوجیت میں لے لیا، تاکہ عربوں کی رسم کے مطابق، اپنے تعلق اور رشتے کو ان سے مستحکم کر کے ان کی عداوت اور مخالفت میں کمی کریں۔

جس وقت پیغمبر ﷺ نے مکہ سے باہر نکل جانے کی تجویز سنی تو آپ نے فرمایا: میں اس ازدواج کے مراسم کے لئے کھانا کھلانا چاہتا ہوں اور تمہاری بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں، یہ دعوت رسمی طور پر رد کر دی گئی۔

فتح خیبر

جب پیغمبر اکرم ﷺ حدیبیہ سے واپس لوٹے تو تمام ماہ ذی الحجہ اور ہجرت کے ساتویں سال کے محرم کا کچھ حصہ مدینہ میں توقف کیا، اس کے بعد اپنے اصحاب میں سے ان ایک ہزار چار سو افراد کو جنہوں نے حدیبیہ میں شرکت کی تھی ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، (جو اسلام کے برخلاف تحریکوں کا مرکز تھا، اور پیغمبر اکرم ﷺ کسی مناسب فرصت کے لئے گن گن کر دن گزار رہے تھے) کہ اس مرکز فساد کو ختم کریں۔

روایات کے مطابق جس وقت پیغمبر اکرم ﷺ "حدیبیہ" سے پلٹ رہے تھے تو حکم خدا سے آپ نے حدیبیہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو "فتح خیبر" کی بشارت دی، اور تصریح فرمائی کہ اس جنگ میں صرف وہی شرکت کریں گے، اور جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت بھی انہیں کے ساتھ مخصوص ہوگا تخلف کرنے والوں کو ان غنائم میں سے کچھ نہ ملے گا۔

لیکن جونہی ان ڈرپوک دنیا پرستوں نے قرائن سے یہ سمجھ لیا کہ پیغمبر اکرم ﷺ اس

جنگ میں جو انہیں درپیش ہے یقینی طور پر کامیاب ہوں گے اور سپاہ اسلام کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آئے گا، تو وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میدان خیبر میں شرکت کی اجازت چاہی اور شاید اس عذر کو بھی ساتھ لیا کہ ہم گزشتہ غلطی کی تلافی کرنے، اپنی ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کرنے، گناہ سے توبہ کرنے اور اسلام وقرآن کی مخلصانہ خدمت کرنے کے لئے یہ چاہتے ہیں کہ ہم میدان جہاد میں آپ کے ساتھ شرکت کریں، وہ اس بات سے غافل تھے کہ وحی الٰہی پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں اور ان کے راز کو فاش کر چکی تھیں، جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔

''جس وقت تم کچھ غنیمت حاصل کرنے کے لئے چلو گے تو اس وقت پیچھے رہ جانے والے کہیں گے: ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں اور اس جہاد میں شرکت کرنے کا شرف بخشیں''۔[1]

بہرحال قرآن اس منفعت اور فرصت طلب گروہ کے جواب میں کہتا ہے: ''وہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں''۔[2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ''ان سے کہہ دو: تم ہرگز ہمارے پیچھے نہ آنا'' تمہیں اس میدان میں شرکت کرنے کا حق نہیں ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں ''یہ تو وہ بات ہے جو خدا نے پہلے سے ہی کہہ دی ہے''۔[3] اور ہمیں تمہارے مستقبل (کے بارے میں) باخبر کر دیا ہے۔

خدا نے حکم دیا ہے کہ ''غنائم خیبر''، ''اہل حدیبیہ'' کے لئے مخصوص ہیں اور اس چیز میں کوئی بھی ان کے ساتھ شرکت نہ کرے، لیکن یہ بے شرم اور پر ادعا پیچھے رہ جانے والے پھر بھی

---

[1] سورہ فتح آیت 15

[2] سورہ فتح آیت 15

[3] سورہ فتح آیت 15

میدان سے نہیں ہٹتے اور تمہیں حسد کے ساتھ متہم کرتے ہیں، اور عنقریب وہ یہ کہیں گے: کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ تم ہم سے حسد کر رہے ہو۔ [1]

اور اس طرح وہ ضمنی طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب بھی کرتے تھے یہی لوگ "جنگ خیبر" میں انہیں شرکت سے منع کرنے کی اصل حسد کو شمار کرتے ہیں۔

دعائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

"غطفان" کے قبیلہ نے شروع میں تو خیبر کے یہودیوں کی حمایت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد میں ڈر گئے اور اس سے رک گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت "خیبر" کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپ نے اپنے صحابہ کو رکنے کا حکم دیا، اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کیا اور یہ دعا پڑھی:

"خداوندا! اے آسمانوں کے پروردگار اور جن پر انھوں نے سایہ ڈالا ہے، اور اے زمینوں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انھوں نے اٹھا رکھا ہے میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیر ہے اس کا طلب گار ہوں، اور تجھ سے اس کے شر اور اس میں رہنے والوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس شر سے پناہ مانگتا ہوں"۔ اس کے بعد فرمایا: "بسم اللہ" آگے بڑھو: اور اس طرح سے رات کے وقت "خیبر" کے پاس جا پہنچے اور صبح کے وقت جب "اہل خیبر" اس ماجرا سے باخبر ہوئے تو خود کو لشکر اسلام کے محاصرہ میں دیکھا، اس کے بعد پیغمبر نے یکے بعد دیگرے ان قلعوں کو فتح کیا، یہاں تک کہ آخری قلعہ تک، جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھا، اور مشہور یہودی کمانڈر "مرحب" اس میں رہتا تھا، پہنچ گئے۔

انہیں دنوں میں ایک سخت قسم کا دردسر، جو کبھی کبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عارض ہوا کرتا

---

[1] سورہ فتح آیت 15

تھا، آپ کو عارض ہوگیا، اس طرح سے کہ ایک دو دن آپ اپنے خیمہ سے باہر نہ آسکے تو اس موقع پر (مشہور اسلامی تواریخ کے مطابق) حضرت ابوبکر، نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر یہودیوں کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس پلٹ آئے دوسری دفعہ "حضرت عمر" نے علم اٹھایا، اور مسلمان پہلے دن کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے، لیکن بغیر کسی نتیجہ کے واپس پلٹ آئے۔

فاتح خیبر علی علیہ السلام

یہ خبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: "خدا کی قسم کل یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے، اور خدا اور پیغمبر اس کو دوست رکھتے ہیں، اور وہ اس قلعہ کو طاقت کے زور سے فتح کرے گا"۔ ہر طرف سے گردنیں اٹھنے لگیں کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟ کچھ لوگوں کا اندازہ تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد علی علیہ السلام ہیں لیکن علی علیہ السلام ابھی وہاں موجود نہیں تھے، کیونکہ شدید آشوب چشم انہیں لشکر میں حاضر ہونے سے مانع تھا، لیکن صبح کے وقت علی علیہ السلام اونٹ پر سوار ہو کر وارد ہوئے، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمہ کے پاس اترے درحالیکہ آپ کی آنکھیں شدت کے ساتھ درد کر رہی تھیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے نزدیک آؤ، آپ قریب گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دہن مبارک کا لعاب علی علیہ السلام کی آنکھوں پر ملا اور اس معجزہ کی برکت سے آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہوگئیں اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم ان کے ہاتھ میں دیا۔

علی علیہ السلام لشکر اسلام کو ساتھ لے کر خیبر کے سب سے بڑے قلعہ کی طرف بڑھے تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے قلعہ کے اوپر سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: "میں علی بن ابی طالب" ہوں، اس یہودی نے پکار کر کہا: اے یہودیو اب تمہاری شکست کا وقت آن

پہنچا ہے، اس وقت اس قلعہ کا کمانڈر مرحب یہودی، علی علیہ السلام سے مقابلہ کے لئے نکلا، اور کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ہی کاری ضرب سے زمین پر گر پڑا۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان شدید جنگ شروع ہوگئی، علی علیہ السلام قلعہ کے دروازے کے قریب آئے، اور ایک قوی اور پر قدرت حرکت کے ساتھ دروازے کو اکھاڑ اور ایک طرف پھینک دیا، اور اس زور سے قلعہ کھل گیا اور مسلمان اس میں داخل ہوگئے اور اسے فتح کرلیا، یہودیوں نے اطاعت قبول کرلی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ اس اطاعت کے عوض ان کی جان بخشی کی جائے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول کرلیا، منقول غنائم اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے اور وہاں کی زمینیں اور باغات آپ نے یہودیوں کو اس شرط کے ساتھ سپرد کردیے کہ اس کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

آخرکار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تواریخ کی نقل کے مطابق غنائم خیبر صرف اہل حدیبیہ پر تقسیم کئے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے لئے بھی جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی وجہ سے جنگ خیبر میں شریک نہ ہوسکے ان کے لئے بھی ایک حصہ قرار دیا، البتہ ایسا آدمی صرف ایک ہی تھا، اور وہ "جابر بن عبداللہ" تھا۔

فتح مکہ

فتح مکہ نے: تاریخ اسلام میں ایک نئی فصل کا اضافہ کیا ہے اور تقریباً بیس سال کے بعد دشمن کی مقاومتوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا، حقیقت میں فتح مکہ سے جزیرۃ العرب سے شرک و بت پرستی کی بساط لپیٹ دی گئی، اور اسلام دنیا کے دوسرے ممالک کی طرف حرکت کے لئے آمادہ ہوا۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عہد و پیمان اور صلح کے بعد کفار نے عہد شکنی کی اور اس صلح

نامہ کو نظر انداز کر دیا، اور پیغمبر ﷺ کے بعض حلیفوں کے ساتھ زیادتی کی، آپؐ کے حلیفوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے حلیفوں کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا، اور دوسری طرف مکہ میں بت پرستی شرک اور نفاق کا جو مرکز قائم تھا اس کے ختم ہونے کے تمام حالات فراہم ہو گئے تھے اور یہ ایک ایسا کام تھا جسے ہر حالت میں انجام دینا ضروری تھا، اس لئے پیغمبر خدا ﷺ کے حکم سے مکہ کی طرف جانے کے لئے آمادہ ہو گئے، فتح مکہ تین مراحل میں انجام پائی۔

پہلا مرحلہ مقدماتی تھا، یعنی ضروری قوا اور توانائیوں کو فراہم کرنا، زمانہ کے موافق حالات کا انتخاب اور دشمن کی جسمانی و روحانی قوت و توانائی کی مقدار و کیفیت کی حیثیت کے بارے میں کافی اطلاعات حاصل کرنا تھا۔

دوسرا مرحلہ، فتح کے مرحلہ کو بہت ہی ماہرانہ اور ضائعات وحلفات یعنی نقصان کے بغیر انجام دینا تھا۔

اور آخری مرحلہ، جو اصلی مرحلہ تھا، وہ اس کے آثار و نتائج کا مرحلہ تھا۔

یہ مرحلہ انتہائی دقت، باریک بینی اور لطافت کے ساتھ انجام پایا، خصوصاً رسول اللہ ﷺ نے مکہ و مدینہ کی شاہراہ کو اس طرح سے قرق کر لیا تھا کہ اس عظیم آمادگی کی خبر کسی طرح سے بھی اہل مکہ کو نہ پہنچ سکی۔ اس لئے انہوں نے کسی قسم کی تیاری نہ کی، وہ مکمل طور پر غفلت میں پڑے رہے اور اسی وجہ سے اس مقدس سرزمین میں اس عظیم حملہ اور بہت بڑی فتح میں تقریباً کوئی خون نہیں بہا۔

یہاں تک کہ وہ خط بھی، جو ایک ضعیف الایمان مسلمان ''حاطب بن ابی بلتعہ'' نے قریش کو لکھا تھا اور قبیلہ ''مزینہ'' کی ایک عورت ''کنود'' یا ''سارہ'' نامی کے ہاتھ مکہ کی طرف روانہ کیا تھا، اعجاز آمیز طریقہ سے پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے آشکار ہو گیا، علی علیہ السلام کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بڑی تیزی سے اس کے پیچھے روانہ ہوئے، انہوں نے اس عورت کو مکہ و مدینہ کی ایک

درمیانی منزل میں جالیا اور اس سے وہ خط لے کر خود اسے بھی مدینہ واپس لے آئے۔

مکہ کی طرف روانگی

بہر حال پیغمبر اکرم ﷺ مدینہ میں اپنا ایک قائم مقام مقرر کر کے ہجرت کے آٹھویں سال ماہ رمضان کی دس تاریخ کو مکہ کی طرف چل پڑے، اور دس دن کے بعد مکہ پہنچ گئے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے راستے کے وسط میں اپنے چچا عباس کو دیکھا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے آپ کی طرف آرہے ہیں۔ حضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اپنا سامان مدینہ بھیج دیجئے اور خود ہمارے ساتھ چلیں، اور آپ آخری مہاجر ہیں۔

آخر کار مسلمان مکہ کی طرف پہنچ گئے اور شہر کے باہر، اطراف کے بیابانوں میں اس مقام پر جسے "مر الظہر ان" کہا جاتا تھا اور جو مکہ سے چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پڑاؤ ڈال دیا۔ اور رات کے وقت کھانا پکانے کے لئے (یا شاید اپنی وسیع پیمانہ پر موجودگی کو ثابت کرنے کے لئے) وہاں آگ روشن کر دی، اہل مکہ کا ایک گروہ اس منظر کو دیکھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔

ابھی تک پیغمبر اکرم ﷺ اور لشکر اسلام کے اس طرف آنے کی خبریں قریش سے پنہاں تھیں۔

اس رات اہل مکہ کا سرغنہ ابو سفیان اور مشرکین کے بعض دوسرے سرغنہ خبریں معلوم کرنے کے لئے مکہ سے باہر نکلے، اس موقع پر پیغمبر اکرم ﷺ کے چچا عباس نے سوچا کہ اگر رسول اللہ ﷺ قہر آلود طریقہ پر مکہ میں وارد ہوئے تو قریش میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا، انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے اجازت لئے بغیر اور آپ کی سواری پر سوار ہو کر کہا میں جاتا ہوں، شاید کوئی مل جائے تو اس سے کہوں کہ اہل مکہ کو اس ماجرے سے آگاہ کر دے تاکہ وہ

آکر امان حاصل کرلیں۔

عباس وہاں روانہ ہوکر بہت قریب پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس موقع پر انہوں نے "ابو سفیان" کی آواز سنی جو اپنے ایک دوست "بدیل" سے کہہ رہا تھا کہ ہم نے کبھی بھی اس سے زیادہ آگ نہیں دیکھی، "بدیل" نے کہا میرا خیال ہے کہ یہ آگ قبیلہ "خزاعہ" نے جلائی ہوئی ہے، ابوسفیان نے کہا قبیلہ خزاعہ اس سے کہیں زیادہ ذلیل و خوار ہیں کہ وہ اتنی آگ روشن کریں، اس موقع پر عباس نے ابوسفیان کو پکارا، ابوسفیان نے بھی عباس کو پہچان لیا اور کہا سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟

عباس نے جواب دیا: یہ رسول اللہ ﷺ ہیں جو دس ہزار مجاہدین اسلام کے ساتھ تمہاری طرف آرہے ہیں، ابوسفیان سخت پریشان ہوا اور کہا آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں۔

عباس نے کہا: میرے ساتھ آؤ اور رسول اللہ ﷺ سے امان لے لو ورنہ قتل کردیے جاؤ گے۔

اس طرح سے عباس نے "ابوسفیان" کو اپنے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی سواری پر ہی سوار کرلیا اور تیزی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پلٹ آئے۔ وہ جس گروہ اور جس آگ کے قریب سے گزرتے وہ یہی کہتے کہ یہ تو پیغمبر ﷺ کے چچا ہیں جو آنحضرت ﷺ کی سواری پر سوار ہیں، کوئی غیر آدمی نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آئے، جہاں عمر ابن خطاب تھے، جب عمر بن خطاب کی نگاہ ابوسفیان پر پڑی تو کہا خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تجھ (ابوسفیان) پر مسلط کیا ہے، اب تیرے لئے کوئی امان نہیں ہے اور فوراً ہی پیغمبر ﷺ کی خدمت میں آکر آپؐ سے ابوسفیان کی گردن اڑانے کی اجازت مانگی۔

لیکن اتنے میں عباس بھی پہنچ گئے اور کہا: کہ اے رسول خدا ﷺ میں نے اسے پناہ دے دی ہے پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: میں بھی سردست اسے امان دیتا ہوں، کل آپؐ اسے میرے پاس لے آئیں اگلے دن جب عباس اسے پیغمبر ﷺ کی خدمت میں لائے تو رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: "اے ابوسفیان وائے ہو تجھ پر، کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تو خدائے یگانہ پر ایمان لے آئے"۔

اس نے عرض کیا: ہاں اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا یگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اگر بتوں سے کچھ ہو سکتا تو میں یہ دن نہ دیکھتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کیا وہ موقع نہیں آیا کہ تو جان لے کہ میں اللہ کا رسول ہوں"۔

اس نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ابھی اس بارے میں میرے دل میں کچھ شک وشبہ موجود ہے لیکن آخر کار ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں میں سے دو آدمی مسلمان ہو گئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباس سے فرمایا: "ابوسفیان کو اس درہ میں جو مکہ کی گزرگاہ ہے، لے جاؤ تاکہ خدا کا لشکر وہاں سے گزرے اور یہ دیکھ لے"۔

عباس نے عرض کیا: "ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہے، اسکو کوئی امتیازی حیثیت دے دیجئے"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں پناہ لے لے وہ امان میں ہے، جو شخص اپنے گھر کے اندر ہے اور دروازہ بند کر لے وہ بھی امان میں ہے"۔

بہر حال جب ابوسفیان نے اس لشکر عظیم کو دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ مقابلہ کرنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور اس نے عباس کی طرف رخ کر کے کہا: آپ کے بھتیجے کی سلطنت بہت بڑی ہو گئی ہے، عباس نے کہا: وائے ہو تجھ پر یہ سلطنت نہیں نبوت ہے۔

اس کے بعد عباس نے اس سے کہا کہ اب تو تیزی کے ساتھ مکہ والوں کے پاس جا کر

انہیں لشکر اسلام کا مقابلہ کرنے سے ڈرا۔

ابوسفیان: لوگوں کو تسلیم ہونے کی دعوت کرتا ہے

ابوسفیان نے مسجد الحرام میں جا کر پکار کر کہا: ''اے جمعیت قریش محمد ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آیا ہے، تم میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس کے بعد اس نے کہا: جو شخص میرے گھر میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے، جو شخص مسجد الحرام میں چلا جائے وہ بھی امان میں ہے اور جو شخص اپنے گھر میں رہتے ہوئے گھر کا دروازہ بند کرے وہ بھی امان میں ہے''۔

اس کے بعد اس نے چیخ کر کہا: اے جمعیت قریش اسلام قبول کرلو تا کہ سالم رہو اور بچ جاؤ، اس کی بیوی ''ہندہ'' نے اس کی داڑھی پکڑ لی اور چیخ کر کہا: اس بڈھے احمق کو قتل کر دو۔

ابوسفیان نے کہا: میری داڑھی چھوڑ دے۔ خدا کی قسم اگر تو اسلام نہ لائی تو تو بھی قتل ہو جائے گی، جا کر گھر میں بیٹھ جا۔

علی علیہ السلام کے قدم دوش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکر اسلام کے ساتھ روانہ ہوئے اور ''ذی طویٰ'' کے مقام تک پہنچ گئے، وہی بلند مقام جہاں سے مکہ کے مکانات صاف نظر آتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ دن یاد آ گیا جب آپ مجبور ہو کر مخفی طور پر مکہ سے باہر نکلے تھے، لیکن آج دیکھ رہے ہیں کہ اس عظمت کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں، تو آپ نے اپنی پیشانی مبارک اونٹ کے کجاوے کے اوپر رکھ دی اور سجدہ شکر بجالائے، اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''حجون'' میں (مکہ کے بلند مقامات میں سے وہ جگہ جہاں خدیجہ سلام اللہ علیہا کی قبر ہے) اترے، غسل کر کے اسلحہ اور لباس جنگ پہن کر اپنی سواری پر سوار ہوئے، سورہ فتح کی قرائت کرتے ہوئے مسجد الحرام میں داخل ہوئے اور آواز

تکبیر بلند کی، لشکر اسلام نے بھی نعرہ تکبیر بلند کیا تو اس سے سارے دشت و کوہ گونج اٹھے۔ اس کے بعد آپ اپنے اونٹ سے نیچے اترے اور بتوں کو توڑنے کے لئے خانہ کعبہ کے قریب آئے، آپ یکے بعد دیگرے بتوں کو سرنگوں کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

''حق آگیا اور باطل ہٹ گیا، اور باطل ہے ہی ہٹنے والا''۔

کچھ بڑے بڑے بت کعبہ کے اوپر نصب تھے، جن تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا، آپ نے امیر المومنین علی علیہ السلام کو حکم دیا وہ میرے دوش پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ جائیں اور بتوں کو زمین پر گرا کر توڑ ڈالیں، علی علیہ السلام نے آپ کے حکم کی اطاعت کی۔

اس کے بعد آپ نے خانہ کعبہ کی کلید لے کر دروازہ کھولا اور انبیاء کی ان تصویروں کو جو خانہ کعبہ کے اندر در و دیوار پر بنی ہوئی تھیں، محو کر دیا۔ اس سریع اور شاندار کامیابی کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازے کے حلقہ میں ہاتھ ڈالا اور وہاں پر موجود اہل مکہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

''اب بتلاؤ تم کیا کہتے ہو؟ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا''؟ انہوں نے عرض کیا: ہم آپ سے نیکی اور بھلائی کے سوا اور کوئی توقع نہیں رکھتے آپ ہمارے بزرگوار بھائی اور ہمارے بزرگوار بھائی کے فرزند ہیں، آج آپ برسر اقتدار آگئے ہیں، ہیں بخش دیجئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور مکہ کے لوگ بھی بلند آواز کے ساتھ رونے لگے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے بارے میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کی تھی کہ آج تمہارے اوپر کسی قسم کی کوئی سرزنش اور ملامت نہیں ہے، خدا

تمہیں بخش دے گا، وہ ارحم الراحمین ہے"۔[1]

اور اس طرح سے آپ نے ان سب کو معاف کر دیا اور فرمایا: "تم سب آزاد ہو، جہاں چاہو جاسکتے ہو"۔

آج کا دن روز رحمت ہے

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ لشکری کسی سے نہ الجھیں اور بالکل کوئی خون نہ بہایا جائے۔ ایک روایت کے مطابق صرف چھ افراد کو مستثنیٰ کیا گیا جو بہت ہی بدزبان اور خطرناک لوگ تھے۔

یہاں تک کہ جب آپؐ نے یہ سنا کہ لشکر اسلام کے علمدار سعد بن عبادہ نے انتقام کا نعرہ بلند کیا ہے اور وہ یہ کہہ رہا ہے کہ: "آج انتقام کا دن ہے" تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا: "جلدی سے جا کر اس سے علم لے کر یہ نعرہ لگاؤ کہ آج عفو بخشش اور رحمت کا دن ہے"۔

اور اس طرح مکہ کسی خونریزی کے بغیر فتح ہو گیا، عفو و رحمت اسلام کی اس کشش نے، جس کی انہیں بالکل توقع نہیں تھی، دلوں پر ایسا اثر کیا کہ لوگ گروہ در گروہ آ کر مسلمان ہو گئے، اس عظیم فتح کی صدا تمام جزائر عربستان میں جا پہنچی، اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی اور مسلمانوں اور اسلام کی بر جستہ سے دھاک بیٹھ گئی۔

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا:

"خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ یکتا اور یگانہ ہے، اس نے آخر کار اپنے وعدہ کو پورا کر دیا، اور اپنے بندہ کی مدد کی، اور اس نے خود اکیلے ہی تمام گروہوں کو شکست دے دی، ان

---

[1] سورہ یوسف آیت 92

لوگوں کا ہر مال، ہر امتیاز، اور ہر وہ خون جس کا تعلق ماضی اور زمانہ جاہلیت سے ہے، سب کے سب میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہیں"۔ (یعنی زمانہ جاہلیت میں ہوئے خون خرابہ کو بھول جاو، غارت شدہ اموال کی بات نہ کرو اور زمانہ جاہلیت کے تمام امتیازات کوختم کر ڈالو، خلاصہ گذشتہ فائلوں کو بند کردیا جائے۔)

یہ ایک بہت ہی اہم اور عجیب قسم کی پیش نہاد تھی جس میں عمومی معافی کے فرمان سے حجاز کے لوگوں کو ان کے تاریک اور پر ماجرا ماضی سے کاٹ کر رکھ دیا اور انہیں اسلام کے سائے میں ایک نئی زندگی بخشی جو ماضی سے مربوط کشمکشوں اور جنجالوں سے مکمل طور پر خالی تھی۔

اس کام نے اسلام کی پیش رفت کے سلسلہ میں بہت زیادہ مدد کی اور یہ ہمارے آج اور آنے والے کل کے لئے ایک دستور العمل ہے۔

عورتوں کی بیعت کے شرائط

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوہ صفا پر قیام فرمایا اور مردوں سے بیعت لی، بعدہ مکہ کی عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں بیعت کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو وحی الٰہی نازل ہوئی اور ان کی بیعت کی تفصیل بیان کی، روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے پیغمبر جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور ان شرائط پر تجھ سے بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا سے آلودہ نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بہتان نہیں باندھیں گی اور کسی حکم میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے

بخشش طلب کرو، بیشک خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔" [1]

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بیعت لی۔

بیعت کی کیفیت کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی کا ایک برتن لانے کا حکم دیا اور اپنا ہاتھ پانی کے اس برتن میں رکھ دیا، عورتیں اپنے ہاتھ برتن کے دوسری طرف رکھ دیتی تھیں، جب کہ بعض نے کہا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لباس کے اوپر سے بیعت لیتے تھے۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی بیعت کا ماجرا

فتح مکہ کے واقعہ میں جن عورتوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ان میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی "ہندہ" تھی، یعنی وہ عورت جس کی طرف سے تاریخ اسلام بہت سے دردناک واقعات محفوظ رکھے ہوئے ہے، ان میں سے ایک میدان احد میں حمزہ سید الشہداء علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ ہے کہ جس کی کیفیت بہت ہی غم انگیز ہے۔

اگرچہ آخر کار وہ مجبور ہو گئی کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور ظاہراً مسلمان ہو جائے لیکن اسکی بیعت کا ماجرا بتاتا ہے کہ وہ حقیقت میں اپنے سابقہ عقائد کی اسی طرح وفادار تھی، لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بنی امیہ کا خاندان اور ہندہ کی اولاد نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا کہ جن کی سابقہ زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بہرحال مفسرین نے اس طرح لکھا ہے کہ ہندہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا تھا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئی جب آپ کوہ صفا پر تشریف فرما تھے اور

---

[1] سورہ ممتحنہ آیت 12

عورتوں کی ایک جماعت ہندہ کے ساتھ تھی، جب پیغمبر ﷺ نے یہ فرمایا کہ میں تم عورتوں سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دوگی، تو ہندہ نے اعتراض کیا او رکہا: "آپ ہم سے ایسا عہد لے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا"۔ (کیونکہ اس دن مردوں سے صرف ایمان اور جہاد پر بیعت لی گئی تھی)

پیغمبر ﷺ نے اس کی بات کی پرواہ کئے بغیر اپنی گفتگو کو جاری فرمایا: "کہ تم چوری بھی نہیں کروگی"۔

ہندہ نے کہا: ابوسفیان کنجوس اور بخیل آدمی ہے میں نے اس کے مال میں سے کچھ چیزیں لی ہیں، میں نہیں جانتی کہ وہ انہیں مجھ پر حلال کرے گا یا نہیں ابوسفیان موجود تھا، اس نے کہا: جو کچھ تو نے گذشتہ زمانہ میں میرے مال میں سے لے لیا ہے وہ سب میں نے حلال کیا، (لیکن آئندہ کے لئے پابندی کرنا۔)

اس موقع پر پیغمبر ﷺ ہنسے اور ہندہ کو پہچان کر فرمایا: "کیا تو ہندہ ہے"؟ اس نے کہا: "جی ہاں، یارسول اللہ پچھلے امور کو بخش دیجئے خدا آپ کو بخشے"۔

پیغمبر ﷺ نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا: "اور تم زنا سے آلودہ نہیں ہوگی"۔

ہندہ نے تعجب کرتے ہوئے کہا: "کیا آزاد عورت اس قسم کا عمل بھی انجام دیتی ہے؟"

حاضرین میں سے بعض لوگ جو زمانہ جاہلیت میں اس کی حالت سے واقف تھے اس کی اس بات پر ہنس پڑے کیونکہ ہندہ کا سابقہ زمانہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔

پھر پیغمبر ﷺ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "اور تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کروگی"۔

ہندہ نے کہا: "ہم نے تو انہیں بچپن میں پالا پوسا تھا، مگر جب وہ بڑے ہوئے تو آپ نے انہیں قتل کر دیا، اب آپ اور وہ خود بہتر جانتے ہیں"۔ (اس کی مراد اس کا بیٹا "حنظلہ" تھا جو بدر کے دن علی علیہ السلام کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔)

پیغمبر ﷺ نے اس کی اس بات پر تبسم فرمایا، اور جب آپ اس بات پر پہنچے او رفرمایا: ''تم بہتان اور تہمت کو روا نہیں رکھو گی''۔

توہندہ نے کہا: ''بہتان قبیح ہے اور آپ ہمیں صلاح و درستی، نیکی اور مکارم اخلاق کے سوا اور کسی چیز کی دعوت نہیں دیتے''۔

جب آپ نے یہ فرمایا: ''تم تمام اچھے کاموں میں میرے حکم کی اطاعت کرو گی''۔

توہندہ نے کہا: ''ہم یہاں اس لئے نہیں بیٹھے ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کی نافرمانی کا ارادہ ہو''۔

حالانکہ مسلمہ طور پر معاملہ اس طرح نہیں تھا، لیکن تعلیمات اسلامی کے مطابق پیغمبر اس بات کے پابند تھے کہ ان کے بیانات کو قبول کرلیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطوط دنیا کے بادشاہوں کے نام

تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سرزمین حجاز میں اسلام کافی نفوذ کر چکا تو پیغمبر اکرم ﷺ نے اس زمانے کے بڑے بڑے حکمرانوں کے نام کئی خطوط روانہ کیے۔ ان میں بعض خطوط میں ان چیزوں کا سہارا لیا گیا ہے، جس میں آسمانی ادیان کی قدر مشترک کا تذکرہ ہے۔

مقوقس [1] کے نام خط

مقوقس مصر کا حاکم تھا پیغمبر اسلام ﷺ نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور حکام کو خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی، حاطب بن ابی بلتعہ کو حاکم مصر مقوقس کی طرف یہ خط دے کر روانہ کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من: محمد بن عبد اللہ

---

[1] "مقوقس" (بہ ضم میم و بہ فتحہ ہر دو "قاف") "ہرقل" بادشاہ روم کی طرف سے مصر کا والی تھا۔

الی: المقوقس عظیم القبط

سلام علی من اتبع الهدی اما بعد: فانی ادعوك بدعایة الاسلام اسلم تسلم یو تك الله اجرك مرتین. فان تولیت فانما علیکم اثم القبط... یا اهل الکتب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم "ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شیئاً ولا تتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله. فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون"۔

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

از۔۔۔محمد بن عبداللہ

بطرف۔۔۔قبطیوں کے مقوقس بزرگ۔

حق کے پیروکاروں پر سلام ہو۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تاکہ سالم رہو۔ خدا تجھے دوگنا اجر دے گا۔ (ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کر کے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے قانون اسلام سے روگردانی کی تو قبطیوں کے گناہ تیرے ذمہ ہوں گے" اے اہل کتاب ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں حق سے روگردانی نہ کریں تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تم مسلمان ہیں"۔

پیغمبر ﷺ کا سفیر مصر کی طرف روانہ ہوا، اسے اطلاع ملی کہ حاکم مصر اسکندریہ میں ہے لہٰذا وہ اس وقت کے ذرائع آمد ورفت کے ذریعے اسکندریہ پہنچا اور مقوقس کے محل میں گیا، حضرت کا خط اسے دیا، مقوقس نے خط کھول کر پڑھا کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر کہنے لگا: "اگر واقعاً محمد ﷺ خدا کا بھیجا ہوا ہے تو اس کے مخالفین اسے اس کی پیدائش کی جگہ سے باہر نکالنے میں

کیوں کامیاب ہوئے اور وہ مجبور ہوا کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے؟ ان پر نفرین اور بددعا کیوں نہیں کی تاکہ وہ نابود ہو جاتے؟"

پیغمبر ﷺ کے قاصد نے جواباً کہا:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے رسول تھے اور آپ بھی ان کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں، بنی اسرائیل نے جب ان کے قتل کی سازش کی تو آپ نے ان پر نفرین اور بددعا کیوں نہیں کی تاکہ خدا انہیں ہلاک کر دیتا؟"

یہ منطق سن کر مقوقس تحسین کرنے لگا اور کہنے لگا:

"احسنت انت حکیم من عند حکیم"

"آفرین ہے، تم سمجھ دار ہو اور ایک صاحب حکمت کی طرف سے آئے ہو"

حاطب نے پھر گفتگو شروع کی اور کہا: "آپ سے پہلے ایک شخص (یعنی فرعون) اس ملک پر حکومت کرتا تھا، وہ مدتوں لوگوں میں اپنی خدائی کا سودا بیچتا رہا، بالآخر اللہ نے اسے نابود کر دیا تاکہ اس کی زندگی آپ کے لئے باعث عبرت ہو لیکن آپ کوشش کریں کہ آپ کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ بن جائے"۔

"پیغمبر ﷺ نے ہمیں ایک پاکیزہ دین کی طرف دعوت دی ہے، قریش نے ان سے بہت سخت جنگ کی اور ان کے مقابل صف آراء ہوئے، یہودی بھی کینہ پروری سے ان کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے اور اسلام سے زیادہ نزدیک عیسائی ہیں۔"

"مجھے اپنی جان کی قسم جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی بشارت دی تھی اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کے مبشر تھے، آپ لوگوں نے تو ریت کے ماننے والوں کو انجیل کی دعوت دی تھی، جو قوم پیغمبر حق کی دعوت کو سنے اسے چاہئے کہ اس کی پیروی کرے، میں نے محمد کی دعوت آپ کی سرزمین تک پہنچا دی ہے، مناسب یہی ہے کہ

آپ اور مصری قوم یہ دعوت قبول کرلے"۔

حاطب کچھ عرصہ اسکندریہ ہی میں ٹھہرا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کا جواب حاصل کرے، چند روز گزر گئے، ایک دن مقوقس نے حاطب کو اپنے محل میں بلایا اور خواہش کی کہ اسے اسلام کے بارے میں کچھ مزید بتایا جائے۔

حاطب نے کہا: "محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں خدائے یکتا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ لوگ روز و شب میں پانچ مرتبہ اپنے پروردگار سے قریبی رابطہ پیدا کریں اور نماز پڑھیں، پیمان پورے کریں، خون اور مردار کھانے سے اجتناب کریں"۔

علاوہ ازیں حاطب نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی بعض خصوصیات بھی بیان کیں۔

مقوقس کہنے لگا: "یہ تو بڑی اچھی نشانیاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ خاتم النبیین سرزمین شام سے ظہور کریں گے جو انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے، اب مجھ پر واضح ہوا کہ وہ سرزمین حجاز سے مبعوث ہوئے ہیں"۔

اس کے بعد اس نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ وہ عربی زبان میں اس مضمون کا خط تحریر کرے:

بخدمت: محمد بن عبداللہ۔

منجانب: قبطیوں کے بزرگ مقوقس۔

"آپ پر سلام ہو، میں نے آپ کا خط پڑھا، آپ کے مقصد سے باخبر ہوا اور آپ کی دعوت کی حقیقت کو سمجھ لیا، میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہور کرے گا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ خطۂ شام سے مبعوث ہوگا، میں آپ کے قاصد کا احترام کرتا ہوں"۔

پھر خط میں ان ہدیوں اور تحفوں کی طرف اشارہ کیا جو اس نے آپ کی خدمت میں بھیجے، خط اس نے ان الفاظ پر تمام کیا۔

''آپ پر سلام ہو''

تاریخ میں ہے کہ مقوقس نے کوئی گیارہ قسم کے ہدیے پیغمبر ﷺ کے لئے بھیجے، تاریخ اسلام میں ان کی تفصیلات موجود ہیں، ان میں سے ایک طبیب تھا تاکہ وہ بیمار ہونے والے مسلمانوں کا علاج کرے، نبی اکرم ﷺ نے دیگر ہدیے قبول فرمائے لیکن طبیب کو قبول نہ کیا اور فرمایا: ''ہم ایسے لوگ ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے کھانا نہیں کھاتے اور سیر ہونے سے پہلے کھانے سے ہاتھ روک لیتے ہیں، یہی چیز ہماری صحت وسلامتی کے لئے کافی ہے''۔

شاید صحت کے اس عظیم اصول کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ اس طبیب کی وہاں موجودگی کو درست نہ سمجھتے ہوں کیونکہ وہ ایک متعصب عیسائی تھا لہذا آپ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی اور مسلمانوں کی جان کا معاملہ اس کے سپرد کردیں۔

مقوقس نے جو سفیر پیغمبر ﷺ کا احترام کیا، آپ کے لئے ہدیے بھیجے اور خط میں نام محمد اپنے نام سے مقدم رکھا یہ سب اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اس نے آپ کی دعوت کو باطن میں قبول کرلیا تھا یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہوگیا تھا لیکن اس بناء پر کہ اس کی حیثیت اور وقعت کو نقصان نہ پہنچے ظاہری طور پر اس نے اسلام کی طرف اپنی رغبت کا اظہار نہ کیا۔

قیصر روم کے نام خط

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

من: محمد بن عبداللہ

الی: هرقل عظیم الروم

سلام علی من اتبع الھدی

اما بعد: فانی ادعوك بدعایۃ الاسلام۔

اسلم تسلم یو تك الله اجرك مرتین فان تولیت فانما علیکم اثم القبط... یا اهل الکتب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم-ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شیئاً ولا تتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون"۔

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

منجانب: محمد بن عبداللہ۔

بطرف: ہرقل بادشاہ روم۔

"اس پر سلام ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ تا کہ سالم رہو۔ خدا تجھے دوگنا اجر دے گا۔ (ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہاری پیروی کر کے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے قانون اسلام سے روگردانی کی تو اریسوں کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا۔ اے اہل کتاب ہم تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں حق سے روگردانی نہ کریں تو ان سے کہو کہ گواہ رہو ہم تم مسلمان ہیں"۔

قیصر کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لئے "دحیہ کلبی" مامور ہوا سفیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عازم روم ہوا۔

قیصر کے دارالحکومت قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے اسے معلوم ہوا کہ قیصر بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے قسطنطنیہ چھوڑ چکا ہے، لہٰذا اس نے بصری کے گورنر حارث بن ابی شمر سے رابطہ پیدا کیا اور اسے اپنا مقصد سفر بتایا ظاہراً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دحیہ وہ خط حاکم بصری کو دے دے تا کہ وہ اسے قیصر تک پہنچا دے سفیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے

گورنر سے رابطہ کیا تو اس نے عدی بن حاتم کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ دحیہ کے ساتھ بیت المقدس کی طرف جائے اور خط قیصر تک پہنچا دے مقام حمص میں سفیر کی قیصر سے ملاقات ہوئی لیکن ملاقات سے قبل شاہی دربار کے کارکنوں نے کہا:

''تمہیں قیصر کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا ورنہ وہ تمہاری پرواہ نہیں کرے گا''

دحیہ ایک سمجھدار آدمی تھا کہنے لگا:

''میں ان غیر مناسب بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے اتنا سفر کر کے آیا ہوں۔ میں اس مراسلے کے بھیجنے والے کی طرف سے آیا ہوں تا کہ قیصر کو یہ پیغام دوں کہ بشر پرستی کو ختم ہونا چاہئے اور خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہونی چاہیے، اس عقیدے کے باوجود کیسے ممکن ہے کہ میں غیر خدا کے لئے سجدہ کروں''۔

پیغمبرؐ کے قاصد کی قوی منطق سے وہ بہت حیران ہوئے، درباریوں میں سے ایک نے کہا:

''تمہیں چاہئے کہ خط بادشاہ کی مخصوص میز پر رکھ کر چلے جاؤ، اس میز پر رکھے ہوئے خط کو قیصر کے علاوہ کوئی نہیں اٹھا سکتا''۔

دحیہ نے اس کا شکریہ ادا کیا، خط میز پر رکھا اور خود واپس چلا گیا، قیصر نے خط کھولا، خط نے جو ''بسم اللہ'' سے شروع ہوتا تھا اسے متوجہ کیا اور کہنے لگا۔

''حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کے سوا آج تک میں نے ایسا خط نہیں دیکھا''

اس نے اپنے مترجم کو بلایا تا کہ وہ خط پڑھے اور اس کا ترجمہ کرے، بادشاہ روم کو خیال ہوا کہ ہوسکتا ہے خط لکھنے والا وہی نبی ہو جس کا وعدہ انجیل اور توریت میں کیا گیا ہے، وہ اس جستجو میں لگ گیا کہ آپ کی زندگی کی خصوصیات معلوم کرے، اس نے حکم دیا کہ شام کے پورے علاقے میں چھان بین کی جائے، شاید محمد کے رشتہ داروں میں سے کوئی شخص مل جائے جو ان کے حالات سے واقف ہو، اتفاق سے ابوسفیان اور قریش کا ایک گروہ تجارت کے لئے شام آیا ہوا

تھا، شام اس وقت سلطنت روم کا مشرقی حصہ تھا، قیصر کے آدمیوں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بیت المقدس لے گئے، قیصر نے ان سے سوال کیا:

کیا تم میں سے کوئی محمد کا نزدیکی رشتہ دار ہے؟

ابوسفیان نے کہا: میں اور محمد ایک ہی خاندان سے ہیں اور ہم چوتھی پشت میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

پھر قیصر نے اس سے کچھ سوالات کئے دونوں میں یوں گفتگو ہوئی:

قیصر: اس کے بزرگوں میں سے کوئی حکمران ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کیا نبوت کے دعویٰ سے پہلے وہ جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتا تھا؟

ابوسفیان: ہاں محمد راست گو اور سچا انسان ہے۔

قیصر: کونسا طبقہ اس کا مخالف ہے اور کونسا موافق؟

ابوسفیان: اشراف اس کے مخالف ہیں، عام اور متوسط درجے کے لوگ اسے چاہتے ہیں۔

قیصر: اس کے پیروکاروں میں سے کوئی اس کے دین سے پھرا بھی ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کیا اس کے پیروکار روز بروز بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: ہاں۔

اس کے بعد قیصر نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے کہا:

"اگر یہ باتیں سچی ہیں تو پھر یقیناً وہ پیغمبر موعود ہیں، مجھے معلوم تھا کہ ایسے پیغمبر کا ظہور ہوگا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ قریش میں سے ہوگا، میں تیار ہوں کہ اس کے لئے خضوع کروں اور احترام کے طور پر اس کے پاؤں دھوؤں، میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ اس کا دین اور حکومت

سرزمین روم پر غالب آئے گی''۔

پھر قیصر نے دحیہ کو بلایا اور اس سے احترام سے پیش آیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کا جواب لکھا اور آپ کے لئے دحیہ کے ذریعے ہدیہ بھیجا اور آپ کے نام اپنے خط میں آپ سے اپنی عقیدت اور تعلق کا اظہار کیا۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط لے کر قیصر روم کے پاس پہونچا تو اس نے خصوصیت کے ساتھ آپ کے قاصد کے سامنے اظہار ایمان کیا یہاں تک کہ وہ رومیوں کو اس دین توحید و اسلام کی دعوت دینا چاہتا تھا، اس نے سوچا کہ پہلے ان کی آزمائش کی جائے، جب اس کی فوج نے محسوس کیا کہ وہ عیسائیت کو ترک کر دینا چاہتا ہے تو اس نے اس کے قصر کا محاصرہ کر لیا، قیصر نے ان سے فوراً کہا کہ میں تو تمھیں آزمانا چاہتا تھا اپنی جگہ واپس چلے جاؤ۔

جنگ ذات السلاسل

ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ بارہ ہزار سوار سرزمین "یابس" میں جمع ہیں، اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ جب تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کو قتل نہ کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت کو منتشر نہ کردیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کی ایک بہت بڑی جماعت کو بعض صحابہ کی سرکردگی میں ان کی جانب روانہ کیا لیکن وہ کافی گفتگو کے بعد بغیر کسی نتیجہ کے واپس آئے۔

آخر کار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو مہاجرین وانصار کے ایک گروہ کثیر کے ساتھ ان سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا، وہ بڑی تیزی کے ساتھ دشمن کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے اور رات بھر میں سارا سفر طے کرکے صبح دم دشمن کو اپنے محاصرہ میں لے لیا، پہلے تو ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا، جب انہوں نے قبول نہ کیا تو ابھی فضا تاریک ہی تھی کہ ان پر حملہ کردیا اور انہیں درہم برہم کرکے رکھ دیا، ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کرلیا اور بکثرت مال غنیمت کے طور پر حاصل کیا۔

سورہ "والعادیات" نازل ہوئی حالانکہ ابھی سربازان اسلام مدینہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئے تھے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن نماز صبح کے لئے آئے تو اس سورہ کی نماز میں تلاوت کی، نماز کے بعد صحابہ نے عرض کیا، یہ تو ایسا سورہ ہے جسے ہم نے آج تک سنا نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں علی علیہ السلام دشمنوں پر فتح یاب ہوئے ہیں اور جبرائیل نے گزشتہ رات یہ سورہ لا کر مجھے بشارت دی ہے۔ کچھ دن کے بعد علی علیہ السلام غنائم اور قیدیوں کے ساتھ مدینہ میں وارد ہوئے۔ [1]

---

[1] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اس سورہ کے واضح مصادیق میں سے ایک ہے، یہ اس کا شان نزول نہیں ہے۔

جنگ حنین [1]

اس جنگ کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب "ہوازن" جو بہت بڑا قبیلہ تھا اسے فتح مکہ کی خبر ہوئی تو اس کے سردار مالک بن عوف نے افراد قبیلہ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ ممکن ہے فتح مکہ کے بعد محمد ان سے جنگ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، کہنے لگے کہ مصلحت اس میں ہے کہ اس سے قبل کہ وہ ہم سے جنگ کرے ہمیں قدم آگے بڑھانا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع پہونچی تو آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سرزمین ہوازن کی طرف چلنے کو تیار ہو جائیں۔

1 ہجری رمضان المبارک کے آخری دن تھے یا شوال کا مہینہ تھا کہ قبیلہ ہوازن کے افراد سردار "مالک بن عوف" کے پاس جمع ہوئے اور اپنا مال، اولاد اور عورتیں بھی اپنے ساتھ لے آئے تا کہ مسلمانوں سے جنگ کرتے وقت کسی کے دماغ میں بھاگنے کا خیال نہ آئے، اسی طرح سے وہ سرزمین "اوطاس" میں وارد ہوئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے لشکر کا بڑا علم باندھ کر علی علیہ السلام کے ہاتھ میں دیا اور وہ تمام افراد جو فتح مکہ کے موقع پر اسلامی فوج کے کسی دستے کے کمانڈر تھے آنحضرت ﷺ کے حکم سے اسی پرچم کے نیچے حنین کے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ "صفوان بن امیہ" کے پاس ایک بڑی مقدار میں زرہیں ہیں آپ نے کسی کو اس کے پاس بھیجا اور اس سے سو زرہیں عاریتاً طلب کی، صفوان نے پوچھا واقعاً عاریتاً یا غصب کے طور پر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عاریتاً ہیں اور ہم ان کے ضامن ہیں کہ صحیح و سالم واپس کریں گے۔

---

[1] ذیل آیات 25 تا 27 سورہ توبہ

صفوان نے زرہیں عاریتاً پیغمبر اکرم ﷺ کو دے دیں اور خود بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ چلا۔

فوج میں کچھ ایسے افراد تھے جنہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا، ان کے علاوہ دس ہزار وہ مجاہدین اسلام تھے جو پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ فتح مکہ کے لئے آئے تھے، یہ تعداد مجموعاً بارہ ہزار بنتی ہے، یہ سب میدان جنگ کی طرف چل پڑے۔

دشمن کے لشکر کا مورچہ

''مالک بن عوف'' ایک مرد جری اور ہمت وحوصلے والا انسان تھا، اس نے اپنے قبیلے کو حکم دیا کہ اپنی تلواروں کے نیام توڑ ڈالیں اور پہاڑ کی غاروں میں، دروں کے اطراف میں اور درختوں کے درمیان لشکر اسلام کے راستے میں کمین گاہیں بنائیں اور جب اول صبح کی تاریکی میں مسلمان وہاں پہنچیں تو اچانک اور ایک ہی بار ان پر حملہ کر دیں اور اسے فنا کر دیں۔

اس نے مزید کہا: محمد کا ابھی تک جنگجو لوگوں سے سامنا نہیں ہوا کہ وہ شکست کا مزہ چکھتا۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز صبح پڑھ چکے تو آپؐ نے حکم دیا کہ سر زمین حنین کی طرف چل پڑیں، اس موقع پر اچانک لشکر ''ہوازن'' نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی بوچھار کر دی، وہ دستہ جو مقدمہ لشکر میں تھا (اور جس میں مکہ کے نئے نئے مسلمان بھی تھے) بھاگ کھڑا ہوا، اس کے سبب باقی ماندہ لشکر بھی پریشان ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

خداوند متعال نے اس موقع پر دشمن کے ساتھ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور وقتی طور پر ان کی نصرت سے ہاتھ اٹھا لیا کیونکہ مسلمان اپنی کثرت تعداد پر مغرور تھے، لہٰذا ان میں شکست کے آثار آشکار ہوئے، لیکن حضرت علی علیہ السلام جو لشکر اسلام کے علمبردار تھے وہ مٹھی بھر افراد

سمیت دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور اسی طرح جنگ جاری رکھے رہے۔

اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ قلب لشکر میں تھے، رسول اللہ کے چچا عباس بنی ہاشم کے چند افراد کے ساتھ آپؐ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے، یہ کل افراد نو سے زیادہ نہ تھے دسویں ام ایمن کے فرزند ایمن تھے، مقدمہ لشکر کے سپاہی فرار کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرے تو آنحضرت ﷺ نے عباس کو جن کی آواز بلند اور زوردار تھی کو حکم دیا کہ اس ٹیلے پر جو قریب ہے چڑھ جائیں اور مسلمانوں کو پکاریں:

"یا معشر المهاجرين والانصار يا اصحاب سورة البقرة يا اهل بيعت الشجرة الى اين تفرون هذا رسول الله."

اے مہاجرین وانصار اے سورہ بقرہ کے ساتھیو اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو کہاں بھاگے جارہے ہو؟ رسول اللہ ﷺ تو یہاں ہیں۔ مسلمانوں نے جب عباس کی آواز سنی تو پلٹ آئے اور کہنے لگے: لبیک لبیک

خصوصاً لوٹ آنے والوں میں انصار نے پیش قدمی کی اور فوج دشمن پر ہر طرف سے سخت حملہ کیا اور نصرت الٰہی سے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ قبیلہ ہوازن وحشت زدہ ہو کر ہر طرف بکھر گیا، مسلمان ان کا تعاقب کر رہے تھے، لشکر دشمن میں سے تقریباً ایک سو افراد مارے گئے، ان کے اموال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور کچھ ان میں سے قیدی بنا لیے گئے۔

لکھا ہے کہ اس تاریخی واقعہ کے آخر میں قبیلہ ہوازن کے نمائندے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا، پیغمبر اکرم ﷺ نے ان سے بہت محبت و الفت فرمائی، یہاں تک کہ ان کے سربراہ مالک بن عوف نے بھی اسلام قبول کر لیا، آپؐ نے اس کا مال اور قیدی اسے واپس کر دیئے اور اس کے قبیلے کے مسلمانوں کی سرداری بھی اس کے سپرد

کردی۔

درحقیقت ابتداء میں مسلمانوں کی شکست کا اہم عامل غرور وتکبر جو کثرت فوج کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گیا تھا، اسکے علاوہ دو ہزار نئے مسلمانوں کا وجود تھا جن میں سے بعض فطری طور پر منافق تھے، کچھ ان میں مال غنیمت کے حصول کے لئے شامل ہو گئے تھے اور بعض بغیر کسی مقصد کے ان میں شامل ہو گئے تھے۔

نہائی کامیابی کا سبب حضرت رسول اکرم ﷺ، حضرت علی علیہ السلام اور بعض اصحاب کا قیام تھا، اور پہلے والوں کا عہد و پیمان اور خدا پر ایمان اور اس کی مدد پر خاص توجہ باعث بنی کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں کامیابی ملی۔

بھاگنے والے کون تھے؟

اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ میدان حنین میں سے اکثریت ابتداء میں بھاگ گئی تھی، جو باقی رہ گئے تھے ان کی تعداد ایک روایت کے مطابق دس تھی اور بعض نے تو ان کی تعداد چار بیان کی ہے بعض نے زیادہ سے زیادہ سو افراد لکھے ہیں۔

بعض مشہور روایات کے مطابق چونکہ پہلے خلفاء بھی بھاگ جانے والوں میں سے تھے لہٰذا بعض اہل سنت مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس فرار کو ایک فطری چیز کے طور پر پیش کیا جائے۔ المنار کے مؤلف لکھتے ہیں: ''جب دشمن کی طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی سخت بوچھار ہوئی تو جو لوگ مکہ سے مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے، اور جن میں منافقین اور ضعیف الایمان بھی تھے اور جو مال غنیمت کے لئے آ گئے تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور انہوں نے میدان میں پشت دکھائی تو باقی لشکر بھی فطری طور پر مضطرب اور پریشان ہو گیا وہ بھی معمول کے مطابق نہ کہ خوف و ہراس سے، بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر ایک گروہ

فرار ہو جائے تو باقی بھی بے سوچے سمجھے متزلزل ہو جاتے ہیں، لہٰذا ان کا فرار ہونا پیغمبر ﷺ کی مدد ترک کرنے اور انہیں دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ جانے کے طور پر نہیں تھا کہ وہ خدا کے غضب کے مستحق ہوں، ہم اس بات کی تشریح نہیں کرتے اور اس کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں"۔

جنگ تبوک

''تبوک'' [1] کا مقام ان تمام مقامات سے دور تھا جہاں پیغمبر ﷺ نے اپنی جنگوں میں پیش قدمی کی۔ ''تبوک'' اصل میں ایک محکم اور بلند قلعہ کا نام تھا۔ جو حجاز اور شام کی سرحد پر واقع تھا اسی وجہ سے اس علاقے کو سرزمین تبوک کہتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے تیز رفتار نفوذ کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی شہرت اطراف کے تمام ممالک میں گونجنے لگی باوجودیکہ وہ اس وقت حجاز کی اہمیت کے قائل نہیں تھے لیکن طلوع اسلام اور لشکر اسلام کی طاقت کہ جس نے حجاز کو ایک پرچم تلے جمع کر لیا، نے انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش میں ڈال دیا۔

مشرقی روم کی سرحد حجاز سے ملتی تھی اس حکومت کو خیال ہوا کہ کہیں اسلام کی تیز رفتار ترقی کی وہ پہلی قربانی نہ بن جائے لہٰذا اس نے چالیس ہزار کی زبردست مسلح فوج جو اس وقت کی روم جیسی طاقتور حکومت کے شایان شان تھی اکٹھی کی اور اسے حجاز کی سرحد پر لا کھڑا کیا یہ خبر مسافروں کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ کے کانوں تک پہنچی رسول اللہ ﷺ نے روم اور دیگر ہمسایوں کو درس عبرت دینے کے لئے توقف کئے بغیر تیاری کا حکم صادر فرمایا آپ کے منادیوں نے مدینہ اور دوسرے علاقوں تک آپ کا پیغام پہنچایا تھوڑے ہی عرصہ میں تیس ہزار

---

[1] واقعہ جنگ تبوک سورہ توبہ آیت 117 کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

افراد رومیوں سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو گئے ان میں دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادہ تھے۔

موسم بہت گرم تھا، غلے کے گودام خالی تھے اس سال کی فصل ابھی اٹھائی نہیں گئی تھی ان حالات میں سفر کرنا مسلمانوں کے لئے بہت ہی مشکل تھا لیکن چونکہ خدا اور رسول کا فرمان تھا لہٰذا ہر حالت میں سفر کرنا تھا اور مدینہ اور تبوک کے درمیان پر خطر طویل صحرا کو عبور کرنا تھا۔

لشکری مشکلات

اس لشکر کو چونکہ اقتصادی طور پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا راستہ بھی طولانی تھا راستے میں جلانے والی زہریلی ہوائیں چلتی تھیں سنگریزے اڑتے تھے اور جھکڑ چلتے تھے سواریاں بھی کافی نہ تھیں اس لئے یہ "جیش العسرۃ" (یعنی سختیوں والا لشکر) کے نام سے مشہور ہوا۔

تاریخ اسلام نشاندہی کرتی ہے کہ مسلمان کبھی بھی جنگ تبوک کے موقع کی طرح مشکل صورت حال، دباؤ اور زحمت میں مبتلا نہیں ہوئے تھے کیونکہ ایک تو سفر سخت گرمی کے عالم میں تھا دوسرا خشک سالی نے لوگوں کو تنگ اور طول کر رکھا تھا اور تیسرا اس وقت درختوں سے پھل اتارنے کے دن تھے اور اسی پر لوگوں کی سال بھر کی آمدنی کا انحصار تھا۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ مدینہ اور تبوک کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا اور مشرقی روم کی سلطنت کا انہیں سامنا تھا جو اس وقت کی سپر پاور تھی۔

مزید برآں سواریاں اور رسد مسلمانوں کے پاس اتنا کم تھا کہ بعض اوقات دو افراد مجبور ہوتے تھے کہ ایک ہی سواری پر باری باری سفر کریں بعض پیدل چلنے والوں کے پاس جوتا تک نہیں تھا اور وہ مجبور تھے کہ وہ بیابان کی جلانے والی ریت پر پابرہنہ چلیں آب وغذا کی کمی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات خرمہ کا ایک دانہ چند آدمی یکے بعد دیگرے منہ میں رکھ کر چوستے تھے

یہاں تک کہ اس کی صرف گٹھلی رہ جاتی پانی کا ایک گھونٹ بھی چند آدمیوں کو مل کر پینا پڑتا۔

یہ واقعہ نو ہجری یعنی فتح مکہ سے تقریباً ایک سال بعد رونما ہوا۔ مقابلہ چونکہ اس وقت کی ایک عالمی سوپر طاقت سے تھا نہ کہ عرب کے کسی چھوٹے بڑے گروہ سے لہٰذا بعض مسلمان اس جنگ میں شرکت سے خوف زدہ تھے اس صورت حال میں منافقین کے زہریلے پروپیگنڈے اور وسوسوں کے لئے ماحول بالکل سازگار تھا اور وہ بھی مومنین کے دلوں اور جذبات کو کمزور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے تھے۔

پھل اتارنے اور فصل کاٹنے کا موسم تھا جن لوگوں کی زندگی تھوڑی سی کھیتی باڑی اور کچھ جانور پالنے پر بسر ہوتی تھی یہ ان کی قسمت کے اہم دن شمار ہوتے تھے کیونکہ ان کی سال بھر کی گزر بسر انہیں چیزوں سے وابستہ تھیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مسافت کی دوری اور موسم کی گرمی بھی روکنے والے عوامل کی مزید مدد کرتی تھی اس موقع پر آسمانی وحی لوگوں کی مدد کے لئے آ پہنچی اور قرآنی آیات یکے بعد دیگرے نازل ہوئیں اور ان منفی عوامل کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

تشویق، سرزنش، اور دھمکی کی زبان

قرآن جس قدر ہو سکتی ہے اتنی سختی اور شدت سے جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی تشویق کی زبان سے کبھی سرزنش کے لہجے میں اور کبھی دھمکی کی زبان میں ان سے بات کرتا ہے، اور انہیں آمادہ کرنے کے لئے ہر ممکن راستہ اختیار کرتا ہے۔ پہلے کہتا ہے: ''کہ خدا کی راہ میں، میدان جہاد کی طرف حرکت کرو تو تم سستی کا مظاہرہ کرتے ہو اور بوجھل پن دکھاتے ہو''۔ [1]

اس کے بعد ملامت آمیز لہجے میں قرآن کہتا ہے: '' آخرت کی وسیع اور دائمی زندگی کی

[1] سورہ توبہ آیت 38

بجائے اس دنیاوی پست اور ناپائیدار زندگی پر راضی ہو گئے ہو حالانکہ دنیاوی زندگی کے فوائد اور مال و متاع آخرت کی زندگی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور بہت ہی کم ہیں"۔ [1]

ایک عقلمند انسان ایسے گھاٹے کے سودے پر کیسے تیار ہو سکتا ہے اور کیونکہ وہ ایک نہایت گراں بہا متاع اور سرمایہ چھوڑ کر ایک ناچیز اور بے وقعت متاع کی طرف جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ملامت کے بجائے ایک حقیقی تہدید کا انداز اختیار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: "اگر تم میدان جنگ کی طرف حرکت نہیں کرو گے تو خدا دردناک عذاب کے ذریعے تمہیں سزا دے گا"۔ [2]

"اور اگر تم گمان کرتے ہو کہ تمہارے کنارہ کش ہونے اور میدان جہاد سے پشت پھیرنے سے اسلام کی پیش رفت رک جائے گی اور آئینِ الٰہی کی چمک ماند پڑ جائے گی تو تم سخت اشتباہ میں ہو، کیونکہ خدا تمہارے بجائے ایسے صاحبان ایمان کو لے آئے گا جو عزم مصمم رکھتے ہوں گے اور فرمان خدا کے مطیع ہوں گے"۔ [3]

وہ لوگ کہ جو ہر لحاظ سے تم سے مختلف ہیں نہ صرف ان کی شخصیت بلکہ ان کا ایمان، ارادہ، دلیری اور فرماں برداری بھی تم سے مختلف ہے لہٰذا "اس طرح تم خدا اور اس کے پاکیزہ دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے"۔ [4]

تنہا وہ جنگ جس میں حضرت علی علیہ السلام نے شرکت نہ کی

اس لشکر کو چونکہ اقتصادی طور پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا راستہ بھی

---

[1] سورہ توبہ آیت 38

[2] سورہ توبہ آیت 39

[3] سورہ توبہ آیت 39

[4] سورہ توبہ آیت 39

طولانی تھا راستے میں جلانے والی زہریلی ہوائیں چلتی تھیں سنگریزے اڑتے تھے اور جھکڑ چلتے تھے سواریاں بھی کافی نہ تھیں اس لئے یہ "جیش العسرۃ" (یعنی سختیوں والا لشکر) کے نام سے مشہور ہوا اس نے تمام سختیوں کو جھیلا اور ماہ شعبان کی ابتداء میں ہجرت کے نویں سال سرزمین "تبوک" میں پہنچا جب کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ پر مدینہ میں چھوڑ آئے تھے یہ واحد غزوہ ہے جس میں حضرت علی علیہ السلام شریک نہیں ہوئے۔

رسول اللہ کا یہ اقدام بہت ہی مناسب اور ضروری تھا کیونکہ بہت احتمال تھا کہ بعض پیچھے رہنے والے مشرکین یا منافقین جو حیلوں بہانوں سے میدان تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے، رسول اللہ اور ان کی فوج کی طویل غیبت سے فائدہ اٹھائیں اور مدینہ پر حملہ کردیں، عورتوں اور بچوں کو قتل کردیں اور مدینہ کو تاراج کردیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کا مدینہ میں رہ جانا ان کی سازشوں کے مقابلے میں ایک طاقتور رکاوٹ تھی۔

بہرحال جب رسول اللہ ﷺ تبوک میں پہنچے تو وہاں آپ کو رومی فوج کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا عظیم سپاہ اسلام چونکہ کئی جنگوں میں اپنی عجیب وغریب جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرچکی تھی، جب ان کے آنے کی کچھ خبر رومیوں کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے اسی کو بہتر سمجھا کہ اپنے ملک کے اندر چلے جائیں اور اس طرح سے ظاہر کریں کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر روم کی سرحدوں پر جمع ہونے کی خبر ایک بے بنیاد افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی کیونکہ وہ ایک ایسی خطرناک جنگ شروع کرنے سے ڈرتے تھے جس کا جواز بھی ان کے پاس کوئی نہ تھا لیکن لشکر اسلام کے اس طرح سے تیز رفتاری سے میدان تبوک میں پہنچنے نے دشمنان اسلام کو کئی درس سکھائے، مثلاً:

1۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجاہدین اسلام کا جذبہ جہاد اس قدر قوی ہے کہ وہ اس زمانے کی نہایت طاقتور فوج سے بھی نہیں ڈرتے۔

2۔ بہت سے قبائل اور اطراف تبوک کے امراء پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں

آئے اور آپ سے تعرض اور جنگ نہ کرنے کے عہد و پیمان پر دستخط کیے اس طرح مسلمان ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو گئے۔

3۔ اسلام کی لہریں سلطنت روم کی سرحدوں کے اندر تک چلی گئیں اور اس وقت کے ایک اہم واقعہ کے طور پر اس کی آواز ہر جگہ گونجی اور رومیوں کے اسلام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

4۔ یہ راستہ طے کرنے اور زحمتوں کو برداشت کرنے سے آئندہ شام کا علاقہ فتح کرنے کے لئے راہ ہموار ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ آخر کار یہ راستہ طے کرنا ہی ہے۔

یہ عظیم فوائد ایسے تھے کہ جن کے لئے لشکر کشی کی زحمت برداشت کی جا سکتی تھی۔

بہر حال پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی سنت کے مطابق اپنی فوج سے مشورہ کیا کہ کیا پیش قدمی جاری رکھی جائے یا واپس پلٹ جایا جائے؟

اکثریت کی رائے یہ تھی، کہ پلٹ جانا بہتر ہے اور یہی اسلامی اصولوں کی روح سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ اس وقت طاقت فرسا سفر اور راستے کی مشقت و زحمت کے باعث اسلامی فوج کے سپاہی تھکے ہوئے تھے اور ان کی جسمانی قوت مزاحمت کمزور پڑ چکی تھی، رسول اللہ ﷺ نے اس رائے کو صحیح قرار دیا اور لشکر اسلام مدینہ کی طرف لوٹ آیا۔

ایک عظیم درس

''ابو خثیمہ'' [1] اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے تھا، منافقین میں سے نہ تھا لیکن سستی کی وجہ سے پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ میدان تبوک میں نہ گیا۔

اس واقعہ کو دس دن گذر گئے، ہوا گرم اور جلانے والی تھی، ایک دن اپنی بیویوں کے

---

[1] یہ شخص انہیں افراد میں سے تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سورہ توبہ آیت 117 نازل ہوئی۔

پاس آیا انھوں نے ایک سائبان تان رکھا تھا، ٹھنڈا پانی مہیا کر رکھا تھا اور بہترین کھانا تیار کر رکھا تھا، وہ اچانک غم و فکر میں ڈوب گیا اور اپنے پیشوا رسول اللہ ﷺ کی یاد اسے ستانے لگی، اس نے کہا: رسول اللہ ﷺ کہ جنھوں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا اور خدا ان کے گذشتہ اور آئندہ کا ذمہ دار ہے، بیابان کی جلا ڈالنے والی ہواؤں میں کندھے پر ہتھیار اٹھائے اس دشوار گذار سفر کی مشکلات اٹھا رہے ہیں اور ابو خیثمہ کو دیکھو کہ ٹھنڈے سائے میں تیار کھانے اور خوبصورت بیویوں کے پاس بیٹھا ہے، کیا یہ انصاف ہے؟

اس کے بعد اس نے اپنی بیویوں کی طرف رخ کیا اور کہا: خدا کی قسم تم میں سے کسی کے ساتھ میں بات نہ کروں گا اور سائبان کے نیچے نہیں بیٹھوں گا جب تک پیغمبر ﷺ سے نہ جا ملوں۔

یہ بات کہہ کر اس نے زاد راہ لیا، اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور چل کھڑا ہوا، اس کی بیویوں نے بہت چاہا کہ اس سے بات کریں لیکن اس نے ایک لفظ نہ کہا اور اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ تبوک کے قریب جا پہنچا۔

مسلمان ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ کوئی سوار ہے جو سڑک سے گذر رہا ہے، لیکن پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: اے سوار تم ابو خیثمہ ہو تو بہتر ہے۔

جب وہ قریب پہنچا اور لوگوں نے اسے پہچان لیا تو کہنے لگے: جی ہاں! ابو خیثمہ ہے۔

اس نے اپنا اونٹ زمین پر بٹھایا اور پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے حق میں دعا فرمائی۔

اس طرح وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا دل باطل کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن اس کی روحانی آمادگی کی بناء پر خدا نے اسے حق کی طرف متوجہ کیا اور ثبات قدم بھی عطا کیا۔

جنگ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے تین لوگ

مسلمانوں میں سے تین افراد کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور بلال بن امیہ نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی اور انھوں نے پیغمبر خدا ﷺ کے ہمراہ سفر نہ کیا وہ منافقین میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ ایسا انھوں نے سستی اور کاہلی کی بنا پر کیا تھا تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ وہ اپنے کئے پر نادم اور پشیمان ہو گئے۔

جب رسول اللہ ﷺ میدان تبوک سے مدینہ لوٹے تو وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت کی لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ان سے بات چیت نہ کرے وہ ایک عجیب معاشرتی دباؤ کا شکار ہو گئے یہاں تک کہ ان کے چھوٹے بچے اور عورتیں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور اجازت چاہی کہ ان سے الگ ہو جائیں، آپؐ نے انہیں علیحدگی کی اجازت تو نہ دی لیکن حکم دیا کہ ان کے قریب نہ جائیں، مدینہ کی فضا اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی، وہ مجبور ہو گئے کہ اتنی بڑی ذلت اور رسوائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے شہر چھوڑ دیں اور اطراف مدینہ کے پہاڑوں کی چوٹی پر جا کر پناہ لیں۔

جن باتوں نے ان کے جذبات پر شدید ضرب لگائی ان میں سے ایک یہ تھی کہ کعب بن مالک کہتا ہے: میں ایک دن بازار مدینہ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ ایک شامی عیسائی مجھے تلاش کرتا ہوا آیا، جب اس نے مجھے پہچان لیا تو بادشاہ غسان کی طرف سے ایک خط میرے ہاتھ میں دیا، اس میں لکھا تھا کہ اگر تیرے ساتھی نے تجھے دھتکار دیا ہے تو ہماری طرف چلے آؤ، میری حالت منقلب اور غیر ہو گئی، اور میں نے کہا وائے ہو مجھ پر میرا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ دشمن میرے بارے میں لالچ کرنے لگے ہیں، خلاصہ یہ کہ ان کے اعزاء و اقارب ان کے پاس کھانا لے آتے مگر ان سے ایک لفظ بھی نہ کہتے، کچھ مدت اسی صورت میں گزر گئی اور وہ مسلسل

انتظار میں تھے کہ اس کی توبہ قبول ہو اور کوئی آیت نازل ہو جو ان کی توبہ کی دلیل ہے، مگر کوئی خبر نہ تھی۔

اس دوران ان میں سے ایک کے ذہن میں یہ بات آئی اور اس نے دوسروں سے کہا : ب جبکہ لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کر لیا ہے، کیا ہی بہتر ہے کہ ہم بھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیں (یہ ٹھیک ہے کہ ہم گنہ گار ہیں لیکن مناسب ہے کہ دوسرے گنہ گار سے خوش اور راضی نہ ہوں)۔

انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتا تھا، اس طرح پچاس دن انھوں نے توبہ وزاری کی اور آخر کار ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ [1]

مسجد ضرار

کچھ منافقین رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا، ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم قبیلہ "بنی سالم" کے درمیان "مسجد قبا" کے قریب ایک مسجد بنالیں تاکہ ناتواں بیمار اور بوڑھے جو کوئی کام نہیں کر سکتے اس میں نماز پڑھ لیا کریں۔ اسی طرح جن راتوں میں بارش ہوتی ہے ان میں جو لوگ آپ کی مسجد میں نہیں آسکتے اپنے اسلامی فریضہ کو اس میں انجام دے لیا کریں۔ [2]

یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبر خدا ﷺ جنگ تبوک کا عزم کر چکے تھے آنحضرت ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔

انھوں نے مزید کہا: کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود آکر اس میں نماز پڑھیں؟ نبی

---

[1] سورہ توبہ: آیت 118۔ اس سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔

[2] مسجد ضرار کے سلسلے میں سورہ توبہ 107 تا 110 میں بیان ہوا ہے

اکرم ﷺ نے فرمایا: اس وقت تو میں سفر کا ارادہ کر چکا ہوں البتہ واپسی پر خدا نے چاہا تو اس مسجد میں آ کر نماز پڑھوں گا۔

جب آپؐ جنگ تبوک سے لوٹے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے ہماری درخواست ہے کہ آپؐ ہماری مسجد میں آ کر اس میں نماز پڑھائیں اور خدا سے دعا کریں کہ ہمیں برکت دے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی آنحضرت ﷺ مدینہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے تھے اس وقت وحی خدا کا حامل فرشتہ نازل ہوا اور خدا کی طرف سے پیغام لایا اور ان کے کرتوت سے پردہ اٹھایا۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مذکورہ مسجد کو جلا دیا جائے اور اسکے باقی حصے کو مسمار کر دیا جائے اور اس کی جگہ کوڑا کرکٹ ڈالا جایا کرے۔

ان لوگوں کے ظاہراً کام کو دیکھا جائے تو ہمیں شروع میں تو اس حکم پر حیرت ہوئی کہ کیا بیماروں اور بوڑھوں کی سہولت کے لئے اور اضطراری مواقع کے لئے مسجد بنانا برا کام ہے جبکہ یہ ایک دینی اور انسانی خدمت معلوم ہوتی ہے کیا ایسے کام کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا ہے؟ لیکن اگر ہم اس معاملہ کی حقیقت پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ حکم کس قدر برمحل اور بچا تلا تھا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ "ابو عامر" نامی ایک شخص نے عیسائیت قبول کر لی تھی اور راہبوں کے مسلک سے منسلک ہو گیا تھا۔ اس کا شمار عابدوں میں ہوتا تھا، قبیلہ خزرج میں اس کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمان آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو ابو عامر جو خود بھی پیغمبر ﷺ کے ظہور کی خبر دینے والوں میں سے تھا، اس نے دیکھا کہ اس کے اردگرد سے لوگ چھٹ گئے ہیں اس پر وہ اسلام کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، وہ مدینہ سے نکلا اور کفار مکہ کے پاس پہنچا، اس نے ان سے پیغمبر اکرم ﷺ کے خلاف جنگ کے

لئے مدد چاہی اور قبائل عرب کو بھی تعاون کی دعوت دی، وہ خود مسلمانوں کے خلاف جنگ احد کی منصوبہ بندی میں شریک رہا تھا، اور راہنمائی کرنے والوں میں سے تھا، اس نے حکم دیا کہ لشکر کی دو صفوں کے درمیان گڑھے کھود دیئے جائیں۔ اتفاقاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک گڑھے میں گر پڑے، آپ کی پیشانی پر زخم آئے اور دندان مبارک ٹوٹ گئے۔

جنگ احد ختم ہوئی، مسلمانوں کو اس میدان میں آنے والی مشکلات کے باوجود اسلام کی آواز بلند تر ہوئی اور ہر طرف صدائے اسلام گونجنے لگی، تو وہ مدینہ سے بھاگ گیا اور بادشاہ روم ہرقل کے پاس پہنچا تاکہ اس سے مدد چاہے اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر مہیا کرے۔

اس نکتے کا بھی ذکر ضروری ہے کہ اس کی ان کارستانیوں کی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "فاسق" کا لقب دے رکھا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ موت نے اسے مہلت نہ دی کہ وہ اپنی آرزو ہرقل سے کہتا لیکن بعض دوسری کتب میں ہے کہ وہ ہرقل سے جا کر ملا اور اس کے وعدوں سے مطمئن اور خوش ہوا۔

بہرحال اس نے مرنے سے پہلے مدینہ کے منافقین کو ایک خط لکھا اور انہیں خوشخبری دی کہ روم کے ایک لشکر کے ساتھ وہ ان کی مدد کو آئے گا۔ اس نے انہیں خصوصی تاکید کی کہ مدینہ میں وہ اس کے لئے ایک مرکز بنائیں تاکہ اس کی آئندہ کی کارگزاریوں کے لئے وہ کام دے سکے لیکن ایسا مرکز چونکہ مدینہ میں اسلام دشمنوں کی طرف سے اپنے نام پر قائم کرنا عملی طور پر ممکن نہ تھا۔ لہٰذا منافقین نے مناسب یہ سمجھا کہ مسجد کے نام پر بیماروں اور معذوروں کی مدد کی صورت میں اپنے پروگرام کو عملی شکل دیں۔

آخرکار مسجد تعمیر ہوگئی یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے "مجمع بن حارثہ" (یا مجمع بن جاریہ) نامی ایک قرآن فہم نوجوان کو مسجد کی امامت کے لئے بھی چن لیا گیا لیکن وحی الٰہی نے ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا۔

یہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کی طرف جانے سے قبل ان کے خلاف سخت

کاروائی کا حکم نہیں دیا اس کی وجہ شاید ایک تو ان کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے اور دوسرا یہ کہ تبوک کے سفر میں اس طرف سے کوئی اور ذہنی پریشانی نہ ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھی بلکہ بعض مسلمانوں (مالک بن دخشم، معنی بن عدی اور عامر بن سکر یا عاصم بن عدی) کو حکم دیا کہ مسجد کو جلا دیں اور پھر اس کی دیواروں کو مسمار کروا دیا۔ اور آخر کار اسے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ قرار دے دیا۔

مسجد قباء

یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم اس حیات بخش حکم کی مزید تاکید کے لئے خداوند متعال فرماتا ہے کہ اس مسجد میں ہرگز قیام نہ کرو اور اس میں نماز نہ پڑھو۔ [1]

"بلکہ اس مسجد کے بجائے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس مسجد میں عبادت قائم کرو جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے"۔ [2]

نہ یہ کہ یہ مسجد جس کی بنیاد روز اول ہی سے کفر، نفاق، بے دینی اور تفرقہ پر رکھی گئی ہے۔

"مفسرین نے کہا ہے کہ جس مسجد کے بارے میں مندرجہ بالا جملے میں کہا گیا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں نماز پڑھیں اس سے مراد "مسجد قبا" ہے کہ جس کے قریب منافقین نے مسجد ضرار بنائی تھی"۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: "کہ علاوہ اس کے کہ اس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، مردوں کا ایک گروہ اس میں مشغول عبادت ہے جو پسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ

---

[1] سورہ توبہ آیت 108

[2] سورہ توبہ آیت 108

رکھے اور خدا پاکباز لوگوں کو دوست رکھتا ہے"۔ [1]

سب سے پہلی نماز جمعہ

پہلا جمعہ جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑھا وہ اس وقت پڑھا گیا جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپ مدینہ میں وارد ہوئے تو اس دن پیر کا دن بارہ ربیع الاول اور ظہر کا وقت تھا۔ حضرت چار دن تک "قبا" میں رہے اور مسجد قبا کی بنیاد رکھی، پھر جمعہ کے دن مدینہ کی طرف روانہ ہوئے (قباء اور مدینہ کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم ہے اور موجودہ وقت میں قبا مدینہ کا ایک داخلی محلہ ہے)

اور نماز جمعہ کے وقت آپ محلہ "بنی سالم" میں پہنچے وہاں نماز جمعہ ادا فرمائی اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا کیا۔ جمعہ کی نماز میں آپ نے خطبہ بھی پڑھا۔ جو مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا خطبہ تھا۔

واقعہ غدیر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا آخری سال تھا "حجۃ الوداع" کے مراسم جس قدر باوقار و پرشکوہ ہو سکتے تھے اس قدر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی میں اختتام پذیر ہوئے۔ سب کے دل روحانیت سے سرشار تھے ابھی ان کی روح اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس عظیم نعمت سے فیض یاب ہوئے او راس سعادت کے حاصل ہونے پر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے۔

نہ صرف مدینہ کے لوگ اس سفر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے بلکہ جزیرہ نمائے

[1] سورہ توبہ آیت 108

عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان بھی یہ عظیم تاریخی اعزاز و افتخار حاصل کرنے کے لئے آپؐ کے ہمراہ تھے۔

سرزمین حجاز کا سورج دروں اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی مٹھاس تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہی تھی۔ زوال کا وقت نزدیک تھا۔ آہستہ آہستہ "جحفہ" کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلانے والے "غدیر خم" کے بیابان نظر آنے لگے۔

دراصل یہاں پر ایک چوراہا ہے جو حجاز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شمالی راستہ مدینہ کی طرف دوسرا مشرقی راستہ عراق کی طرف، تیسرا مغربی ممالک اور مصر کی طرف اور چوتھا جنوبی راستہ سرزمین یمن کو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر آخری مقصد اور اس عظیم سفر کا اہم ترین کام انجام پذیر ہوتا تھا تا کہ مسلمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم ذمہ داریوں میں سے ان کا آخری حکم جان کر ایک دوسرے سے جدا ہوں۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال۔ آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے کہ اچانک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ان کے ہمراہیوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں نے بلند آواز سے ان لوگوں کو جو قافلے کے آگے چل رہے تھے واپس لوٹنے کے لئے پکارا اور اتنی دیر کے لئے ٹھہر گئے کہ پیچھے آنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔ آفتاب خط نصف النہار سے گزر گیا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذن نے "اللہ اکبر" کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نماز ظہر پڑھنے کی دعوت دی۔ مسلمان جلدی جلدی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن فضاء اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی سر کے اوپر لے لیں، ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعائیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہی تھیں۔

اس صحرا میں کوئی سائبان نظر نہ آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس صرف چند بے برگ و بار بیابانی درخت تھے جو گرمی کا سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کچھ لوگ انہی چند درختوں کا سہارا لئے ہوئے تھے اور انہوں نے ان برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے لئے ایک سائبان سا بنا رکھا تھا لیکن گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزرتی ہوئی سورج کی جلانے والی گرمی کو اس سائبان کے نیچے بھی پھیلا رہی تھی۔ بہر حال ظہر کی نماز پڑھ لی گئی۔

خطبہ غدیر

مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لیں جو انھوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوند تعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لئے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہ ﷺ سے دور تھے وہ پیغمبر ﷺ کا ملکوتی چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے دیکھ نہیں پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا۔ پیغمبر ﷺ اس کے اوپر تشریف لے گئے۔ پہلے پروردگار عالم کی حمد وثنا بجالائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا: میں عنقریب خداوند متعال کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو، تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے لوگوں نے بلند آواز میں کہا:

"ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی وکوشش کی، خدا آپ کو جزائے خیر دے"۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: خداوند گواہ رہنا۔

آپؐ نے مزید فرمایا: اے لوگو کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: دیکھو میں تمہارے درمیان دو گراں مایہ اور گراں قدر چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا: یا رسول اللہ ﷺ وہ دو گراں مایہ چیزیں کونسی ہیں؟

تو پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے۔ اس کا ایک سرا تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت ہیں اور مجھے خدائے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔

ان دونوں سے آگے بڑھنے (اور ان سے تجاوز کرنے) کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جونہی آپؐ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔

اس موقع پر پیغمبر ﷺ کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہو گئی اور آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"ایھا الناس من اولی الناس بالمومنین من انفسھم"

یعنی اے لوگو بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود ان سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟ اس پر سب حاضرین نے بہ یک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر ﷺ بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا: خدا میرا مولا اور رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا اور رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ ان کے ارادے سے مقدم ہے)۔

اس کے بعد فرمایا:

"فمن کنت مولاہ فھذا علی مولاہ"۔

"یعنی جس جس کا میں مولا ہوں علی ؑ بھی اس اس کے مولا اور رہبر ہے"۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبر ﷺ نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:۔

"اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ واحب من احبہ وابغض من ابغضہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق معہ حیث دار۔"

یعنی بار الہا جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر۔ جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رخ کرے۔

اس کے بعد فرمایا:

"تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات

کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اور اس وقت موجود نہیں ہیں"۔

روز اکمال دین

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ ختم ہو گیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا۔

ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرائیل علیہ السلام امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بایں الفاظ بشارت دی:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی"۔ [1]

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا"۔

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمة ورضی الرب برسالتی والولایة لعلی من بعدی"۔

"ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لئے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد کے لئے علی علیہ السلام کی ولایت کے لئے خوش ہوا۔"

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے اعلان سن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا لوگ بڑھ چڑھ کر اس اعزاز و منصب پر حضرت علی علیہ السلام کو اپنی طرف سے مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ معروف شخصیتوں میں سے

---

[1] سورہ مائدہ آیت 3

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انہوں نے کہا:

بخ بخ لك یا ابن ابی طالب اصبحت و امسیت مولائی و مولا کل مومن و مومنة:

"مبارک ہو مبارک ہو اے فرزند ابی طالب کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر ہو گئے"۔

اس وقت ابن عباس نے کہا: بخدا یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں میں باقی رہے گا"۔ [1]

فدک

فدک اطراف مدینہ میں تقریباً ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر خیبر کے نزدیک ایک آباد قصبہ تھا۔ جب سات ہجری میں خیبر کے قلعے یکے بعد دیگر افواج اسلامی نے فتح کر لئے اور یہودیوں کی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو فدک کے رہنے والے یہودی صلح کے خیال سے بارگاہ پیغمبر ﷺ میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی آدھی زمینیں اور باغات آنحضرت ﷺ کے سپرد کر دیئے اور آدھے اپنے پاس رکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے حصہ کی زمینوں کی کاشتکاری بھی اپنے ذمہ لی۔ اپنی کاشتکاری کی زحمت کی اجرت وہ پیغمبر اسلام ﷺ سے وصول کرتے تھے، سورہ حشر کی آیات کے پیش نظر اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ زمینیں پیغمبر اسلام ﷺ کی ملکیت خاص تھیں۔ ان کی آمدنی کو آپؐ اپنے مصرف میں لاتے تھے یا ان مدات میں خرچ کرتے تھے جن کی طرف اس سورہ کی آیت نمبر 7 میں

---

[1] اس سلسلے میں مزید آگہی کے لئے کتاب الغدیر، علامہ امینی، احقاق الحق، قاضی نور اللہ شوشتری، المراجعات شرف الدین اور دلائل الصدق محمد حسین مظفر پر رجوع کریں۔

اشارہ ہوا ہے۔

لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ساری زمینیں اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو عنایت فرمادیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے تصریح کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ منجملہ دیگر مفسرین کے تفسیر درالمنثور میں ابن عباس سے مروی ہے کہ جس وقت آیت **(فات ذاالقربی حقه)**[1] نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا: کتاب کنزالعمال جو مسند احمد کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے، میں صلہ رحم کے عنوان کے ماتحت ابو سعید خدری سے منقول ہے کہ جس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو طلب کیا اور فرمایا:

"یا فاطمة لك فدك۔

''اے فاطمہ علیہا السلام فدک تیری ملکیت ہے''۔

حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی تاریخ میں اس حقیقت کو تحریر کیا ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نہج البلاغہ کی شرح میں داستان فدک تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اسی طرح بہت سے دیگر مورخین نے بھی، لیکن وہ افراد جو اس اقتصادی قوت کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے قبضہ میں رہنے دینا اپنی سیاسی قوت کے لئے مضر سمجھتے تھے، انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے یاور وانصار کو ہر لحاظ سے کمزور اور گوشہ نشین کردیں۔ حدیث مجہول (نحن معاشر الانبیاء ولا نورث) کے بہانے انہوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور باوجودیکہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا قانونی طور پر اس پر متصرف تھیں اور کوئی شخص ''ذوالید'' (جس کے قبضہ میں مال ہو) سے گواہ کا مطالبہ نہیں کرتا، جناب سیدہ سلام اللہ علیہا سے گواہ طلب کیے گئے۔ بی بی نے گواہ پیش کیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں فدک عطا فرمایا ہے

---

[1] سورہ روم آیت 38

لیکن انہوں نے ان تمام چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ بعد میں آنے والے خلفاء میں سے جو کوئی اہلبیت سے محبت کا اظہار کرتا تو وہ فدک انہیں لوٹا دیتا لیکن زیادہ دیر نہ گزرتی کہ دوسرا خلیفہ اسے چھین لیتا اور دوبارہ اس پر قبضہ کر لیتا۔ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس بارہا یہ اقدام کرتے رہے۔

واقعہ فدک اور اس سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع حوادث جو صدر اسلام میں اور بعد کے ادوار میں پیش آئے، زیادہ دردناک اور غم انگیز ہیں اور وہ تاریخ اسلام کا ایک عبرت انگیز حصہ بھی ہیں جو محققانہ طور پر مستقل مطالعہ کا متقاضی ہے تاکہ تاریخ اسلام کے مختلف حوادث نگاہوں کے سامنے آسکیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے نامور محدث مسلم بن حجاج نیشاپوری نے اپنی مشہور و معروف کتاب "صحیح مسلم" میں جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کا خلیفہ اول سے فدک کے مطالبہ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے، اور جناب عائشہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو جب خلیفہ اول نے فدک نہیں دیا تو بی بی ان سے ناراض ہو گئیں اور آخر عمر ان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ [1]

"نحن معاشر الانبیاء لانورث"

اہل سنت کی مختلف کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ایک حدیث موجود ہے جو اس طرح کے مضمون پر مشتمل ہے:

نحن معاشر الانبیاء لانورث ما ترکناہ صدقۃ۔

"ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگ اپنی میراث نہیں چھوڑتے جو ہم سے رہ جائے اسے راہ خدا میں صدقے کے طور پر خرچ کر دیا جائے"۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب جہاد ج 3 ص 1380 حدیث 52

اور بعض کتابوں میں "لانورث" کا جملہ نہیں ہے بلکہ "ما ترکناہ صدقۃ" کی صورت میں نقل کیا گیا ہے۔

اس روایت کی سند عام طور پر ابوبکر تک جا کر ختم ہوجاتی ہے جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد مسلمانوں کی زمام امور اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اور جب حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا یا پیغمبر اکرم ﷺ کی بعض بیویوں نے ان سے پیغمبر ﷺ کی میراث کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اس حدیث کا سہارا لے کر انہیں میراث سے محروم کر دیا۔

اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح (جلد 3 کتاب الجھاد والسیر ص 1379) میں، بخاری نے جزو ہشتم کتاب الفرائض کے صفحہ 185 پر اور اسی طرح بعض دیگر افراد نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سے بخاری میں بی بی عائشہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے: فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور جناب عباس بن عبد المطلب (رسول ﷺ کی وفات کے بعد) ابوبکر کے پاس آئے اور ان سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ اس وقت انھوں نے اپنی فدک کی اراضی اور خیبر سے ملنے والی میراث کا مطالبہ کیا تو ابوبکر نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "ہم میراث میں کوئی چیز نہیں چھوڑتے، جو کچھ ہم سے رہ جائے وہ صدقہ ہوتا ہے"۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے جب یہ سنا تو ناراض ہو کر وہاں سے واپس آ گئیں اور مرتے دم تک ان سے بات نہیں کی۔

البتہ یہ حدیث مختلف لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کے قابل ہے لیکن اس تفسیر میں ہم چند ایک نکات بیان کریں گے:

1۔ یہ حدیث، قرآنی متن کے مخالف ہے اور اس اصول اور کلیہ قاعدہ کی رو سے نا قابل اعتبار ہے کہ جو بھی حدیث کتاب اللہ کے مطابق نہ ہو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور ایسی

حدیث کو پیغمبر اسلام ﷺ یا دیگر معصومین علیھم السلام کا قول سمجھ کر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ہم قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جناب داؤد علیہ السلام کے وارث بنے اور آیت کا ظاہر مطلق ہے کہ جس میں اموال بھی شامل ہیں۔ جناب یحییٰ علیہ السلام اور زکریا علیہ السلام کے بارے میں ہے:

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ

''خداوندا مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے''۔ [1]

حضرت ''زکریا علیہ السلام'' کے بارے میں تو بہت سے مفسرین نے مالی وراثت پر زور دیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ''وراثت'' کی آیات کا ظاہر بھی عمومی ہے کہ جو بلا استثناء سب کے لئے ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے مشہور عالم علامہ قرطبی نے مجبور ہو کر اس حدیث کو غالب اور اکثر فعل کی حیثیت سے قبول کیا ہے نہ کہ عمومی کلیہ کے طور پر اور اس کے لئے یہ مثال دی ہے کہ عرب ایک جملہ کہتے ہیں:

انا معشر العرب اقری الناس للضیف۔

ہم عرب لوگ دوسرے تمام افراد سے بڑھ کر مہمان نواز ہیں (حالانکہ یہ کوئی عمومی حکم نہیں ہے)۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اس حدیث کی اہمیت کی نفی کر رہی ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں اس قسم کا عذر قبول کر لیے تو پھر دوسرے کے لئے بھی یہ قطعی نہیں رہ جاتی۔

---

[1] سورہ مریم آیت 6

2۔مندرجہ بالا روایت ان کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہو کہ ابو بکر نے جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو فدک واپس لوٹانے کا پختہ ارادہ کر کیا تھا لیکن دوسرے لوگ اس میں حائل ہو گئے تھے چنانچہ سیرت حلبی میں ہے:

فاطمہ صلى الله عليه وسلم بنت رسول صلى الله عليه وسلم ،ابو بکر کے پاس اس وقت آئیں جب وہ منبر پر تھے۔انھوں نے کہا:

''اے ابو بکر کیا یہ چیز قرآن میں ہے کہ تمہاری بیٹی تمہاری وراث ہے لیکن میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں''؟

یہ سن کر ابو بکر رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر وہ منبر سے نیچے اترے اور فدک کی واپسی کا پروانہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کو لکھ دیا۔اسی اثناء میں عمر آگئے۔پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ تحریر لکھ دی ہے تا کہ فاطمہ کو ان کے باپ سے ملنے والی وراثت واپس لوٹا دوں عمر نے کہا: اگر آپ یہ کام کریں گے تو پھر دشمنوں کے ساتھ جنگی اخراجات کہاں سے پورے کریں گے؟

جبکہ عربوں نے آپ کے خلاف قیام کیا ہوا ہے۔یہ کہا اور تحریر لے کر اسے پارہ پارہ کر دیا۔[1]

یہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبر اکرم صلى الله عليه وسلم نے تو صریحی طور پر ممانعت کی ہو اور ابو بکر اس کی مخالفت کی جرأت کریں؟ اور پھر عمر نے جنگی اخراجات کا تو سہارا لیا لیکن پیغمبر اکرم صلى الله عليه وسلم کی حدیث پیش نہیں کی۔

مندرجہ بالا روایت پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر پیغمبر اسلام صلى الله عليه وسلم کی طرف سے ممانعت کا سوال نہیں تھا۔بلکہ سیاسی مسائل آڑے تھے اور ایسے

---

[1] سیرہ حلبی ج3 ص361

موقع پر معتزلی عالم ابن ابی الحدید کی گفتگو یاد آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے اپنے استاد "علی بن فارقی" سے پوچھا کہ کیا فاطمہ سلام اللہ علیہا اپنے دعویٰ میں سچی تھیں؟ تو انھوں نے کہا جی ہاں پھر میں نے پوچھا تو ابوبکر انہیں سچا اور برحق بھی سمجھتے تھے۔

اس موقع پر میرے استاد نے معنی خیز تبسم کے ساتھ نہایت ہی لطیف اور پیارا جواب دیا حالانکہ انکی مذاق کی عادت نہیں تھی، انھوں نے کہا: اگر وہ آج انہیں صرف ان کے دعویٰ کی بناء پر ہی فدک دے دیتے تو پھر نہ تو ان کے لئے کسی عذر کی گنجائش باقی رہتی اور نہ ہی ان سے موافقت کا امکان"۔ [1]

3۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے جسے شیعہ اور سنی سب نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، حدیث یہ ہے: "العلماء ورثة الانبیاء"۔ "علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں"۔

نیز یہ قول بھی آنحضرت ﷺ ہی سے منقول ہے:

"ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهماً"۔

"انبیاء اپنی میراث میں نہ تو دینار چھوڑتے ہیں اور نہ ہی درہم"۔

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو یہ بات باور کرائیں کہ انبیاء کے لئے سرمایہ افتخار ان کا علم ہے اور اہم ترین چیز جو وہ یادگار کے طور پر چھوڑ جاتے ہیں ان کا ہدایت وراہنمائی کا پروگرام ہے اور جو لوگ علم و دانش سے زیادہ بہرہ مند ہوں گے وہی انبیاء کے اصلی وارث ہوں گے۔ بجائے اس کے کہ ان کی مال پر نگاہ ہو اور اسے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔ اس کے بعد اس حدیث کے نقل بہ معنی کر دیا گیا اور اس کی غلط تعبیریں کی گئیں اور شاید "ما ترکناه صدقة" والے جملے کا بعض روایات میں اس پر

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد۔ 16 ص 284

اضافہ کر دیا گیا۔

مباہلہ

خداوند عالم نے اپنے پیغمبر ﷺ کو حکم دیا ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو اور جھگڑا کرے تو اسے "مباہلہ" کی دعوت دو اور کہو کہ وہ اپنے بچوں، عورتوں اور نفسوں کو لے آئے اور تم بھی اپنے بچوں کو عورتوں اور نفس کو بلا لو پھر دعا کرو تا کہ خدا جھوٹوں کو رسوا کر دے۔

بغیر کہے یہ بات واضح ہے جب کہ مباہلہ سے مراد یہ نہیں کہ طرفین جمع ہوں، اور ایک دوسرے پر لعنت اور نفرین کریں اور پھر منتشر ہو جائیں کیونکہ یہ عمل تو نتیجہ خیز نہیں ہے۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ دعا اور نفرین عملی طور پر اپنا اثر ظاہر کرے اور جو جھوٹا ہو فوراً عذاب میں گرفتار ہو جائے۔

آیات میں مباہلہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطق واستدلال کے غیر مؤثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لئے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دعا نہ تھی بلکہ اس کا خارجی اثر پیش نظر تھا۔

مباہلہ کا مسئلہ عرب میں کبھی پیش نہیں آیا تھا، اور اس راستہ سے پیغمبر اکرم ﷺ کی صدقت وایمان کو اچھی سرح سمجھا جا سکتا تھا، کیسے ممکن ہے کہ جو شخص کامل ارتباط کے ساتھ خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ ایسے میدان کی طرف آئے اور مخالفین کو دعوت دی کہ آؤ اکھٹے درگاہ خدا میں چلیں، اس سے درخواست کریں اور دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کر دے اور پھر یہ بھی کہے کہ تم عنقریب اس کا نتیجہ خود دیکھ لو گے کہ خدا کس طرح جھوٹوں کو سزا دیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ ایسے میدان کا رخ کرنا بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ اگر دعوت دینے

والے کی دعا قبول نہ ہوئی اور مخالفین کو ملنے والی سزا کا اثر واضح نہ ہوا تو نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے ممکن ہے کہ ایک عقلمند اور سمجھدار انسان نتیجے کے متعلق اطمینان کے بغیر اس مرحلے میں قدم رکھے۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے دعوت مباہلہ اپنے نتائج سے قطع نظر، آپؐ کی دعوت کی صداقت اور ایمان کی دلیل بھی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ "مباہلہ" کی دعوت دی گئی تو نجران کے عیسائیوں کے نمائندے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ سے مہلت چاہی تاکہ اس بارے میں سوچ بچار کرلیں اور اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کرلیں۔ مشورہ کی یہ بات ان کی نفسیاتی حالت کی چغلی کھاتی ہے۔

بہرحال مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کے مابین یہ طے پایا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شور وغل، مجمع اور داد وفریاد کے ساتھ "مباہلہ" کے لئے آئیں تو ڈرا نہ جائے اور مباہلہ کرلیا جائے کیونکہ اگر اس طرح آئیں تو پھر حقیقت کچھ بھی نہیں، جب بھی شور وغل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر وہ بہت محدود افراد کے ساتھ آئیں، بہت قریبی خواص اور چھوٹے بچوں کو لے کر وعدہ گاہ میں پہنچیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور اس صورت میں اس سے "مباہلہ" کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں معاملہ خطرناک ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق عیسائی میدان مباہلہ میں پہنچے تو اچانک دیکھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بیٹے حسین علیہ السلام کو گود میں لئے حسن علیہ السلام کا ہاتھ پکڑے اور علی علیہ السلام اور فاطمہ علیہا السلام کو ہمراہ لئے آ پہنچے ہیں اور انہیں فرما رہے ہیں کہ جب میں دعا کروں، تم آمین کہنا۔

عیسائیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انتہائی پریشان ہوئے اور مباہلہ سے رک گئے اور صلح و مصالحت کے لئے تیار ہو گئے اور اہل ذمہ کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ ہو گئے۔

عظمت اہل بیت علیہم السلام کی ایک زندہ سند

شیعہ اور سنی مفسرین اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آیہ مباہلہ اہل بیت رسول علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن افراد کو اپنے ہمراہ وعدہ گاہ کی طرف لے گئے تھے وہ صرف ان کے بیٹے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام، ان کی بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام تھے۔ اس بناء پر آیت میں "ابناءنا" سے مراد صرف امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام ہیں۔ "نساءنا" سے مراد جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا ہیں اور "انفسنا" سے مراد صرف حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ اہل سنت کے بعض مفسرین نے جو بہت ہی تعداد میں ہیں۔ اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً مولف "المنار" نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے:

"یہ تمام روایات شیعہ طریقوں سے مروی ہیں، ان کا مقصد معین ہے، انہوں نے ان احادیث کی نشر و اشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے۔ جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی اشتباہ ہو گیا ہے"۔

لیکن اہل سنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ نشاندہی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طریقوں کا شیعوں یا ان کی کتابوں سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر اہل سنت کے طریقوں سے مروی ان احادیث کا انکار کیا جائے تو ان کی باقی احادیث اور کتب بھی درجہ اعتبار سے گر جائیں گی۔

اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لئے اہل سنت کے طریقوں سے کچھ روایات ہم یہاں پیش کریں گے۔

قاضی نوراللہ شوستری اپنی کتاب نفیس ”احقاق الحق“ [1] میں لکھتے ہیں: ”مفسرین اس مسئلے میں متفق ہیں کہ ”ابنائنا“ سے اس آیت میں امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام مراد ہیں، ”نسائنا“ سے ”حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا“ اور ”انفسنا“ میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے“۔

اس کے بعد کتاب مذکور کے حاشیے پر تقریباً ساٹھ بزرگان اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ آیت مباہلہ اہل بیت رسول ﷺ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ [2]

1۔ مسلم بن حجاج نیشاپوری، مؤلف صحیح مسلم جو نامور شخصیت ہیں اور ان کی حدیث کی کتاب اہل سنت کی چھ قابل اعتماد صحاح میں سے ہے ملاحظہ ہو مسلم، ج 7 ص 120 طبع مصر زیر اہتمام محمد علی صبیح۔

2۔ احمد بن حنبل نے اپنی ”مسند“ میں لکھا ہے ملاحظہ ہو، ج 2 ص 185 طبع مصر۔

3۔ طبری نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے۔ دیکھئے ج 3 ص 192 طبع میمنیہ مصر۔

4۔ حاکم نے اپنی ”مستدرک“ میں لکھا ہے، دیکھئے ج 3 ص 15 مطبوعہ حیدرآباددکن۔

5۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی، کتاب ”دلائل النبوۃ“ ص 297 مطبوعہ حیدرآباددکن۔

6۔ واحدی نیشاپوری، کتاب ”اسباب النزول“ ص 74 طبع ہند۔

7۔ فخر رازی، نے اپنی مشہور تفسیر کبیر میں لکھا ہے، دیکھئے ج 8 ص 85 طبع بہیہ، مصر۔

8۔ ابن اثیر، ”جامع الاصول“ جلد 9 ص 470 طبع سنۃ المحمدیہ، مصر۔

---

[1] ان کے نام اور ان کی کتاب کی خصوصیات صفحہ 46 سے لیکر صفحہ 76 تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان شخصیتوں میں سے یہ زیادہ مشہور ہیں۔

[2] جلد سوم طبع جدید صفحہ 46

9۔ابن جوزی "تذکرۃ الخواص" صفحہ 17 طبع نجف۔

10۔قاضی بیضاوی، نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، ملاحظہ کریں ج 2 ص 22 طبع مصطفی محمد، مصر۔

11۔آلوسی نے تفسیر "روح المعانی" میں لکھا ہے۔ دیکھئے۔ج 3 ص 167 طبع منیر بمصر۔

12۔معروف مفسر طنطاوی نے اپنی تفسیر "الجواہر" میں لکھا ہے۔ج 2 ص 120 مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر۔

13۔زمخشری نے تفسیر "کشاف" میں لکھا ہے، دیکھئے۔ج 1 ص 193، مطبوعہ مصطفی محمد، مصر۔

14۔حافظ احمد ابن حجر عسقلانی، "الاصابۃ"۔ج 2 ص 503، مطبوعہ مصطفی محمد، مصر۔۔۔

15۔ابن صباغ، "فصول المہمۃ"۔ص 108 مطبوعہ نجف۔

16۔علامہ قرطبی، "الجامع الاحکام القرآن"۔ج 3 ص 104 مطبوعہ مصر 1936۔

"غایۃ المرام" میں صحیح مسلم کے حوالے سے لکھا: "ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے کہا:"

تم ابوتراب (علی علیہ السلام) کو سب وشتم کیوں نہیں کرتے۔وہ کہنے لگا۔

جب سے علی علیہ السلام کے بارے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آتی ہیں، میں نے اس کام سے صرف نظر کرلیا ہے۔ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ علیہا السلام، حسن علیہ السلام، حسین علیہ السلام، اور علی علیہ السلام کو دعوت دی۔اس کے بعد فرمایا **اللهم هولاء اهلى**۔(یعنی خدایا یہ میرے نزدیکی اور خواص ہیں)۔

تفسیر "کشاف" کے مؤلف اہل سنت کے بزرگوں میں سے ہیں۔وہ اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں۔"یہ آیت اہل کساء کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لئے قوی ترین دلیل ہے"۔

شیعہ مفسرین، محدثین اور مورخین بھی سب کے سب اس آیت کے "اھل بیت" کی شان میں نازل ہونے پر متفق ہیں چنانچہ "نور الثقلین" میں اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب "عیون اخبار الرضا" ہے۔ اس میں ایک مجلس مناظرہ کا حال بیان کیا گیا ہے، جو مامون نے اپنے دربار میں منعقد کی تھی۔

اس میں ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے فرمایا:

"خدا نے اپنے پاک بندوں کو آیت مباہلہ میں مشخص کر دیا ہے اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے:

"فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل"

اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر، علی، فاطمہ، حسن، اور حسین علیہم السلام کو اپنے ساتھ مباہلہ کے لئے لے گئے اور یہ ایسی خصوصیت اور اعزاز ہے کہ جس میں کوئی شخص اہل بیت علیہم السلام پر سبقت حاصل نہیں کرسکا اور یہ ایسی منزلت ہے جہاں تک کوئی شخص بھی نہیں پہنچ سکا اور یہ ایسا شرف ہے جسے ان سے پہلے کوئی حاصل نہیں کرسکا"۔

تفسیر "برہان"، "بحارالانوار" اور تفسیر "عیاشی" میں بھی اس مضمون کی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو تمام اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ مندرجہ بالا آیت "اہل بیت" علیہم السلام کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

زینب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی [1]

زمانہ بعثت سے پہلے اور اس کے بعد جب کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کی تو حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے "زید" نامی ایک غلام خریدا، جسے بعد

[1] اکثر مفسرین و مورخین اسلامی کے بقول سورہ احزاب کی آیات 36 تا 38 اس سلسلے میں نازل ہوئی ہیں

میں آنحضرت ﷺ کو ہبہ کردیا۔

آپ نے اسے آزاد کردیا۔ چونکہ اس کے قبیلے نے اسے اپنے سے جدا کردیا تھا، لہٰذا رسول رحمت نے اسے اپنا بیٹا بنالیا تھا، جسے اصطلاح میں "متبنیٰ" کہتے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد زید مخلص مسلمان ہوگیا اور اسلام کے ہراول دستے میں شامل ہوگئے اور اسلام میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا۔ آخر میں جنگ موتہ میں ایک مرتبہ لشکر اسلام کے کمانڈر بھی مقرر ہوئے اور اسی جنگ میں شربت شہادت نوش کیا۔

جب سرکار رسالت ﷺ نے زید کا عقد کرنا چاہا تو اپنی پھوپھی زاد، بہن زینب بنت جحش بنت امیہ بنت عبدالمطلب سے اس کے لئے خواستگاری کی۔ زینب نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ آنحضرت ﷺ اپنے لئے اسے انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ خوش ہوگئی اور رضامندی کا اظہار کردیا، لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا کہ آپ کی یہ خواستگاری تو زید کے لئے تھی تو سخت پریشان ہوئیں اور انکار کردیا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے بھی اس چیز کی سخت مخالفت کی۔

یہی وہ مقام تھا جس کے بارے میں وحی الٰہی نازل ہوئی اور زینب اور عبداللہ جیسے افراد کو تنبیہ کی کہ جس وقت خدا اور اس کا رسول کسی کام کو ضروری سمجھیں تو وہ مخالفت نہیں کرسکتے۔

جب انھوں نے یہ بات سنی تو سر تسلیم خم کردیا۔ (البتہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ یہ شادی کوئی عام شادی نہیں تھی بلکہ یہ زمانہ جاہلیت کی ایک غلط رسم کو توڑنے کے لئے ایک تمہید تھی کیونکہ زمانہ جاہلیت میں کسی باوقار اور مشہور خاندان کی عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی، چاہے وہ غلام کتنا ہی اعلیٰ قدر و قیمت کا مالک کیوں نہ ہوتا۔

لیکن یہ شادی زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی اور طرفین کے درمیان اخلاقی نا اتفاقیوں کی بدولت طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ اگرچہ پیغمبر اسلام ﷺ کا اصرار تھا کہ یہ طلاق واقع نہ ہو لیکن ہو کر رہی۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ نے شادی میں اس ناکامی کی تلافی کے طور پر زینب کو

حکم خدا کے تحت اپنے حبالہ عقد میں لے لیا اور یہ بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

لیکن دوسری باتیں لوگوں کے درمیان چل نکلیں جنہیں قرآن نے مربوط آیات کے ذریعے ختم کر دیا۔ اسکے بعد زید اور اس کی بیوی زینب کی اس مشہور داستان کو بیان کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حساس مسائل میں سے ایک ہے اور ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسئلہ سے مربوط ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ: "اس وقت کو یاد کرو جب اس شخص کو جسے خدا نے نعمت دے رکھی تھی اور ہم نے بھی، اے رسول اسے نعمت دی تھی اور تم کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور خدا سے ڈرو"۔ [1]

نعمت خدا سے مراد وہی ہدایت اور ایمان کی نعمت ہے جو زید بن حارثہ کو نصیب ہوئی تھی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت یہ تھی کہ آپؐ نے اسے آزاد کیا تھا اور اپنے بیٹے کی طرح اسے عزت بخشی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زید اور زینب کے درمیان کوئی جھگڑا ہو گیا تھا اور یہ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ نوبت جدائی اور طلاق تک جا پہنچی۔ اگر آیت میں لفظ "تقول" کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ فعل مضارع ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا بلکہ ہمیشہ اسے نصیحت کرتے اور روکتے تھے۔

کیا زینب کا یہ نزاع زید کی سماجی حیثیت کی بناء پر تھا جو زینب کی معاشرتی حیثیت سے مختلف تھی؟ کیونکہ زینب کا ایک مشہور و معروف قبیلہ سے تعلق تھا اور زید آزاد شدہ تھا۔ یا زید کی اخلاقی سختیوں کی وجہ سے تھا؟ یا ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی بلکہ دونوں میں روحانی او راخلاقی موافقت اور ہم آہنگی نہیں تھی؟ کیونکہ ممکن ہے دو افراد اچھے تو ہوں لیکن فکر و نظر اور سلیقہ

---

[1] سورہ احزاب آیت 37

کے لحاظ سے ان میں اختلاف ہو جس کی بناء پر اپنی ازدواجی زندگی کو آئندہ کے لئے جاری نہ رکھ سکتے ہوں؟

پیغمبر کی نظر میں تھا کہ اگر ان میاں بیوی کے درمیان صلح صفائی نہیں ہو پائی اور نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے تو وہ اپنی پھوپھی زاد بہن زینب کی اس ناکامی کی تلافی اپنے ساتھ نکاح کی صورت میں کردیں گے، اس کے ساتھ آپ کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ لوگ دو وجوہ کی بناء پر آپ پر اعتراض کریں گے اور مخالفین ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کردیں گے۔

اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: "تم اپنے دل میں ایک چیز کو چھپائے ہوئے تھے جسے خدا آشکار کرتا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ تمہارا پروردگار زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرو"۔ [1]

پہلی وجہ تو یہ تھی کہ زید آنحضرت ﷺ کا منہ بولا بیٹا تھا، اور زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق منہ بولے بیٹے کے بھی وہی احکام ہوتے تھے جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے بھی شادی کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔

دوسری یہ کہ رسول اکرم ﷺ کیونکر اس بات پر تیار ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد کریں جبکہ آپ کی شادی بہت بلند و بالا ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ ارادہ حکم خداوندی سے کیا ہوا تھا اور بعد والے حصے میں بھی اس بات کا قرینہ موجود ہے۔

اس بناء پر یہ مسئلہ ایک تو اخلاقی اور انسانی مسئلہ تھا اور دوسرے یہ زمانہ جاہلیت کی غلط رسموں کو توڑنے کا ایک نہایت ہی موثر ذریعہ تھا (یعنی منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے آزاد کردہ غلام کی مطلقہ سے عقد)۔

---

[1] سورہ احزاب آیت 37

مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان مسائل میں نہ تو لوگوں سے ڈرنا چاہئے تھا اور نہ ہی فضا کے مکدر ہونے اور زہریلے پروپیگنڈے سے خوف ووحشت کا شکار ہو جاتے، خاص کر جب یہ احتمال ہو کہ ایک جنجال کھڑا ہو جائے گا اور آپ اور آپ کے مقدس مشن کی ترقی اور اسلام کی پیش رفت کے لئے رکاوٹ کھڑی ہو جائے گی اور یہ بات ضعیف الایمان افراد کو متزلزل کردے گی اور ان کے دل میں شک وشبہات پیدا ہو جائیں گے۔

اس لئے قرآن میں اس سلسلہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

''جس وقت زید نے اپنی حاجت کو پورا کرلیا اور اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تو ہم اسے تمہاری زوجیت میں لے آئے تاکہ منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے مطلقہ ہونے کے بعد مومنین کو ان سے شادی کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو''۔ [1]

یہ کام ایسا تھا جسے انجام پاجانا چاہئے تھا

''اور خدا کا فرمان انجام پاکر رہتا ہے''۔ [2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ہر قسم کے شک وشبہ کو دور کرنے کے لئے پوری صراحت کے ساتھ اس شادی کا اصل مقصد بیان کرتا ہے جو زمانہ جاہلیت کی ایک رسم توڑنے کے لئے تھی یعنی منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ عورتوں سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یہ خود ایک کلی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مختلف عورتوں سے شادی کرنا کوئی عام سی بات نہیں تھی بلکہ اس میں کئی مقاصد کا ذکر کرنا مقصود تھا جو آپ کے مکتب کے مستقبل کے انجام سے تعلق رکھتا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زینب کے ساتھ شادی کی داستان قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کردی ہے اور یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اس کا ہدف منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کے ذریعے دور جاہلیت کی ایک رسم کو توڑنا تھا، اس کے باوجود دشمنان اسلام نے اسے غلط

---

[1] سورہ احزاب آیت 37

[2] سورہ احزاب آیت 37

رنگ دے کر ایک عشقیہ داستان میں تبدیل کر دیا اس طرح سے انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات والا صفات کو آلودہ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے اور اس بارے میں مشکوک اور جعلی احادیث کا سہارا لیا ہے ان داستانوں میں ایک یہ بھی ہے کہ جس وقت رسول اکرم ﷺ زید کی احوال پرسی کے لئے اس کے گھر گئے اور جونہی آپ نے دروازہ کھولا تو آپ کی نظر زینب کے حسن و جمال پر جا پڑی تو آپ نے فرمایا:

"سبحان الله خالق النور تبارك الله احسن الخالقين"

''منزہ ہے وہ خدا جو نور کا خالق ہے اور جاوید و بابرکت ہے وہ اللہ جو احسن الخالقین ہے''۔

ان لوگوں نے اس جملے کو زینب کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے لگاؤ کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ، عصمت و نبوت کے مسئلہ سے قطع نظر بھی اس قسم کے افسانوں کی تکذیب کے لئے واضح شواہد ہمارے پاس موجود ہیں:

پہلا یہ کہ حضرت زینب، رسول پاک کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور خاندانی ماحول میں تقریباً آپ کے سامنے پلی بڑھی تھیں اور آپ ہی نے زید کے لئے ان کی خواستگاری کی تھی اگر زینب حد سے زیادہ حسین تھیں اور بالفرض اس کے حسن و جمال نے پیغمبر اکرم ﷺ کی توجہ کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا تو نہ تو اس کا حسن و جمال ڈھکا چھپا تھا اور نہ ہی اس ماجرے سے پہلے ان کے ساتھ آنحضرت کا عقد کرنا کوئی مشکل امر تھا بلکہ اگر دیکھا جائے تو زینب کو زید کے ساتھ شادی کرنے سے دلچسپی نہ تھی، بلکہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مخالفت کا اظہار صراحت کے ساتھ بھی کر دیا تھا اور وہ اس بات کو کاملاً ترجیح دیتی تھیں کہ زید کی بجائے رسول اللہ کی بیوی بنیں، کیونکہ جب آنحضرت ﷺ زید کے لئے زینب سے رشتہ دینے آئے تو وہ نہایت خوش ہو گئیں، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ آپ ان سے اپنے لئے خواستگاری کی غرض سے تشریف لائے ہیں، لیکن بعد میں

وحی الٰہی کے نزول اور خدا و پیغمبر ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے زید کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو گئیں تو ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تو ہم کی کونسی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہیں آپ زینب کے حالات سے بے خبر تھے؟ یا آپ ان سے شادی کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اقدام نہیں کر سکتے تھے؟

دوسرا یہ کہ جب زید نے اپنی بیوی زینب کو طلاق دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کیا تو آپ نے بار بار اسے نصیحت کی اور طلاق دینے کے لئے روکا اور یہ چیز بجائے خود ان افسانوں کی نفی کا ایک اور شاہد ہے۔

پھر یہ کہ خود قرآن صراحت کے ساتھ اس شادی کا مقصد بیان کرتا ہے تاکہ کسی قسم کی دوسری باتوں کی گنجائش باقی نہ رہے۔

چوتھا امر یہ ہے کہ قرآنی آیت میں خداوند عالم اپنے پیغمبر ﷺ سے فرماتا ہے کہ زید کی مطلقہ بیوی کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی خاص بات تھی جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ لوگوں سے ڈرتے تھے، جبکہ انہیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہئے۔

خوف خدا کا مسئلہ واضح کرتا ہے کہ یہ شادی ایک فرض کی بجا آوری کے طور پر انجام پائی تھی کہ خدا کی ذات کے لئے شخصی معاملات کو ایک طرف رکھ دینا چاہئے تاکہ ایک خدائی مقدس ہدف پورا ہو جائے، اگرچہ اس سلسلے میں کوردل دشمنوں کی زبان کے زخم اور منافقین کی افسانہ طرازی کا پیغمبر کی ذات پر الزام ہی کیوں نہ آتا ہو پیغمبر اکرم ﷺ نے حکم خدا کی اطاعت اور غلط رسم کو توڑنے کی پاداش میں یہ ایک بہت بڑی قیمت ادا کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔

لیکن سچے رہبروں کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں، جن میں انہیں ایثار اور فداکاری کا ثبوت دینا پڑتا ہے، اور وہ اس قسم کے لوگوں کے اتہامات اور الزامات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں تاکہ اس طرح سے وہ اپنے اصل مقصد تک پہنچ جائیں

البتہ اگر پیغمبر گرامی قدر نے زینب کو بالکل ہی نہ دیکھا ہوتا اور نہ ہی پہچانتا ہوتا اور زینب

نے بھی آپ کے ساتھ ازدواج کے بارے میں رغبت کا اظہار نہ کیا ہوتا اور زید بھی انہیں طلاق دینے پر تیار نہ ہوتے (نبوت وعصمت کے مسئلہ سے ہٹ کر) پھر تو اس قسم کی گفتگو اور توہمات کی گنجائش ہوتی، لیکن پیغمبر ﷺ کی تو وہ دیکھی دکھائی تھیں لہٰذا ان تمام امکانات کی نفی کے ساتھ ان افسانوں کا جعلی اور من گھڑت ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا کوئی لمحہ یہ نہیں بتاتا کہ آپ کو زینب سے کوئی خاص لگاؤ اور رغبت ہو، بلکہ دوسری بیویوں کی نسبت ان سے کوئی رغبت رکھتے تھے اور ان افسانوں کی نفی پر یہ ایک اور دلیل ہے۔

ثعلبہ

''ثعلبہ بن حاطب انصاری'' ایک غریب آدمی تھا، روزانہ مسجد میں آیا کرتا تھا اس کا اصرار تھا کہ رسول اکرم ﷺ دعا فرمائیں کہ خدا اس کو مالا مال کر دے۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا:

''مال کی تھوڑی مقدار جس کا تو شکر ادا کر سکے مال کی کثرت سے بہتر ہے جس کا تو شکر ادا نہ کر سکے''۔

کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو خدا کے پیغمبر ﷺ کی پیروی کرے اور سادہ زندگی بسر کرے۔

لیکن ثعلبہ مطالبہ کرتا رہا اور آخر کار اس نے پیغمبر اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ میں آپؐ کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر خدا نے مجھے دولت عطا فرمائی تو میں اس کے تمام حقوق ادا کروں گا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے لئے دعا فرمائی۔

ایک روایت کے مطابق زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ اس کا ایک چچازاد بھائی جو بہت

مال دار تھا، وفات پا گیا اور اسے بہت سی دولت ملی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے ایک بھیڑ خریدی جس سے اتنی نسل بڑھی کہ جس کی دیکھ بھال مدینہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے انہیں مدینہ کے آس پاس کی آبادیوں میں لے گیا اور مادی زندگی میں اس قدر مصروف ہو گیا کہ نماز با جماعت تو کیا نماز جمعہ میں بھی نہ آتا تھا ایک مدت کے بعد رسول اکرم ﷺ نے زکواۃ وصول کرنے والے عامل کو اس کے پاس زکوۃ لینے کے لئے بھیجا لیکن اس کم ظرف کنجوس نے نہ صرف خدائی حق کی ادائیگی میں پس وپیش کیا بلکہ شرع مقدس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ یہ حکم جزیہ کی طرح ہے یعنی ہم اس لئے مسلمان ہوئے تھے کہ جزیہ دینے سے بچ جائیں۔ اب زکوۃ دینے کی شکل میں ہم میں اور غیر مسلموں میں کون سا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے نہ جزیہ کا مطلب سمجھا تھا اور نہ زکوۃ کا اور اگر اس نے سمجھا تھا تو دنیا پرستی جو اسے حقیقت کے بیان اور اظہار حق کی اجازت نہیں دیتی تھی، غرض جب حضرت رسول اکرم ﷺ نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا:

"یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ"۔

"وائے ہو ثعلبہ پر ہلاکت ہو ثعلبہ پر"۔ [1]

تمت بالخیر

مطبوعات معراج کمپنی